MARCH 2011

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

محمود ریاض
رضیہ جمیل
آذر ریاض
امت الصبور
شاہین رشید
خالد جیلانی

خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ شعاع
37 اردو بازار کراچی

انٹرویو

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

پاکستان (سالانہ) 500 روپے
4000 روپے
5000 روپے

MEMBER APNS CPNE

مارچ 2011
جلد 25 شمارہ 7
قیمت 40 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaamonthly@yahoo.com, info@khawateendigest.com

شعاع کا مارچ کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

موسم سرما رخصت ہونے کو ہے۔ بہار کی دستک پر قدرت کی جلوہ گری رنگوں میں ڈھل رہی ہے۔ خزاں کے بعد بہار خوشی امیدی کا استعارہ ہے کہ قانون قدرت میں کچھ بھی اٹل نہیں ہے۔ موسم بدلتے رہتے ہیں، حالات بھی بدل جاتے ہیں کہ ہر مشکل کے بعد آسانی ہے لیکن قانون قدرت ہے کہ انسان کے لیے وہی ہے جس کے لیے اس نے کوشش کی۔ حالات بدلنے کے لیے کوشش، جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ بھوک، افلاس، بدامنی، خوف کے سائے اور ناگہانی آفات مسائل کا ایک سلسلہ ہے جو ختم ہونے میں نہیں آتا۔

کٹھن حالات اور آزمائشیں کبھی ہمارے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں اور کبھی قدرت ان کے ذریعے ہماری سوچ کو نکھارنے اور ہمیں کندن بنانے کا کام بھی لیتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسائل بہت ہیں لیکن وسائل کی بھی کمی نہیں، بات صرف حوصلے اور یقین کی ہے لیکن طاقت جن کا خدا ہو، وہ سر اٹھانے کا حوصلہ کہاں رکھتے ہیں۔

نیل کے ساحل سے تبدیلی کی جو لہر اٹھی ہے، اس کا دائرہ بڑھتا جا رہا ہے۔ روشنی کی یہ کرن ایک دن سورج بن کر اندھیروں کو تار تار کر سکتی ہے۔

حکمرانی کی آرزو اور غلبہ حاصل کرنا طاقت کی فطرت ہے لیکن تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ طاقت کے ذریعے نہ دل جیتے جا سکتے ہیں اور نہ کسی قوم کو بہت دیر تک غلام بنایا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی روشنی کو [illegible] روک سکا ہے؟

مقابلہ افسانہ نگاری:

اس ماہ منتخب ہونے والا افسانہ بوجوہ شامل نہ ہو سکا، ان شاء اللہ آئندہ ماہ شامل ہوگا۔

اس شمارے میں،

- کروں والی — نازیہ افتخار کا مکمل ناول،
- سلطنت دل — مریم عزیز کے ناول کی دوسری اور آخری قسط،
- کردار — نبیلہ عزیز کا مکمل ناول،
- رخسانہ نگار عدنان اور سعدیہ عزیز آفریدی کے ناولٹ،
- عالیہ بخاری اور آمنہ ریاض کے سلسلے وار ناول،
- راحت وفا، ام ثمامہ اور عنیقہ محمد بیگ کے افسانے،
- کون جیتے گا ورلڈ کپ — کرکٹ کے شائقین سے سروے،
- معروف فنکاروں سے گفتگو کا سلسلہ — دستک،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں — احادیث کا سلسلہ،
- شاعری سچ بولتی ہے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

ہمیں احساس ہے کہ اس ماہ بہت سی بہنوں کے خط شامل نہ ہو سکے لیکن آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ آپ کے یہ خط ہمارے لیے بہت اہم ہیں اور ہم نے یہ تمام خط پوری توجہ سے پڑھے ہیں۔

شعاع کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا، ہمیں ضرور لکھیے گا۔

حمد باری تعالیٰ

ابتدا تجھ سے اور انتہا تیری ذات
ہے سزاوار حمد و ثنا تیری ذات

کوئی تجھ کو ڈھونڈے تو ڈھونڈے کہاں
عقل و فہم سے ہے ماورا تیری ذات

کام مشکل میں آتا ہے تو ہی ہمارے
بے سہاروں کا ہے آسرا تیری ذات

چلتے پھرتے زمیں پر جو انسان ہیں
حال سے ان کے ہے آشنا تیری ذات

تیرے در کے ہیں محتاج شاہ و گدا
سب کو کرتی ہے رزق عطا تیری ذات

پہنچ سکتا نہیں اپنی منزل تلک
جب نہ ہوتی مرے راہنما تیری ذات

باقی جو کچھ بھی ہے فنا ہو جائے گا
اک رہے گی فقط اے خدا تیری ذات

نجم خان نجم

سلام اے آمنہ کے لال، اے محبوب سبحانی
سلام اے فخر موجودات، فخر نوع انسانی

سلام اے ظل رحمانی، سلام اے نور یزدانی
ترا نقش قدم ہے زندگی کی لوح پیشانی

تری صورت، تری سیرت، ترا نقشہ، ترا جلوہ
تبسم، گفتگو، بندہ نوازی، خندہ پیشانی

زمانہ منتظر ہے اب نئی شیرازہ بندی کا
بہت کچھ ہو چکی اجزائے ہستی کی پریشانی

حفیظ جالندھری

پیارے نبی کی پیاری باتیں

زیادہ مال رکھنے والوں کا بیان

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
" زیادہ مال رکھنے والوں کے لیے ہلاکت ہے مگر جس نے مال کو اس طرح' اس طرح' اس طرح اور اس طرح (خرچ) کیا۔" یہ فرماتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں' بائیں آگے اور پیچھے چاروں طرف (ہر طرف ایک بار) اشارہ فرمایا۔

فوائد و مسائل : مال حرص اور بخل کے ذریعے جمع ہوتا ہے اور یہ دونوں مذموم خصلتیں ہیں۔

جائز طریقے سے کمایا ہوا مال بھی اللہ کی راہ میں اور نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا ضروری ہے' اپنی ذاتی آسائش اور تعیشات پر مال صرف کرنا درست نہیں۔

سخاوت کرنے والا ہلاکت سے محفوظ ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا مال اس کے لیے نیکیوں میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ جس قدر زیادہ خرچ کرے گا' اتنا ہی جنت میں بلند درجات کا مستحق ہو گا۔

حلال کمائی

حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
" زیادہ مال والے قیامت کے دن (دوسروں سے درجات میں) نیچے ہوں گے مگر جس نے مال کو اس طرح اور اس طرح خرچ کیا اور اس کی کمائی پاک (اور حلال ذرائع) سے ہوئی۔"

فائدہ : سخاوت سے اس شخص کو فائدہ ہو سکتا ہے جس کی کمائی حلال ہو' لہٰذا حرام کمائی سے بچنا انتہائی ضروری ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
" زیادہ مال والے زیادہ نیچے ہوں گے مگر جس نے اس طرح' اس طرح اور اس طرح خرچ کیا۔"
(نبی صلی اللہ علیہ وسلم) نے تین بار اشارہ فرمایا۔

سخاوت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
" اگر میرے پاس احد پہاڑ جتنا سونا ہو تو میں نہیں چاہوں گا کہ مجھ پر تین راتیں گزر جائیں اور اس وقت بھی اس میں سے کچھ میرے پاس (بچا ہوا) موجود ہو' مگر اتنی چیز جسے میں قرض کی ادائیگی کے لیے سنبھال رکھوں۔"

فوائد و مسائل : اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت کا بیان اور امت کے لیے ترغیب ہے۔

احد ایک بڑا پہاڑ ہے' اتنا سونا دو تین دن میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا اس کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش یہی تھی کہ اگر اتنا مال بھی ہو تو وہ بھی دو تین دن میں مکمل طور پر تقسیم کر دیا جائے۔

قرض کی ادائیگی قرض خواہ کا حق ہے' اس کی ادائیگی سخاوت سے اہم ہے۔

قرض لینا جائز ہے لیکن قرض لیتے وقت یہ نیت ہونی چاہیے کہ جلد از جلد ادا کر دیا جائے۔

سنبھال رکھنے کی ضرورت اس وقت ہو سکتی ہے جب ادائیگی کا مقرر وقت آنے میں کچھ تاخیر باقی ہو تاکہ جب قرض خواہ مطالبہ کرے تو ادائیگی کا اہتمام کرتے ہوئے ادائیگی میں تاخیر نہ ہو جائے۔

اگر قرض خواہ قریب موجود ہو تو مقررہ وقت سے پہلے خود جا کر ادائیگی کر دینا افضل ہے لیکن اگر اس سے رابطہ مشکل ہو تو رقم سنبھال کر رکھنا مناسب ہے تاکہ ادائیگی جلد از جلد کی جا سکے۔

دعا

حضرت عمرو بن غیلان ثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
" یا اللہ! جو شخص مجھ پر ایمان لایا' میری تصدیق کی اور اس نے (دل سے) جان لیا کہ میں جو (شریعت) لے کر آیا ہوں وہ تیری طرف سے حق ہے تو اسے کم مال اور اولاد دے' اور اسے اپنی ملاقات کی محبت نصیب فرما اور اسے جلدی موت عطا فرما۔ اور جو مجھ پر ایمان نہ لایا' میری تصدیق نہ کی اور یہ یقین نہ کیا کہ میں جو (شریعت) لے کر آیا ہوں وہ تیری طرف سے حق ہے' اسے بہت مال اور اولاد دے اور اس کی عمر طویل فرما دے۔"

دعا

حضرت نقادہ (بن عبداللہ) اسدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک آدمی کی طرف بھیج کر اس سے ایک اونٹنی طلب فرمائی۔ اس شخص نے اونٹنی دینے سے انکار کر دیا۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک اور آدمی کی طرف بھیجا۔ اس نے ایک اونٹنی بھجوا دی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹنی کو دیکھا تو فرمایا۔
" یا اللہ! اس میں برکت عطا فرما اور اسے بھیجنے والے کو بھی۔" حضرت نقادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔ میں نے کہا۔
" جو اسے لے کر آیا اس کے لیے بھی برکت کی دعا فرمائیں۔"
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
" اور جو اسے لے کر آیا۔" (اللہ اسے بھی برکت دے۔)

پھر آپ کے حکم سے اسے دوہا گیا' اس نے بہت دودھ دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پہلے شخص کے بارے میں جس نے انکار کر دیا تھا فرمایا۔
" یا اللہ! فلاں کا مال زیادہ فرما۔" اور جس نے اونٹنی بھیجی تھی اس کے حق میں فرمایا۔
" یا اللہ! اس کو روزکا رزق دے۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
" ہلاک ہو جائے (تباہ ہو جائے) دینار کا بندہ' درہم کا بندہ' کمبل کا بندہ اور چادر کا بندہ۔ اگر اسے دیا جائے تو خوش رہتا ہے' اگر نہ دیا جائے تو (بیعت والا) وعدہ پورا نہیں کرتا۔"

ہلاکت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
" ہلاک ہو جائے دینار کا بندہ' درہم کا بندہ اور چادر کا بندہ۔ ہلاک ہو جائے' اوندھا ہو جائے' اسے کانٹا لگے تو نکالا نہ جائے۔"

فوائد و مسائل : دنیا کا لالچ مذموم ہے۔

جب محبت و نفرت کی بنیاد محض دنیوی مفاد پر ہو جائے تو خلوص باقی نہیں رہتا۔ اس صورت میں خلیفۃ المسلمین یا اس کے نائب سے بیعت بھی اللہ کی رضا کے لیے اور اسلامی سلطنت کی حفاظت اور خدمت کے لیے نہیں ہوتی' اس طرح یہ عظیم نیکی بھی تمام برکات سے محروم ہو کر برائی میں تبدیل ہو

جاتی ہے۔

دینی جماعتوں اور تنظیموں سے تعلق اللہ کی رضا اور ثواب کے لیے ہونا چاہیے۔ اسی نیت سے عہدہ اور ذمہ داری قبول کی جائے۔ اگر محسوس ہو کہ محنت کرنے کے باوجود جماعت میں اہمیت تسلیم نہیں کی جا رہی تو اکابر سے ناراض ہو کر جماعت سے الگ نہ ہو جائے۔ ہاں' اگر یہ محسوس کیا جائے کہ جماعت یا تنظیم کے عہدیدار صحیح انداز سے کام نہیں کر رہے اور توجہ دلانے کے باوجود اصلاح پر آمادہ نہیں تو خاموشی کے ساتھ تنظیم سے الگ ہو جائے۔

درہم و دینار کے بندے سے مراد وہ شخص ہے جو دنیا کے مال و دولت کی اتنی خواہش رکھتا ہے کہ اس کی تمام سرگرمیوں کا محور حصول دولت بن کر رہ جاتا ہے۔ اس طرح وہ دولت سے خدمت لینے کے بجائے دولت جمع کرنے اور سنبھالنے میں مصروف رہتا ہے۔ گویا دولت اس کا آقا یا معبود ہے اور وہ غلام یا پجاری۔

دولت کے پجاری کے لیے بددعا کی گئی ہے کہ وہ تباہ ہو جائے۔ [illegible] کے بل گرنے اور [illegible] کے بل اندھا ہو جانے سے یہی مراد ہے۔ کانٹا نہ نکالے جانے سے مراد یہ ہے کہ وہ مشکلات میں پھنسا رہے اور اس کی مدد اور نجات کی کوئی صورت پیدا نہ ہو۔ واللہ اعلم۔

قناعت کا بیان

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"امارت سامان کی کثرت سے نہیں ہوتی بلکہ امیری تو دل کی امیری ہے۔"

فوائد و مسائل : انسان دولت اس لیے حاصل کرتا ہے کہ اس کے کام چلتے رہیں' لیکن جب دولت خود مقصود بن جائے تو پھر مال و دولت کی کثرت کے باوجود وہ سکون و اطمینان حاصل نہیں ہوتا جس کے لیے کوشش کی جاتی ہے۔

قناعت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے پاس موجود رزق کو کافی سمجھے اور اپنی ضروریات کو اس حد تک محدود کرلے کہ حلال روزی میں گزارا ہو جائے۔

دولت مند وہ ہے جس کا دل دولت مند ہے اور دل دولت مند تب ہوتا ہے جب اس میں حرص اور بخل نہ ہو۔ ایسا آدمی تھوڑے سے مال سے اتنی خوشی حاصل کر لیتا ہے جو حریص آدمی کو بہت زیادہ مال سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔

کامیاب

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"کامیاب وہ ہے جسے اسلام کی ہدایت مل گئی' ضرورت کے مطابق رزق مل گیا اور وہ اس پر قانع ہو گیا۔"

فوائد و مسائل : اسلام سب سے بڑی دولت ہے کیونکہ اس سے آخرت میں جنت ملتی ہے' جس سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔

رزق کفاف کا مطلب اتنی روزی ہے جس سے بنیادی ضروریات' بغیر فضول خرچی کے' پوری ہوتی رہیں اور قرض اٹھانے کی ضرورت نہ پڑے۔

کامیابی دولت کے ڈھیر جمع کرنے کا نام نہیں بلکہ موجود رزق پر قناعت اور شکر اصل دولت اور بڑی کامیابی ہے۔

ضروری حاجات

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"یا اللہ! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر والوں کو ضروری حاجات کے مطابق رزق عطا فرما۔"

فوائد و مسائل : انسان کو چاہیے کہ اپنے گھر والوں کے لیے بھی اچھی عادات و خصائل کی خواہش رکھے۔

ضرورت کے مطابق رزق کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ نہ ملے جسے جمع کر کے رکھا جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا زہد و قناعت امت کے لیے بہترین نمونہ ہے۔

خواہش

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"قیامت کے دن ہر دولت مند اور نادار کی خواہش یہی ہوگی کہ اسے دنیا میں صرف (زندہ رکھنے کے قابل) تھوڑی سی روزی ملی ہوتی۔"

پوری دنیا

حضرت عبیداللہ بن محصن انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس کی صبح اس حال میں ہوئی کہ اسے بدن میں عافیت' اپنے بارے میں امن اور دن بھر کی خوراک حاصل ہو' اسے گویا پوری دنیا جمع کر کے دے دی گئی۔"

فوائد و مسائل : جسے کوئی بیماری اور خوف نہ ہو اور دن بھر کی ضرورت کا سامان موجود ہو تو یہ بہت بڑی نعمت ہے۔

ہم زیادہ کی خواہش میں ان نعمتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے جو ہمارے پاس موجود ہوتی ہیں۔ جس کی وجہ سے دل میں شکر کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔

جس شخص کے پاس ایک دن کی ضروریات موجود ہیں' اسے اس دن کا شکر ادا کرنا چاہیے اور یہ امید رکھنی چاہیے کہ جب کل کا دن آئے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات بھی مہیا فرما دے گا۔

کم تر کو دیکھو

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
(دنیا میں) "اپنے سے نیچے والے (کم مال) کو دیکھو' اپنے سے اوپر والے کو نہ دیکھو' اس سے یہ ہو گا کہ تم اللہ کی نعمت کو حقیر نہ سمجھو گے۔"

فوائد و مسائل : نیچے والے سے مراد وہ شخص ہے جو کسی نعمت میں ہم سے کم ہے اور اوپر والے سے مراد وہ شخص ہے جو کسی نعمت میں ہم سے بڑھ کر ہے۔

اپنے سے زیادہ نعمت والے کو دیکھنے سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مجھے یہ نعمت کم حاصل ہے' اس کمی کو شیطان اس انداز سے پیش کرتا ہے گویا یہ نعمت حاصل ہی نہیں۔ اس طرح محرومی کا احساس پیدا ہوتا ہے جس سے شکر کے بجائے اللہ سے شکوہ کرنے کو جی چاہتا ہے' جو ناشکری کی ایک بڑی صورت ہے۔

اپنے سے کم تر پر نظر ڈالنے سے حاصل شدہ نعمت کی قدر معلوم ہوتی ہے جس سے شکر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

ہر نعمت کے بارے میں یہ کیفیت ہے کہ ایک فرد کو وہ نعمت کسی سے کم ملی ہے تو وہی نعمت اسے کسی دوسرے سے زیادہ بھی ملی ہے۔ اس معاملے کا ایک اور پہلو بھی ہے کہ اگر ایک فرد کو ایک نعمت کسی سے کم ملی ہے تو کوئی دوسری نعمت اسے زیادہ بھی ملی ہے۔

جس طرح ایک شخص کسی سے کم دولت رکھتا ہے اور کسی سے زیادہ دولت مند بھی ہے۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر وہ اس سے دولت میں کم ہے تو صحت یا قوت میں اس سے بڑھ کر ہے۔ اگر حسن صورت میں کم ہے تو علم و فضل یا حسن سیرت میں اس سے بھی زیادہ ہے' لہٰذا احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی کوئی وجہ نہیں اور اللہ سے شکوہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اعمال اور دل

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا

بلکہ تمہارے عملوں اور دلوں کو دیکھتا ہے۔"

فوائد و مسائل : خوب صورت یا بدصورت ہونا بندے کے ہاتھ میں نہیں بلکہ یہ اللہ کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ کوشش کرنی چاہیے کہ عمل اچھے ہوں تاکہ اللہ تعالیٰ کو راضی کیا جاسکے۔

اللہ کے ہاں مال دار اور بے زر برابر ہیں۔ مال دار کو محض دولت مند ہونے کی وجہ سے معافی نہیں مل سکتی اور نادار کو محض اس کی مفلسی کی بنا پر مجرم نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

مال دار ہونا بھی اللہ کی آزمائش ہے اور مفلس ہونا دوسری طرح کی آزمائش۔ اگر مال دار شکر کرے تو اللہ کے ہاں پسندیدہ ہے اور ناشکری کرے تو ناپسندیدہ ہے۔ اسی طرح نادار آدمی صبر کرے تو اللہ کا پیارا ہے اور بے صبری کرے اور حرام کمائی کی کوشش کرے تو اللہ کے قرب سے محروم ہے۔

انسان اگر نیکی کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کی نیت اور خواہش ضرور رکھنی چاہیے۔ ایسی نیت پر بھی ثواب ملتا ہے۔

آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی گزران

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"ہم' آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم' مہینہ مہینہ اس حال میں گزار دیتے تھے کہ آگ نہیں جلاتے تھے۔ (ہمارا کھانا) صرف کھجوریں اور پانی ہوتا تھا۔"

فوائد و مسائل : اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زہد' استغنا' قناعت اور سادگی کا بیان ہے۔

حیات مبارکہ کے آخری سالوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سال بھر کے خرچ کے لیے کھجوریں اور جو وغیرہ اکٹھے دینا شروع کر دیے تھے لیکن امہات المومنین سخاوت سے کام لیتے ہوئے جلد ہی خرچ کر دیتی تھیں' اس لیے اکثر روٹی' سالن اور گوشت وغیرہ کے بغیر گزارہ ہوتا تھا۔ بعض اوقات کھجوریں بھی میسر نہیں ہوتی تھیں۔

(حضرت ابوسلمہ رحمتہ اللہ نے بیان کیا) میں نے کہا۔

پھر وہ لوگ کیا کھاتے تھے؟ ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا۔

"دو سیاہ چیزیں' کھجوریں اور پانی' البتہ ہمارے کچھ انصاری ہمسائے تھے وہ مخلص ہمسائے تھے' ان کے گھروں میں پلنے والی کچھ بکریاں تھیں (جنہیں چرنے کے لیے چراگاہ میں نہیں لے جایا جاتا تھا' گھر لا کر چارہ دیا جاتا تھا) وہ ان کا دودھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف (ہمارے ہاں) بھیج دیا کرتے تھے۔"

(راوی حدیث) محمد بن عمرو رحمتہ اللہ بیان کرتے ہیں' وہ نو گھر تھے۔

فائدہ : عورتوں کو چاہیے کہ حلال آمدنی میں گزارہ کریں اور خاوند کو حرام ذرائع اختیار کرنے پر مجبور نہ کریں۔

بھوک

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"میں نے ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھوک کی وجہ سے کروٹیں بدلتے دیکھا کیونکہ آپ کو معمولی سی کھجوریں بھی میسر نہ تھیں جن سے پیٹ بھر لیتے۔"

فائدہ : اس میں امت کے لیے سبق ہے کہ وہ تنگ دستی کی حالت میں صبر اختیار کریں' حرام کمائی کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔

تین دن

حضرت سلمان بن صرد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہاں تشریف لائے تو (ہماری یہ حالت تھی کہ) ہمیں تین رات تک کھانا میسر نہ ہوگا۔"

☆

دستک

شاہین رشید

ریحان اسعدی۔ ایف ایم 101

"کیسے ہیں اور نمبر پھر چینج کر لیا۔"

"جی ٹھیک ٹھاک۔ بس پہلے والا نمبر بہت عام ہو گیا تھا۔ اس لیے چینج کیا۔ ویسے وہ نمبر بھی ہے' کبھی کبھی استعمال کرتا ہوں۔"

"اور ریڈیو کیسا چل رہا ہے؟"

"الحمدللہ آپ کی دعا سے بہت اچھا چل رہا ہے۔"

"آپ سامعین کے بہت زیادہ پسندیدہ پریزنٹر ہیں۔ کچھ اپنے بارے میں بتایئے؟"

"جی میرا پورا نام محمد ریحان اسعدی ہے اور سب ریحان پکارتے ہیں۔ 19 اپریل کو میں کراچی میں پیدا ہوا۔ سٹار ہے میرا اور میں ..... ہوں۔ میں نے گریجویشن کیا ہے۔ میری چار بہنیں ہیں۔ دو مجھ سے بڑی' دو مجھ سے چھوٹی۔ میں بیچ کا یعنی تیسرے نمبر پر ہوں۔"

"چار بہنوں کے اکلوتے بھائی۔ شادی کیوں نہیں کی؟"

"بس جی شادی بھی ہو ہی جائے گی' ان شاء اللہ جلدی ہو گی' اور ان شاء اللہ ارینج ہی ہو گی۔"

"لمبے بہت ہیں' آپ تو لمبی لڑکی ہی چاہیے ہو گی۔"

"(قہقہہ) کچھ تو لمبی ہونی چاہیے۔ لوگ دیکھتے ہی کہتے ہیں' او ہو اتنے لمبے تو بھئی کیا کریں۔ اللہ کی دین ہے۔"

"جوڑے آسمانوں پہ بنتے ہیں' آپ کا بھی بنا ہو گا۔ خیر یہ بتائیں کہ ریڈیو پہ کیسے آئے؟"

"یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں گریجویشن کر رہا تھا تو اس زمانے میں ایف ایم سے ایک اناؤنسمنٹ ہوئی تھی کہ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ میں ایک اچھا پریزنٹر بننے کی صلاحیت ہے تو آپ آئیں اور آڈیشن دیں۔ اس وقت ایف ایم 101 نیا نیا لانچ ہوا تھا۔ چنانچہ میں گیا' آڈیشن دیا اور میرا سلیکشن ہو گیا۔"

"پہلا پروگرام کب کیا تھا۔ اور کتنے سال ہو گئے ہیں؟"

"تقریباً" نو سال ہو گئے ہیں مجھے ریڈیو کی فیلڈ میں' پہلا پروگرام شام کے اوقات میں کیا تھا' ڈی جے ارشد تحسین کے ساتھ کیا تھا۔"

"نو سال کافی عرصہ ہوتا ہے' اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ لیکن پہلے پروگرام میں کوئی مسئلہ ہوا تھا؟"

"ہاں جی اپنے پہلے پروگرام میں کافی کنفیوز تھا

کیونکہ جب ان ایئر گیا تو احساس ہوا کہ کافی لوگ مجھے سن رہے ہوں گے تو تھوڑی سی جھجک بھی ہوئی۔ مگر چونکہ شوق تھا تو پھر شوق جھجک پہ حاوی ہو گیا پھر سب کچھ سیٹ ہو گیا۔"

"تہوار کے موقع پر تو کسی نہ کسی خاتون آر جے کے ساتھ آپ کے پروگرام ہوتے ہی ہیں کیا آپ چاہیں گے کہ عام دنوں میں بھی کمبائن پروگرام ہوں؟"

"میں تو کہتا ہوں کہ باقاعدگی کے ساتھ روزانہ کمبائن شوز ہونے چاہئیں خواہ دو لڑکے آر جے ہوں یا دو لڑکیاں آر جے یا پھر لڑکی اور لڑکا آر جے ہوں کیونکہ میں نے محسوس کیا ہے کہ کمبائن پروگرام لوگ زیادہ پسند کرتے ہیں۔"

"ریڈیو پہ آنے سے پہلے کچھ اور بھی کرتے تھے کیا؟ میرا مطلب کہیں اور بھی کام کرتے ہیں؟"

"نہیں ریڈیو ایف ایم پہ آنے سے پہلے میں صرف اپنی تعلیم پر توجہ دے رہا تھا اور چونکہ ریڈیو سننا مجھے اچھا لگتا تھا تو جب آر جے کے لیے اناؤنسمنٹ ہوئی تو میں نے سوچا کہ چلو ٹیسٹ دے آتے ہیں اور اللہ کا شکر ہے۔ اس نے میرا ساتھ دیا میرا انتخاب ہو گیا۔"

"سرکاری میڈیا خواہ وہ ٹی وی ہو یا ریڈیو پیسوں کے معاملے میں بہت کنجوس ہے۔ آپ کو پہلے پروگرام کا چیک کتنے روپے کا ملا تھا؟"

"آپ یہ مت پوچھیں کہ پہلا چیک کتنے کا ملا تھا ہاں یہ میری پہلی کمائی تھی اور اس چیک کو حاصل کر کے مجھے خوشی بہت ہوئی تھی کہ میں اب کمائی کے قابل ہو گیا ہوں اپنی پہلی کمائی سے گھر والوں کے لیے کچھ چیزیں وغیرہ لے کر گیا تھا۔"

"میں دیکھتی ہوں بلکہ سنتی ہوں کہ آر جے بڑے اچھے موڈ میں پروگرام کرتے ہیں تو ہر وقت خوش رہنے کا کیا گر ہے؟"

"ایسا نہیں ہے کہ ہمیں کوئی فکر پریشانی نہیں ہے ہمارا موڈ خراب کبھی نہیں ہوتا ہو گا۔ مگر یہ ضرور ہے کہ پروگرام کے لیے جب ہم آتے ہیں تو ٹینشن کو باہر چھوڑ کر آتے ہیں کہ سننے والوں کا کیا قصور ہے جو ہم ان کو بھی الجھائیں؟ میری کوشش ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو بہت کم الجھاؤں کیونکہ جتنا ہم اپنے آپ کو الجھائیں گے اتنا ہی وسائل میں گھر جائیں گے۔ تم الجھیں ہو تو زندگی بہت اچھی گزرے گی۔"

"یہ بتائیں کہ زندگی میں کیا بننا چاہتے تھے اور کیا بن گئے؟"

"ہاں جی میں پائلٹ بننا چاہتا تھا لیکن زندگی میں کچھ مسائل ایسے درپیش رہے کہ جس کی وجہ سے میں پائلٹ نہیں بن سکا اور آج میں ایک سافٹ ویئر ہاؤس میں کام کرتا ہوں، ساتھ ہی ریڈیو بھی۔ جس کے حوالے سے آپ میرا انٹرویو کر رہی ہیں۔"

"تھک جاتے ہیں تو تھکن اتارنے کے لیے کہاں جاتے ہیں؟"

"میری تو خواہش ہوتی ہے کہ کسی پُرفضا مقام پر جاؤں مگر روز روز ایسا ممکن نہیں۔ لیکن پھر جب بہت زیادہ تھک جاؤں اور چھٹی بھی مل جائے تو پھر میرا دل چاہتا ہے کہ کسی گرین ایریا میں چلا جاؤں جہاں ہر طرف ہریالی ہو اور پھول کھلے ہوئے ہوں بہت خوب صورت مقام جیسے ناردرن ایریاز وغیرہ۔"

"جلدی سونے کے عادی ہیں یا دیر سے؟"

"کبھی نیند آ جائے تو جلدی بھی سو جاتا ہوں اگر نہ آئے تو پھر ظاہر ہے جاگتا ہوں —— اگر مجھے صبح جلدی جانا ہو تو پھر جلدی سونے کی کوشش کرتا ہوں ویسے بھی مجھے جلدی نیند آ جاتی ہے۔"

"صبح کا آغاز کس طرح کرتے ہیں اور زندگی کیسی لگتی ہے؟"

"بڑی روٹین میں زندگی چلی جا رہی ہے۔ وہی صبح اٹھنا، نماز پڑھنا، ناشتہ کرنا، آفس جانا پھر ایف ایم جا کر پروگرام کرنا۔ کوئی خاص ایکٹیویٹی نہیں ہے اور جہاں تک زندگی کیسی لگنے کی بات ہے تو زندگی اللہ کا دیا ہوا خوب صورت تحفہ ہے اسے انجوائے کرنا چاہیے۔"

"گھر آ کر کیا کیا جاتا ہے؟"

"یہ کہ جب گھر آؤں تو گھر والے خیریت ضرور پوچھیں اور پوچھیں کہ آج سارا دن کیسا گزرا اور کیا کیا۔"

رخسار (اداکارہ، والدہ مہوش حیات)

"کیسی ہیں رخسار — یہ بتائیں کہ آپ بہت عرصے کے بعد اسکرین پہ دوبارہ نظر آ رہی ہیں — آپ نے اس فیلڈ کو کیوں چھوڑا؟"

"پہلے یہ تھا کہ بچے چھوٹے تھے اسکول جاتے تھے۔ ڈرائیور وغیرہ گھر میں ہوتے تھے جو سارے کام انجام دے دیتے تھے تو میں کام آسانی سے کر لیتی تھی لیکن جب بچے بڑے ہوئے ذمہ داریوں میں اضافہ ہوا کوئی کسی کام میں کچھ کر رہا ہے۔ کسی کو کہیں جانا ہے۔ کوئی پڑھ رہا ہے تو ہر بچے کی الگ الگ ٹائمنگ ہو گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔"

"[illegible] بات کر رہی ہیں [illegible] کیوں چھوڑا؟"

"بات تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ بچے چھوٹے تھے تو اس لیے وقت مل جاتا تھا کہ سب کی ایک ہی روٹین تھی۔ بڑے ہوئے تو سب کی روٹین بدل گئی اور الگ الگ ہو گئی۔ لیکن اب ہر بچے اپنی اپنی فیلڈ میں مصروف ہو گیا ہے اس لیے میں بھی دوبارہ فیلڈ میں آ گئی ہوں۔"

"آج کل کیا کیا کر رہی ہیں آپ؟"

"پی ٹی وی (ہوم) سے ڈرامہ سیریل "کالج" چل رہا ہے اس میں کام کر رہی ہوں۔ ہم سے ڈرامہ سیریل "لڑکیاں محلے کی" اس میں کام کر رہی ہوں۔ اسی طرح کسی سنگل ڈرامے میں یا کوئی ٹیلی فلم ہوتی ہے تو اس میں بھی کام کر لیتی ہوں اور "لڑکیاں محلے کی" میں تو میں مہوش کی ماں کا ہی رول کر رہی ہوں اب ان شاء اللہ بھرپور طریقے سے اس فیلڈ میں آنا ہے مجھے محسن طلعت کا ایک سیریل انڈر پروڈکشن ہے اس میں بھی آپ ناظرین مجھے دیکھیں گے مزید دو تین پروجیکٹس ہیں جن میں کام کر رہی ہوں۔ اب دیکھیں کہ یہ سب کب آن ایئر ہوتے ہیں۔"

"آپ بھی سینئر فنکاروں کی طرح ماں کے ہی رول کریں گی؟"

"ہاں — بالکل ماں کے ہی رول کروں گی کیونکہ ہر سیریل میں ماں باپ، خالہ، پھوپھی اسی طرح کے رول ضرور ہوتے ہیں تو ظاہر ہے پھر میں بھی یہی کروں گی اور آج کل بزرگوں کے رول بھی بہت اچھے انداز میں پیش کیے جا رہے ہیں۔"

"ماں کے رول تو ماڈرن بھی ہوتے ہیں اور غریب بھی۔ آپ کس قسم کی ماں کا رول کرنا چاہیں گی؟"

"میں جب سے اس فیلڈ میں ہوں میں نے جتنے بھی کردار کیے ہیں ان میں کسی میں وکیل بنی ہوں کسی میں ڈاکٹر بنی ہوں [illegible] رول بھی کیا تو کھاتے پیتے [illegible] اگر ہم ظاہر ہو [illegible] کسی کو تو کراچی کا رول دے دیں گے تو نہیں کر پائیں گی ان پہ جچے گا نہیں یہ رول۔ تو میں تو یہ چاہوں گی کہ کسی غریب گھر کی عورت کا اور ماں کا رول ملے۔"

"کتنے سال کے بعد آپ کی واپسی ہوئی ہے اور اپنے کوئی مشہور ڈراموں کے نام بتائیں؟"

"میرے خیال سے چھ یا آٹھ سال کے بعد دوبارہ فیلڈ میں آئی ہوں — اب تو مجھے اپنے ڈراموں کے نام یاد نہیں۔ ڈرامہ "بابر" اس لیے یاد ہے کہ اس میں میرا گیٹ اپ تھا اور "الجھن" سیریل اس لیے یاد ہے کہ اسی کے دوران قربان جیلانی صاحب کا انتقال ہوا۔ ڈرامہ سیریل "دلدل" اس لیے یاد ہے کہ یہ پہلے اے ٹی وی سے چلا پھر پی ٹی وی ہوم سے چلا اور بھی کافی ڈرامے کیے مگر اس وقت یاد نہیں آ رہے۔"

"آپ کی بیٹی مموش حیات نے کم وقت میں بہت کام بھی کیا ہے ترقی بھی کی ہے۔ آپ کچھ کہیں گی اس کے بارے میں؟"

"سچی بات تو یہ ہے کہ میرے سارے بچے بہت باصلاحیت ہیں چونکہ میں کام کرتی رہی ہوں تو مموش کو کیمرہ فیس کرنا آتا تھا لیکن یہ امید نہیں تھی کہ یہ اتنی باصلاحیت ہے کہ سب کو پیچھے چھوڑ دے گی تو مجھے بہت خوشی ہے کہ وہ واقعی کامیاب ہے۔"

"مموش ایشیا کی دس خوب صورت خواتین میں نویں نمبر پر ہے۔ اس کی کوئی تقریب ہوئی اور آپ کو کیسے پتہ چلا؟"

"مموش اب خوب صورت خواتین میں آٹھویں نمبر پر آگئی ہے۔ ایک کمپین چلی تھی یہ ہم ... اس میں اس نے کام کیا تھا اور اس کو ساری دنیا کے ٹی وی چینلز میں دکھایا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک پلے میں کام کیا تھا جس کی ریکارڈنگ لندن کے ہی لوگوں نے پاکستان میں آکر کی۔ تو خیر خوب صورت خواتین ... [illegible] ... بھی میں 50 خواتین کا انتخاب ہوتا ہے اور پھر ہوتے ہوتے 10 خواتین کا انتخاب ہوتا ہے تو یہ 9 ویں نمبر پر آئی اب یہ آٹھویں نمبر پر ہے۔ یہ گزشتہ 3 سال سے ٹاپ 10 میں آرہی ہے۔ یہ پاکستان کی پہلی لڑکی ہے جو تین سال سے ٹاپ 10 میں ہے۔"

"مموش جب اس فیلڈ میں آئی تھی تو بہت مشرقی رول کرتی تھی مگر اب کچھ ایڈوانس 'ماڈرن رول' بھی کرنے لگی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

"بچپن سے ہی یہ ٹام بوائے تھی 'فراک نہیں پہنتی تھی بلکہ جینز شرٹ ہی پہنتی تھی' تھی بھی ذرا شرمیلی سی۔ لیکن جب شوبز میں آئی تو ہر طرح کے رول ملتے ہیں تو ماڈرن رول بھی ڈرامے کی ڈیمانڈ ہوتے ہیں جو کرنے پڑتے ہیں' ویسے یہ ابھی بھی بہت سادگی پسند ہے اور سوشل بالکل بھی نہیں ہے۔"

"اب جبکہ آپ دوبارہ اس فیلڈ میں آئی ہیں۔ ماحول میں چینج دیکھتی ہیں؟"

"بہت زیادہ چینج دیکھتی ہوں۔ ہم لوگوں نے دو کیمروں پہ کام کیا ہے اور اب ایسا نہیں ہے اب زیادہ اچھے انداز میں کام ہو رہا ہے اور ٹائم کی کافی بچت ہو جاتی ہے۔ اب کم ٹائم میں زیادہ کام ہوتا ہے۔ پہلے ریہرسل پہ بہت توجہ دی جاتی تھی مگر اب ایسا نہیں ہے اب تو یہ ہے کہ اسکرپٹ بھی نہیں دیا ہوتا اور کہہ دیتے ہیں کہ آپ سیٹ پہ آجائیں پھر سیٹ پہ جا کر تو سین سمجھا دیتے ہیں بتاتے ہیں کہ اب کریں تو اس کام میں تھوڑی مشکل ہوتی ہے۔"

صدف لغاری

"کیسی ہیں ... کتنا عرصہ ہو گیا شوبز کو جوائن کیے ہوئے اور کیسی لگی یہ فیلڈ؟"

"یہی کوئی سال ڈیڑھ سال ہوا ہے اس فیلڈ میں آئے ہوئے۔ فیلڈ بہت اچھی ہے کام کر کے بہت ... [illegible] ... سال سب ... [illegible] ... ہیں۔"

"اور جب آپ اس فیلڈ میں نہیں تھیں تو کیا تاثرات تھے؟"

"اس فیلڈ کے بارے میں بہت کچھ سنا ہوا تھا یہ ایک ... فیلڈ ہے لیکن لوگوں نے اسے ... بنایا ہوا تھا۔ مجھے ابھی تک کوئی برائی نظر نہیں آئی اگر انسان سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے تو میرے خیال میں کوئی مسئلہ نہیں ہے ..."

"آپ کو شاید اس لیے بھی سب کچھ بہت اچھا لگ رہا ہے کہ عمیر آپ کے میاں آپ کے ساتھ ہوتے ہیں؟"

"نہیں ایسی بات نہیں ہے' میں سمجھتی ہوں کہ سب کچھ آپ پہ منحصر ہے اگر آپ اچھے ہیں تو سب اچھے ہیں اور آپ اچھے نہیں ہیں تو پھر سب برے

"... پھر جاری رکھنے کا ارادہ ہے؟"

"بالکل ان شاء اللہ' اگر اچھی اچھی آفرز آتی رہیں تو پھر دیکھیں کہ مجھے یہ فیلڈ کہاں تک لے جاتی ہے اور کیا ہوتا ہے۔"

"عمیر تمہاری پرفارمنس کو پسند کرتے ہیں؟ اور کیا پہلا تجربہ تھا اداکاری کرنے کا؟"

"سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا بس مجھے شوق تھا میں کافی عرصے سے عمیر کو کہہ رہی تھی کہ مجھے اس فیلڈ میں آنا ہے۔ مگر یہ اجازت ہی نہیں دے رہے تھے۔"

"کیوں؟ ۔۔ سوچتے ہوں گے کہ بیگم آگے نہ نکل جائے۔"

(قہقہہ) "ہو سکتا ہے ویسے میری پرفارمنس کی تعریف بھی کرتے ہیں اور مجھے بتاتے بھی رہتے ہیں کہ ... [illegible] ... چھوٹے تھے ... بڑے ہو جائیں تو پھر اس فیلڈ میں آنا ان کا کہنا بھی درست تھا۔ اب بچے اسکول جانے والے ہو گئے ہیں تو کوئی مشکل نہیں ہوتی۔"

"بچوں کو زیادہ وقت کون دیتا ہے؟"

"ہم دونوں ہی دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ میں زیادہ تر گھر میں رہتی ہوں تو زیادہ وقت میں ہی دیتی ہوں۔"

"اب جبکہ آپ کی جوائنٹ فیملی بھی نہیں ہے اور آپ دونوں ہی کام کرتے ہیں مگر تو سب ہوتا ہو گا؟"

"نہیں ۔۔ ایسی بات نہیں ہے 'میں کوئی بہت زیادہ کام نہیں کر رہی' میرے پاس فی الحال ایک ہی پروجیکٹ ہے تو میں عموماً اس وقت جاتی ہوں' جب بچے اسکول ہوتے ہیں یا جس دن ان کی چھٹی ہوتی ہے۔"

"آپ کی تاریخ پیدائش اگست کی ہے اور اگست

والوں میں غصہ بہت ہوتا ہے۔ کیا آپ میں بھی ہے؟"

"... [illegible] ... کہ ہم تھوڑا غصہ دکھائیں' ویسے مجھ میں اتنا غصہ نہیں ہے۔"

"غصہ آئے تو کس پر اترتا ہے۔ بہن بھائیوں پر یا میاں صاحب پر؟"

"غصہ تو میاں پر ہی اترتی ہوں۔ کیونکہ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں میں سمجھتی ہوں کہ بہن بھائی ضرور ہونے چاہئیں۔ کزنز ہیں مگر وہ بھی سگے بہن بھائی کی جگہ نہیں لے سکتے' میرا رجحان ان کی طرف ہوتا ہے لیکن ان کا نہیں کیونکہ ان کے اپنے بہن بھائی ہوتے ہیں۔"

"چلو اب تمہارا کوئی بڑا سیریل آئے گا تو بات کروں گی۔"

یہ سب کو معلوم ہے کہ پاکستان کا قومی کھیل "ہاکی" ہے۔ لوگ زیادہ دلچسپی کرکٹ میں لیتے ہیں۔ کرکٹ سے لوگوں کو جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "جیت" کی صورت ہو یا "ہار" کی لوگ اپنے جذبات کا اظہار بھرپور انداز میں کرتے ہیں۔ جیت کی صورت میں انعام و اکرام کی بارش بھی بے دریغ کرتے ہیں اور ہار کی صورت میں گالیاں دینے اور حق بھر کر برائیاں کرنے سے بھی نہیں باز آتے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کا حق ہے۔

1992ء میں عمران خان کی قیادت میں پاکستان نے ورلڈ کپ جیتا 19 سال کے اس عرصے میں ایک نسل جوان ہو جاتی ہے اور آج کی نسل بھی یہ خواہش رکھتی ہے کہ وہ بھی اپنی ٹیم کو اس فتح سے ہم کنار دیکھیں 19 فروری 2011ء کو ورلڈ کپ شروع ہو رہا ہے۔ انڈیا، سری لنکا اور بنگلہ دیش میزبانی کے فرائض انجام دیں گے۔ یہ اعزاز تو ہمیں بھی دیا گیا تھا لیکن سری لنکا کی ٹیم پہ دہشت گردی کے حملے کے بعد ہم سے میزبانی کا حق واپس لے لیا گیا۔ لوگ اچھے کاموں سے اپنی پہچان کرواتے ہیں اور ہم برے کاموں سے شناخت بنا رہے ہیں۔

ورلڈ کپ کے تاریخی موقع پر ہم نے زندگی کے ہر شعبے سے لوگوں کے تاثرات لیے ہیں اور وہ قلم بند کر دیے ہیں۔

ہمارے سوالات یہ تھے۔

1 کرکٹ سے آپ کی دلچسپی؟
2 آپ کے خیال میں ورلڈ کپ کون جیتے گا؟
3 فائنل میں کون سی ٹیمیں آمنے سامنے ہوں گی؟
4 پاکستان کے جن تین کھلاڑیوں پہ پابندی لگی ہے ان کے لیے آپ کیا کہیں گے؟

کون جیتے گا ورلڈ کپ

شاہین رشید

عدنان شاہ ٹیپو (آرٹسٹ)

1 "کرکٹ میرا جذبہ اور جنون ہے" دیوانگی کی حد تک مجھے یہ کھیل پسند ہے اور میں ہر کام چھوڑ کر اسے دیکھتا ہوں۔"
2 "وہ ایک نغمہ ہے ناکہ" ہم ہیں پاکستانی ہم تو جیتیں گے" تو میرا جواب یہ ہے کہ پاکستان ورلڈ کپ جیتے گا۔
3 فائنل میں آسٹریلیا اور پاکستان آمنے سامنے ہوں گے۔
4 ان تینوں کھلاڑیوں کے خلاف جو فیصلہ ہوا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ ہم صحیح ڈائریکشن کی طرف نہیں جا رہے۔ یہ ان کے ساتھ برا ہوا ہے اور اصل میں تو چیئرمین پی سی بی اعجاز

بٹ کو مستعفی ہو جانا چاہیے تھا۔

انیل رشید (طالب علم بی اے، بحریہ یونیورسٹی)

1 بے انتہا دلچسپی ہے یہاں تک کہ جب ہمارے میچز ہو رہے ہوتے ہیں تو اسکور معلوم کرنے کے لیے موبائل پہ ویب کا سہارا لیتا ہوں۔ خواہ میں یونیورسٹی میں ہوں یا گھر سے باہر کہیں بھی اور اب تو ورلڈ کپ ہے جو کہ چار سال بعد آتا ہے۔
2 ورلڈ کپ انگلینڈ جیتے گا۔
3 فائنل میں انڈیا اور انگلینڈ آمنے سامنے ہوں گے۔
4 بہت اچھا ہوا ان پر پابندی لگی یہ اس سزا کے حق دار تھے۔ میں آئی سی سی کے فیصلے سے بہت خوش ہوں۔ ہمارے دیگر کھلاڑیوں کو ان سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ برے کام کا برا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔

نوین الکلائی (چاند آرٹسٹ)

1 مجھے جنون کی حد تک کرکٹ سے دلچسپی ہے لیکن کبھی بھی عامر ان کرنے کے لیے نوکری کے [illegible] اور اب تو ورلڈ کپ ہے تو ضرور شوق سے دیکھوں گا۔
2 بہت سارے لوگوں کی طرح میری بھی خواہش ہے کہ اس دفعہ پاکستان ورلڈ کپ جیت کر آئے اور پاکستان کے [illegible] میں دعائیں بھی کروں گا۔
3 میرا خیال ہے کہ پاکستان اور انگلینڈ آمنے سامنے ہوں گے۔
4 کھلاڑیوں پہ پابندی لگنے کا مجھے بہت افسوس ہے کیونکہ محمد عامر بہت اچھا بولر ہے اور اس جیسا بولر پاکستان کو ملنا مشکل ہے۔

آغا فیضان (آر جے ایف ایم 101 کراچی)

1 میری دلچسپی صرف دیکھنے کی حد تک ہے۔ کھیلنے سے نہیں۔
2 میرا خیال ہے کہ اس مرتبہ ورلڈ کپ انڈیا یا انگلینڈ جیتے گا۔
3 فائنل میں انڈیا، آسٹریلیا یا پھر انگلینڈ اور سری لنکا۔
4 بہت منصفانہ فیصلہ ہوا ہے۔ جو ملک کی عزت کا

کے لیے یہ بہترین فیصلہ ہے۔

حنیف سحر (صحافی/رائٹر)

1 کرکٹ کے کھیل سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ کھیل زیادہ تر برطانیہ کے غلام ملکوں میں کھیلا جاتا ہے۔ مجھے غلامی اور غلامی کی کسی یادگار سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

2 کوئی بھی جیتے اس سے دنیا میں کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے۔

3 کوئی بھی آمنے سامنے ہو، میں اس تماشے سے اپنی قوم کو صرف کچھ عرصے تک مفلوج ہوتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔

4 جی کھلاڑیوں کے جو حالات سامنے آتے ہیں ان سے قوم سبق سیکھے کہ بے ایمان آدمی کوئی بھی ہو اسے اپنا ہیرو نہ بنائیں بعد میں افسوس ہوتا ہے۔ کھیل کو کھیل سمجھیں، قومی غیرت کا مسئلہ نہ بنائیں۔

مظاہر شاہ (ویب ڈیزائنر)

1 کرکٹ سے بہت زیادہ دلچسپی ہے۔ ہر میچ بہت شوق اور توجہ سے دیکھتا ہوں۔

2 اس کے لیے تو میرے ذہن میں دو نام ہیں۔ پاکستان کے لیے بہت سی دعائیں ہیں اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر ساؤتھ افریقہ کپ جیتے گا۔

3 ان شاءاللہ پاکستان اور ساؤتھ افریقہ۔

4 بہت برا ہوا کیونکہ مجھے یہ بہت بڑی سازش لگتی ہے۔ صرف پاکستانی کھلاڑیوں پہ ہی پابندی کیوں؟ بہت سے کھلاڑی اس میں انوالو ہوتے ہیں۔ سب کا احتساب ہونا چاہیے۔

شہود علوی (فنکار)

1 اتنی دلچسپی ہے کہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ اور شوبز کی ٹیم کے ساتھ اور فارغ اوقات میں کھیل بھی لیتا ہوں۔ دیکھنے سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے اس کھیل کی خاطر پورا دن برباد نہیں کر سکتا۔ نہ حاصل نہ حصول میرے لیے تو ورلڈ کپ ہونا نہ ہونا ایک برابر ہے۔

2 پاکستانی ہوں اپنے وطن سے پیار ہے اس لیے دل تو کہتا ہے کہ کپ پاکستان آئے۔

3 نیوزی لینڈ اور انگلینڈ آمنے سامنے ہوں گی اور پاکستان اگر فائنل میں آیا تو پھر پاکستان اور انگلینڈ کا مقابلہ ہوگا۔

4 میرا خیال ہے کہ قصوروار ہیں تو ٹھیک سزا ملی ہے۔ ان کی سزا سے دوسروں کے ہوش بھی ٹھکانے آجائیں گے وہ کوئی غلطی نہیں کریں گے۔ لیکن اگر وہ بے گناہ ہیں تو پھر ان کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔

راحیل (آئی ٹی منیجر پرائیویٹ کمپنی)

1 ایک زمانہ تھا جب مجھے کرکٹ سے بہت زیادہ لگاؤ تھا لیکن جب سے اسپاٹ فکسنگ اور ہارنے کا سلسلہ شروع ہوا ہے اور کھلاڑیوں نے ملک کے لیے نہیں بلکہ اپنے مفاد کے لیے کھیلنا شروع کیا ہے میری دلچسپی کم ہوگئی ہے۔

2 ورلڈ کپ انڈیا یا انگلینڈ جیتے گا۔

3 آمنے سامنے بھی کوئی دو ٹیمیں ہوں گی۔

4 برے کام کا برا نتیجہ ہوتا ہے۔ جو ہوا بہت اچھا ہوا۔ آئی سی سی کا فیصلہ بالکل ٹھیک ہے ان کی سزا سے دوسرے عبرت حاصل کریں گے اور آئندہ کبھی بھی اپنے ملک سے اور اپنے کھیل سے غداری نہیں کریں گے۔

واجد رضا اصفہانی (صحافی اسپورٹس جنگ)

1 کرکٹ سے اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی ایک کرکٹر کو ہوتی ہے۔

2 ورلڈ کپ انگلینڈ جیتے گا۔

3 فائنل میں آمنے سامنے انڈیا اور انگلینڈ ہوں گے۔

4 کھلاڑیوں پہ جو پابندی لگی ہے بالکل ٹھیک لگی ہے یہ اسی سلوک کے مستحق تھے۔

شہناز راحیل (ہاؤس وائف/ڈریس ڈیزائنر)

1 مجھے کرکٹ گیم بے انتہا پسند ہے۔ جس دن پاکستان کا میچ ہوتا ہے اپنے کام ایک دن پہلے نمٹا لیتی ہوں۔

2 خواہش تو یہی ہے کہ پاکستان کپ جیتے مگر لگتا یہ ہے کہ انڈیا یہ کپ جیتے گا۔

3 انگلینڈ اور انڈیا آمنے سامنے ہوں گے۔ لیکن اگر انڈیا اور پاکستان آمنے سامنے ہوں تو کیا ہی بات ہے۔

4 کھلاڑیوں کی سزا ملی بہت ہی اچھا ہوا اب ٹیم پاک صاف ہو گئی ہے۔ لیکن موجودہ ٹیم اور آنے والے نئے کھلاڑیوں کو ان سے سبق سیکھنا چاہیے اگر ٹیم متحد ہو کر کھیلے تو فتح کو اپنے قریب کر سکتی ہے یہ اپنے ہی لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ ہم دعائیں مانگ رہے ہوتے ہیں، یہ کوئی اور ہی گیم کھیل رہے ہوتے ہیں۔ ان پر تو تاحیات پابندی لگنی چاہیے تھی۔

ڈاکٹر فیاض (نیورو ڈائجسٹ)

1 بے انتہا لگاؤ ہے کام کے دوران اگرچہ میچ دیکھ نہیں سکتا لیکن موبائل کے ذریعے نیوز الرٹ لیتا رہتا ہوں۔

2 امید تو یہی ہے کہ پاکستان جیتے گا۔

3 میرا خیال ہے کہ آمنے سامنے پاکستان اور انڈیا ہوں گے۔

4 بہت اچھا فیصلہ ہے۔ ان کو اس سے زیادہ سزا ملنی چاہیے تھی اور یہ کہنا کہ عامر کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے غلط ہے کیونکہ وہ کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہے۔ اس میں لالچ بھرا ہوا تھا۔

آصف مالک (رائٹر/صحافی)

1 اتنی زیادہ کہ اگر اسٹار پلس پہ ڈراما چل رہا ہو یا ڈرامے کے وقت میچ آرہا ہو تو بیوی سے لڑائی واجب ہو جاتی ہے۔

2 اب بھی دل خوش فہم کو تجھ سے ہیں امیدیں ـــ کاش پاکستان کپ جیت لے۔

3 ہمارا تو یہ حال ہے کہ "اگر فلاں ٹیم فلاں سے ہار گئی اور فلاں ٹیم فلاں سے جیت گئی تو پاکستان فائنل میں پہنچ جائے گا۔" ہم اپنی قسمت سے فائنل میں پہنچے۔ تو اس طرح اگر پہنچ گئے تو انڈیا سے یا انگلینڈ یا پھر آسٹریلیا سے ہمارا مقابلہ ہوگا۔

4

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پہ ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا!

پاکستان کے خلاف ایک کامیاب اور منظم سازش کی گئی ہے اور تینوں کو اس کا نشانہ بنایا گیا۔ پی سی بی نے بھی اس کیس کو بہت برے طریقے سے ہینڈل کیا جس کا افسوس ہے۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل ـــــــ کائنات
فوٹوگرافر ـــــــ موسیٰ رضا
میک اپ ـــــــ روز بیوٹی پارلر

عالیہ بخاری

آئے تھے۔
مگر بہت عرصے بعد۔

انہیں زیادہ دیر حیرت میں بھی مبتلا نہ ہونا پڑا کیونکہ وہ سب سیدھے ان ہی کے کمرے میں آرہے تھے۔

"بہت دن سے یاد آرہی تھی مگر بس اس شہر میں تو کسی کو بھی فرصت نصیب نہیں ہمیں آج کل آج کل میں آنا ٹلتا جا رہا تھا مگر اب جو اسلام بھائی کو روزانہ ٹی وی پر دیکھ رہے تھے تو سارے کام ایک طرف دھرنے پڑے، ماشاءاللہ کیسی عزت اور نام دیا ہے اللہ نے "آج کل تو ہر چینل پر نظر آرہے ہیں۔"

ایک ہی سانس میں بہت ساری باتیں، دادی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

اس چھوٹے موٹے ہجوم میں ہر ایک کو ہی جلدی تھی کہ وہ ان سے اپنی اس گہری محبت کا تذکرہ کر سکے جس میں وہ سب ابھی دو ہفتے قبل ہی گرفتار ہوئے تھے۔

کونے میں کھڑی زری کا اب تک کسی نے نوٹس نہیں لیا تھا مگر جب وہ سب دادی کے گرد گھیرا باندھ کر بیٹھ چکے تو سب کی ہی نظر میں وہ اچانک ہی کھٹکی۔

"یہ لڑکی کون ہے، پہلے تو نہیں دیکھا اسلام بھائی کی تو ایک ہی بیٹی ہے نا!"

گزرے ہوئے سالوں میں اس گھر کی صرف دو ہی باتیں خاندان والوں کے لیے قابلِ توجہ رہی تھیں۔

نمبر ایک معاذ کی غیر اخلاقی سرگرمیاں اور نمبر دو ربیعہ اور سلمان کی منگنی کا ٹوٹنا!

دادی نے کچھ بھی کہنے سے پہلے اس بات کا پورا خیال رکھا کہ اب یہاں سے کوئی تیسری بات نہ نکلنے پائے۔

"زری بیٹا! جا کر شائستہ کو اطلاع دو مہمان آئے ہیں۔" انہوں نے سب سے پہلے اسے یہاں سے نکلنے کو کہا۔
جو مستقل منہ کھولے ان نت نئے چہروں کو دیکھ رہی تھی۔

دادی کے بدلے ہوئے لہجے نے جیسے اس کے اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی۔

"جی دادی!" اس نے محض اتنا ہی کہا اور تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔

"زری بیٹا!" اسے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ دادی کی زبان سے اس کے لیے یہ الفاظ نکلے۔
خوشی سے دل اتنی زور سے دھڑکا تھا کہ قابو میں آنا مشکل ہوا تھا۔

گھر آنے والے یہ مہمان کم از کم اس کے لیے تو بڑے خوش بخت ٹھہرے تھے۔

"زری بیٹا!" اس نے دل ہی دل میں دہرا کر پھر سے مزہ لیا اور شائستہ بیگم کے کمرے کی طرف دوڑ لگائی۔

وہ پچھلے برآمدے میں بیٹھی مٹر چھیل رہی تھیں، اسے اس طرح جوش و خروش میں مبتلا دیکھ کر سخت کوفت میں مبتلا ہوئیں۔

"بہت سارے مہمان آئے ہیں امی! ادھر دادی کے کمرے میں۔" ان کے بار بار کے منع کے باوجود وہ انہیں امی کہنے سے باز نہیں آرہی تھی۔

"ہاں آرہی تھی آواز یہاں تک، سارے کے سارے ابن الوقت، کبھی آکر جھانکا تک نہیں تھا پہلے، آج اللہ نے اچھا وقت دکھایا تو آگئے محبت کے دعوے دار بن کر، تمہیں پتہ ہے، کس حقارت سے یہ میرے معاذ کو دیکھتے تھے۔"

مٹر کے دانوں سے بھرا ہوا ڈونگا اپنے آگے سے سرکا کر وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

وہ چپ چاپ ان کی شکل دیکھتی رہی۔

"معاذ کو بھی کوئی برا کہہ سکتا ہے بھلا؟" اسے سن کر بھی بڑا عجیب سا لگا تھا۔

"اور آئے بھی ایسے وقت، جب کوئی نہیں ہے، ربیعہ بھی کالج میں، جو چائے پانی کر لیتی، سارے کام بیچ میں

وہ بڑبڑاتے ہوئے اس کے قریب سے گزر کر دادی کے کمرے کی طرف جانے والے کوریڈور میں مڑ گئیں۔

دادی اتنی سی دیر میں مہمانوں کو زری کے بارے میں ایک ہلکی سی تفصیل دے چکی تھیں۔

غریب بے سہارا لڑکی، جو ان کی کسی جاننے والی کے توسط سے یہاں گھر کے کام کاج کے لیے آئی تھی۔ معاذ کا سارے قصے میں کہیں ذکر نہیں تھا۔

لیکن آج کسی نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھنا ضروری نہیں سمجھا تھا اور نہ ہی مزید کریدنے کی کوشش کی۔

دادی کی مختصر سی بات معتبر ٹھہری تھی۔

ویسے بھی آج سب یہاں اسلام احمد کے حصے میں آئے اس عزت اور احترام میں حصے دار بننے کے لیے آئے تھے، جو ان کی دیانت داری اور سچائی کے ساتھ جھیلی گئی تلخیوں کا اجر تھی۔

"سب شان ہے میرے مولا کی!"

دادی نے چپکے سے دل میں کہا اور چشمے کے دھندلے ہوتے شیشے کو اپنی گرم چادر کے پلّو سے رگڑ کر صاف کیا۔

وہاں پچھلے برآمدے میں شائستہ بیگم کے ادھ چھلے مٹر یوں ہی بیچ میں پڑے تھے۔

زری نے سب سے پہلے انہیں سمیٹنا ضروری سمجھا۔ مہمانوں کا کچھ پتہ نہیں تھا کوئی اس طرف آجاتا تو کتنا برا لگتا۔

اسے کچھ ایسا ہی خیال آیا۔

کچن میں ابھی دوپہر کے کھانے کے پکنے کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا، فریزر سے نکلا ہوا گوشت کا پیکٹ باہر رکھا تھا۔

شائستہ امی نے اسے کچن میں آنے سے منع کر رکھا تھا۔ وہ اسے کوئی گری ہوئی لڑکی سمجھ کر یہاں ہی تھیں اب تک ان کا خیال تھا۔ ایک بار وہ اس گھر کی ضرورت بن گئی تو پھر مجبوری بننے میں دیر نہیں لگے گی اور وہ زندگی میں پہلی بار آئے فراغت کے اس احساس میں اب کسی بھی مجبوری کی تلخی کو برداشت کرنے کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھیں۔

"جتنا جلد ہو اس لڑکی کا کوئی دوسرا ٹھکانہ ڈھونڈو۔ میں بہت عرصے اسے یہاں برداشت نہیں کروں گی۔ یہ تم اچھی طرح سمجھ لو۔" اٹھتے بیٹھتے وہ معاذ کو یاد دلا رہی تھیں۔

وہ کسی وقت برا منا جاتا اور کسی وقت یقین دہانی بھی کرا دیتا کہ وہ زری کے لیے کچھ اور بندوبست کر دے گا لیکن فی الحال وہ اسے یہاں سے بھیجنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

شائستہ بیگم اس درمیانی عرصے میں اپنے رویے میں کسی بھی لچک کو نہیں آنے دینا چاہتی تھیں اور اس بارے میں ان کے اور دادی کے خیالات بالکل ایک تھے۔ زری دادی کے کمرے میں ہی رہتی۔ وہیں اسے کھانا، چائے مل جاتی۔

کبھی کبھی ربیعہ سے دو چار باتیں ہو جاتیں، یا پھر دادی کے بولتے رہنے کی وجہ سے تنہائی اور خاموشی کا احساس کم تر رہتا تھا۔

شروع میں اس نے کئی بار کوشش کی تھی کہ وہ گھر کے کاموں میں حصہ لے، یہ اس کی بڑی شدید خواہش تھی کہ وہ اس گھر اور گھر والوں کی ایسی خدمت کرے کہ ان میں سے کسی کو اٹھ کر پانی بھی نہ پینا پڑے۔

بس میں ہو تو اپنی ایک ایک سانس اس گھر کی نذر کرے، جان تک نچھاور کر دے۔

ہزار بار!

جذبے کی اس شدت کے پیچھے دل کا چھپا ہوا چور نہیں، بلکہ احسان مندی کا وہ شدید احساس تھا جو اس کسمپرسی اور ذلت کی زندگی سے نکل کر اس باعزت اور پرسکون ٹھکانے کو پانے پر اس کے دل کی گہرائیوں تک اترا ہوا تھا۔

مگر سال کوئی اتنی گہرائی میں جھانکنے کے لیے تیار کب تھا۔

اس نے کچن میں کھڑے ہو کر صرف چند لمحے سوچا اور پھر آہستگی سے فریج اور پھر فریزر کھولا اندر میزبانوں کی عدم دلچسپی کے باوجود، محفل عروج پر آ چکی تھی۔

ابا کو خراج تحسین پیش کرنے کے بعد اب خاندان میں ہونے والے تازہ ترین واقعات کا ذکر جاری تھا اور آج کل محض ایک ہی بات

Talk of the town ٹھہری تھی۔

انصار چچا کے خاندان پر آیا ہوا زوال!

"حرام کمائی کا آخر کار یہی انجام ہوتا ہے، بہت اونچی اڑتی تھی شاکرہ، کسی کو بھی ہم پلہ سمجھنا باعث توہین تھا، دیکھا کیسے منہ کے بل گری!"

ناظم آباد والی صفیہ خالہ، انصار چچا کے گھر برسوں اسی حرام کی کمائی کی دعوتیں اڑا کر اب سب سے اونچی آواز میں قہقہے لگا رہی تھیں۔

اور ساتھ دینے والوں کی بھی کمی نہیں تھی۔

"یہ تو ہونا ہی تھا، مکافات عمل بھی تو آخر کوئی چیز ہے۔"

"توبہ توبہ استغفار!"

"بھئی لوگ تو کہہ رہے تھے، سنا ہے جویریہ کے جہیز کا سامان بھی واپس آ گیا ہے۔"

کسی نے یہ نئی اطلاع بھی پہنچائی تھی۔

سب کی توجہ فطری طور پر اس کی طرف ہوئی۔

"ہم کو کس نے بتایا، کل تک تو کسی سے نہیں رہی ہیں شاکرہ بھابھی!"

"مجھے تو بدھ بازار میں بجلی کی ساس ملی تھیں، انہوں نے بتایا کہ جویریہ کا سارا سامان ان کے گھر آیا ہے، شاکرہ بھابھی نے تو سنا ہے بہت چھوٹا گھر لیا ہے کرائے پر، وہاں تو ذرا سی بھی جگہ نہیں ہے۔"

خبر لانے والی نے مستند حوالے دیے تھے۔ آنے والوں میں سے کسی کو شاکرہ بیگم نے خاص طور پر فون کر کے بلایا اور جہیز کا دیدار کرایا تھا۔

"لاکھوں کا جہیز تھا، ایک ایک چیز بے مثال، مگر دیکھ لیں کچھ بھی تو استعمال کرنا نصیب نہیں ہوا۔"

"سنا ہے اس کی شادی کے لیے اتنا بڑا قرض لیا تھا۔"

"کہنا تو نہیں چاہیے، مگر اس لڑکی کے ساتھ تو کچھ نحوست کا سلسلہ ہے، ورنہ اس سے پہلے سلمان کی کیا شاندار شادی ہوئی تھی۔"

"واقعی!" جویریہ کی بدقسمتی کنفرم ہوئی۔

دادی جو مہمانوں کی آمد پر ہمیشہ بہت ہی خوش ہوتی تھیں، آج خاموش تھیں اور دکھی بھی!

انہیں یہ سب برا لگ رہا تھا۔

اور سب سے زیادہ برا شائستہ بیگم کا ان باتوں کو دلچسپی سے سننا۔

وہ جو بڑی رکھائی سے ان سب سے ملی تھیں، انصار چچا کے گھرانے کے ذکر پر وقتی طور پر ساری ناراضی بھول کر

ان سب کو سننے میں محو تھیں۔

"کیا وقت! چائے بنوالو!" دادی کو انہیں آخر ٹوکنا پڑا تو وہ بھی چونک سی گئیں۔

اتنے سارے لوگوں کی چائے پانی...

ربیعہ کی غیر موجودگی۔

وہ جھلائی ہوئی دادی کے کمرے سے نکلیں۔

مہمان اتنے ہی ناپسندیدہ تھے جتنے انصار چچا کے گھر والے، لیکن اس وقت نہ چاہتے ہوئے بھی وہ انہیں تھوڑا سا نظر انداز کرنے پر مجبور تھیں۔

پھر یہ کہ اپنے گھر آئی خوشحالی کی جھلک دکھانے کی فطری سی خواہش انہیں بھی بہرحال تھی۔

انہوں نے کوریڈور سے نکل کر کچن کی طرف جاتے ہوئے پچھلے برآمدے میں لگے ہوئے وال کلاک کی طرف دیکھا۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔

مہمانوں کو نمٹا کر، دوپہر کے کھانے کو بھی دیکھنا تھا۔ معاذ شام کو دیر سے آتا تھا لیکن باقی تو سب ہی دوپہر کے کھانے پر ہوتے تھے۔

کبھی کبھی تو ربیعہ کو ایم اے میں ایڈمیشن دلانے کے فیصلے پر بھی افسوس سا ہونے لگتا تھا۔

"بیٹیوں کے بھی بڑے سکھ ہیں۔"

وہ کچن سے چند قدم کے فاصلے پر ہی تھیں کہ فضا میں اڑتی مزیدار سی خوشبو نے بے تاب کیا۔

وہ بڑی تیزی سے اندر آئیں اور اسی تیزی سے اپنی جگہ تھم سی گئیں۔

سامنے ٹرالی پوری طرح سیٹ تھی۔

رول، کباب، سموسے، چکن پیس، فنگر چپس، بہت سلیقے کے ساتھ سب کچھ رکھا گیا تھا۔

ورنی نے چائے کا پانی چولہے پر رکھتے ہوئے مڑ کر بھی دیکھا، نگاہ ان پر ڈالی۔

"کچھ بعید نہیں کہ وہ ابھی اس سارے اہتمام کو مسترد کر دیں، جو ان کی مرضی کو جانے بغیر وہ کر چکی ہے۔" اس کا دل بہت زور سے دھڑکا۔

وہ ان کے فریج، کیبنٹ اور کچن میں مداخلت کا جرم کر چکی تھی اور اب سو فیصد ان کی ناراضی کی حق دار تھی۔

کچن کی سلیب پر انگلی پھیرتے ہوئے، وہ سر جھکائے منتظر تھی کہ...

"ٹھیک ہے، یہ سب لے آؤ وہیں، اور پھر تھوڑی دیر بعد چائے بھی پہنچا دینا۔"

اس نے انہیں عقب سے کہتے سنا، ان کی آواز بے تاثر تھی کہ نہ تلخی، نہ نرمی، سو وہ اندازہ نہ لگا سکی کہ انہیں اس کی کارکردگی اچھی لگی ہے یا بری، لیکن کم از کم انہوں نے اسے قبول تو کر لیا تھا۔

وہ بڑی طمانیت سے مسکرائی۔

☼ ☼ ☼

وہ کب سے یہاں آ کر بیٹھا تھا۔

گو ساجد کے آنے میں ابھی خاصا وقت باقی تھا، مگر وہ چونکہ فارغ تھا، سو یہاں آ کر بیٹھ گیا۔

یہاں آنے کے لیے کچھ تو تھا، کم از کم انتظار ہی سہی۔

اس کا خیال تھا کہ سہ پہر کے اس سوئے سوئے سے وقت میں، یہاں باغ کے اس پرسکون گوشے میں وہ

تھوڑی ہی تھکے سے کام تھے—
فرصت، تنہائی اور خاموشی نے دھیان کو سیدھا اسی راہ پر ڈالا جس سے وہ بچتا پھرتا تھا۔
مندل کا گھر، اس کی کامیابی اور گتھی آرا اس نے اضطراب کے عالم میں پہلو بدلا۔
مندل کا اس دن ٹی وی پر دکھایا جانا اوروں کے لیے بے شک ایک معمول کا پروگرام ٹھہرا تھا مگر اس کے لیے تو جیسے راستے کا آخری حائل اسٹون ثابت ہوا تھا جس کے آگے منزل کے بجائے راستہ گم ہوا تھا۔
نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دباتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اس واضح اعلان لاتعلقی کو یاد کیا، جو مندل نے کمال یقین سے ٹی وی پر کیا تھا۔
"خالہ فیروزہ لاولد تھیں۔"
شناخت کی یہ آخری کیل اس رشتے کے تابوت میں ٹھوکی جا چکی تھی، جو اس کے لیے ہمیشہ باعث شرم رہا تھا۔ اب وہ کھل کر سانس لے سکتا تھا، سر اٹھا کر جی سکتا تھا۔ کسی سے بھی اپنا تعارف پورے اعتماد سے کرا سکتا تھا۔
نانی ستارہ جان اور فیروزہ کون تھیں؟
خدا جانے۔
اس کا اب کوئی بھی حوالہ ان سے نہیں ملتا تھا۔
روز قیامت وہ ضرور ماں کے نام سے پکارا جائے گا مگر اس روز کی شرمندگی اور پچھتاوے فیروزہ کی نسبت سے بھی کہیں زیادہ بڑے اور شرمناک ہوں گے شاید۔
اندر ہی اندر کچھ ہوتا ضرور تھا، لیکن باقی سب کی طرح اسے بھی روز آخر کی شرمندگی کے بجائے دنیا کی شرم کھاتی تھی۔
یہ آخری احسان تھا جو نانی ستارہ کے خاندان نے اس پر کیا تھا۔
ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ ان کا کم از کم اب تو شکر گزار ہوتا لیکن مندل کا شکوے سے اٹھا ہوا سر اور بے نیاز انداز دل میں کسی پھانس کی طرح گڑا تھا۔
"بھلا ہر بار وہی کیوں؟"
پیشانی کو رگڑتے ہوئے اس نے سامنے کھیلتے بچوں پر نگاہ جماتے ہوئے خود سے شکوہ کیا۔ اس کا وجود، اس کی نازو نعم میں ہوتی پرورش، اس کو بے بہا ملی محبتیں اور اب اس کا حال اور مستقبل بھی...
یہ سب ان ہی معتوب عورتوں کا قرض دار تھا جن سے تعلق پر اس نے ہمیشہ شرم کھائی تھی۔ اب اگر وہ انہیں کہیں سر راہ مل بھی گیا تو شناسائی کی کوئی ہلکی سی رمق بھی ان میں سے کسی کی آنکھ میں نہیں جاگے گی۔
بینچ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے خیام نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو بند کیا۔
"کیا ہوا خیام بھائی! سو گئے؟" ساجد خاموشی سے اس کے سامنے آکر کھڑا ہوا تھا۔
"نہیں بس ایسے ہی۔" وہ ہلکے سے مسکرایا۔
"رات کو نیند نہیں آئی کیا؟" ساجد بہت فکرمندی سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"بہت کمزور ہو رہے ہیں، رنگ بھی کم ہوتا جا رہا ہے آپ کا۔ کچھ کھایا پیا کریں نا!"
اسے بے ساختہ ہی نانی ستارہ یاد آ گئیں۔
جب وہ ٹھیک ٹھاک چین کی بانسری بجاتا تھا اور مشقت اور سختی کی یہ کڑی دھوپ خاصے فاصلے پر تھی۔ تو بھی انہیں اس کے لیے ایسی ہی تشویش رہا کرتی تھی۔

"کیا ہوا اتنے چپ کیوں رہنے لگے ہیں، کیا رات میں بالکل نیند نہیں آتی؟"
"نیند بستر پر آتی ہے۔"
وہ ہلکے سے ہنس پڑا۔ ساجد کی سمجھ میں اس کی ہنسی کی وجہ بالکل بھی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔
"کیا ہو گیا ہے آپ کو خیام بھائی! گم سم رہتے ہیں ساری رات آج کل؟" وہ اس کے قریب بیٹھ چکا اور اتنا پریشان نظر آیا تھا کہ خیام کو بے ساختہ ہی اس پر پیار آ گیا۔
"تم میری فکر مت کرو، بتاؤ کام کیسا چل رہا ہے؟"
اس بار اس نے دانستہ موضوع بدلنا چاہا تھا مگر ساجد نے بڑی لاپروائی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے اس کی کوشش کو رد کیا۔
"پہلے میری بات کا جواب دیں پلیز!" اس کا اصرار بڑھنے لگا تھا۔
خیام کو حالت زار بیان کرنی ہی پڑی۔
"فی الحال تو کوئی بھی ٹھکانا نہیں ہے۔ یار! رات گئے تک کسی تندور وغیرہ پر بیٹھا رہتا ہوں، اگر وہ اجازت دے دیتے ہیں تو تھوڑے سے پیسے لے کر وہیں کسی بینچ پر تھوڑی دیر سونے دیتے ہیں۔ اصل میں یہ لوگ بھی صرف اپنے علاقوں سے آنے والوں کو ہی جگہ، چارپائی، بستر دیتے ہیں۔ وہ بھی کسی کی ضمانت کے لیے۔ حالات اتنے خراب ہو چکے ہیں کہ لوگوں کا ایک دوسرے پر سے اعتبار اٹھ چکا ہے، اجنبیوں پر اب کوئی بھروسہ نہیں کرتا۔ اور ایک طرح سے ٹھیک بھی ہے۔"
اپنی بات ختم کر کے وہ ایک بار پھر ہنس پڑا شاید خود اپنے آپ پر مگر ساجد بالکل سنجیدہ تھا۔
"ٹھیک نہیں ہے، بالکل بھی ٹھیک نہیں ہے۔"
وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔
"چلیں آپ ابھی میرے ساتھ چلیں، سامان کہاں ہے آپ کا؟"
ٹھہرے ہوئے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔
"وہ میں نے وہیں تندور والے کے پاس رکھوایا ہے اس چھوٹے بیگ کے بھی پیسے لے رہا ہے وہ۔" خیام نے اس کی الجھن دور کی۔
"چلیں پھر پہلے سامان لیتے ہیں وہاں سے۔" خیام کا ہاتھ پکڑ کر وہ اسے اٹھانے میں کامیاب ہو چکا تھا، وہ حیران پریشان نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ کھنچتا چلا گیا۔
اس پُر ہجوم اور پُر ہنگامہ شہر میں یہی چھوٹا سا لڑکا اس کا محسن بھی تھا اور ہمدرد بھی۔ تندور والے سے اپنا بیگ لے کر وہ کتنی بسیں بدلتے اور کتنی ہی دیر پیدل چلنے کے دوران بھی اس نے بار بار پوچھنے کے باوجود بھی جب وہ کچھ نہیں جان پایا تھا تو آخر کار خود کو ساجد کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود بالکل ہی لاغرض ہو رہا۔
کچی آبادی کی ٹیڑھی میڑھی نہ ختم ہونے والی گلیاں اس کے پاؤں تلے طے ہوتی چلی گئیں۔
تب لوہے کے ایک چھوٹے سے دروازے کے سامنے اس سفر کا اختتام ہوا۔
"یہ میرا گھر ہے۔" حق ملکیت کا ہلکا سا غرور بڑا ہی فطری تھا۔
خیام نے دلچسپی سے اس چمکتے ہرے رنگ کے گیٹ کو دیکھا جس سے اٹھتی ہوئی پینٹ کی خوشبو بتا رہی تھی کہ ابھی تازہ تازہ ہی کرایا گیا ہے۔
"یہ میرا گھر ہے اور اب آپ کا بھی، سمجھ میں آیا۔" چٹکی بجاتے ہوئے اس نے پورے یقین کے ساتھ خیام کی طرف دیکھا تو وہ بے ساختہ ہی دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

وہ زوبیہ کو بے تاثر سے انداز میں دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔
"وہ تمہیں پتا ہے، جتنے لوگوں نے تمہارے شادی میں شرکت کی، انہوں نے فون کر کے مجھ سے کنفرم کیا ہے سلمان کے باپ کے بارے میں۔ لوگوں کی یادداشت دوسروں کی خامیوں کو یاد رکھنے کے بارے میں ہمیشہ بہت اچھی ہوتی ہے۔"
"میں ان لوگوں سے نہیں ملتی ہوں، ڈیڈی! میں نے انہیں کبھی منہ نہیں لگایا" "اور اب تو سلمان بھی تقریباً چھوڑ چکا ہے جانا آنا۔"
وہ ان کے بالکل قریب آکر کھڑی ہوئی۔
اس کے چہرے پر بڑھتی ہوئی عمر کے اثرات کے ساتھ تھکاوٹ کا احساس بھی پوری طرح قدم جما چکا تھا۔ وہ بالکل اپنی ماں کی کاپی تھی۔
اوسط سے بھی پیچھے آتی ہوئی جسے بمشکل گوارا کیا جا سکتا تھا۔
کہیں سے بھی تو وہ ان کی بیٹی نہیں لگتی تھی
ان کی فطری حسن پرستی کسی کسی وقت دل کو بڑا دکھاتی تھی۔
"آپ جو کہیں تو میں کرتی ہوں اگر سلمان سے طلاق لینا۔"
انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش رہنے کو کہا تو وہ بات بھی ادھوری ہی رہ گئی۔
"جو بھی فیصلہ کرو، سوچ سمجھ کر کرنا، اگر خود کو سنبھال سکتی ہو تو ٹھیک ہے، ورنہ اب اس عمر میں کوئی مناسب شخص ملنا اور مشکل ہی ہو جاتا ہے۔"
"مگر تم تو سالار میں انٹرسٹڈ ہو، زوبی کی شادی اگر اس سے ہو جاتی ہے تو پھر تو بات ہی کیا ہے، آج ہی اس منحوس سلمان سے پیچھا چھڑا لیتے ہیں۔"
مسز کمال نے تڑپ کر انہیں [illegible]۔
زوبیہ نے متفکر بھری نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔
"بڑی بھول ہوئی ہے مجھ سے ڈیڈی! سلمان سے شادی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے میں اسے سمجھا بھی لیتی لیکن وہ اتنے نچلے درجے پر جا چکا ہے کہ۔"
"سالار نہیں کرے گا زوبیہ سے شادی۔"
ایک بار پھر وہ اس کی بات کاٹ چکے تھے اور سرد لہجے میں کہی گئی یہ بات دونوں ماں بیٹی کا حوصلہ توڑنے کا سبب بنی تھی۔
"کیسے نہیں کرے گا۔ کیا خرابی ہے زوبی میں، صرف ایک شادی ہی تو ہوئی ہے پہلے، وہ بھی کون سا کنوارا پھر رہا ہو گا، سالوں غائب رہا ہے۔ پتہ نہیں کتنی کر کے چھوڑ چکا ہو گا۔ اب تو صورت شکل کا بھی خاص نہیں صرف پیسہ شاید ہم سے کچھ زیادہ ہے۔"
مسز کمال نے اپنی دانست میں بڑا منصفانہ تجزیہ کیا تھا۔ مگر اتنی دیر میں وہ پہلی بار مسکرائے۔
"پیسہ تھوڑا نہیں کافی زیادہ ہے ہم سے۔ اتنا کہ تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں۔ یا شاید لگا بھی سکتی ہو۔"
"تو پھر کیا برائی ہے اگر وہ پیسہ زوبی کی قسمت بن جائے۔ آخر تمہاری بہن بھی تو آج تک سالار کے باپ کی ہی دولت پر عیش کرتی رہی ہیں۔ اور اب تو سالار تمہارے بہت قریب آ چکا ہے۔ بہت اچھے تعلقات ہیں تمہارے اور اس کے۔ تھوڑا سا بھی زور دو گے تو مان جائے گا۔ اسے بھی کسی سرپرست کی ضرورت ہے۔ آخر کوشش تو کرو تم یوسف!"

"وہ کبھی بھی زوبیہ سے شادی نہیں کرے گا، میں صرف اتنا جانتا ہوں۔"
انہیں دیر ہو رہی تھی، مسز کمال جھنجلا کر واپس مڑے۔ عورتوں کو سمجھنا اور سمجھانا دونوں ہی مشکل ترین کام
"کیسے جانتے ہو؟ کوئی بات نکلوائی ہے یا کچھ بتایا ہے سالار نے؟"
مسز کمال بڑبڑاتے ہوئے ان کے پیچھے دروازے تک آگئیں۔
"وہ کسی اور سے محبت کرتا ہے۔ کسی اور ہی لڑکی سے۔ پھر کیسے شادی کرے گا زوبیہ سے؟ آیا سمجھ میں؟"
تپے ہوئے لہجے میں انہوں نے آخری پتا بھی شو کیا۔
"اور یہ اس کے ذاتی چہرے پر نہیں، آنکھوں میں لکھا دیکھا ہے۔ میں نے، مگر یہ بھی تمہاری سمجھ سے اوپر کی بات ہے۔ صرف وہ سمجھ سکتا ہے جس نے زندگی کے کسی دور میں کسی سے واقعی محبت کی ہو۔"
دروازہ کھول کر وہ تیزی سے بیرونی سیڑھیاں اترتے چلے گئے۔
اس بار وہ ان کے پیچھے جانے کے بجائے اپنی جگہ پر جمی کھڑی رہ گئیں۔
تیر یوں ہی ہوا میں چلایا ہوا تیر نہیں تھا۔ یوسف کمال کی اپنی زندگی سے جڑی سچائی تھی۔
"کیا وہ اب تک اسے نہیں بھولا؟" "اتنی مدت بعد بھی۔" ایک بڑا سا سوالیہ نشان ادھ کھلے دروازے کے بیچ آ کھڑا ہوا۔
سامنے بڑے سارے گیٹ سے نکلتی گاڑی میں بیٹھے یوسف کمال نے ایک گہری سانس لے کر خود کو کمپوز کرنا چاہا۔
آج دل میں کوئی اور ہی درد جاگا تھا۔
باہر سڑک پر دوڑتے بھاگتے لوگ، گاڑیاں اور ہجوم تھا۔
اور ہم اس ہجوم کا ایک غیر محسوس غیر اہم حصہ اور اس ہجوم میں کہیں نہ کہیں وہ بھی تھی۔
انہوں نے مسلسل بجتے موبائل کو بند کر دیا۔
اس وقت کسی سے بھی بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

شام آہستہ آہستہ ڈھلی۔
آسمان پر پھیلی سرخی سیاہی مائل نیلاہٹ میں بدلنے لگی۔ شاہانہ نے اگلے برآمدے کی لائٹس جلانے سے پہلے یوں ہی بالکونی میں کھڑے ہو کر محلے کا جائزہ لیا۔ ایک ساتھ سر جوڑے کھڑے اونچے نیچے گھر، گلیاں اور دور پیچھے شام کے اس بالکل آخری پہر میں کیسے ویران اور مایوس دکھائی دیتے تھے۔ جیسے یہاں کے مکین اپنے آپ میں ان گنت ان کہی کہانیاں سمیٹے ہوئے، رازداری کا بھرم رکھتے ہوئے۔
کلف لگے کالر اور پگڑیوں کی عزت بچاتے ہوئے، خود کو کوچۂ ملامت میں، چاروں طرف سے پڑتے پتھروں کی زد پر رکھ کر۔
کہ اب اپنے گریبان میں جھانکنے کا دور بھی کب کا وقت کے دھندلکوں میں گم ہوا۔
اب پہلا، دوسرا، تیسرا پتھر تھا، پتھر مارنے والوں کی کوئی کمی نہیں۔
لوگ اپنے ماتھے پر گہرے ہوتے سجدوں کے نشان اور عمرے، حج کی تعداد گنواتے ہوئے اپنے جنتی ہونے کی بشارت خود اپنے آپ کو اور ہر ملنے جلنے والے کو خود اپنے منہ سے دیتے ہیں۔
ان کے گرد قائم اگر حق کے معطر حصار کے باہر ہر شخص گناہ گار اور حقارت کی نظر کا مستحق۔ دور کہیں مسجدوں

ہے اذان مغرب بلند ہو رہی تھی شاما نے ادب سے دوپٹہ سر پر لپیٹا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر استغفار پڑھی اور بے محابا گرتے آنسوؤں کو رگڑ کر صاف کرتے ہوئے لائٹس جلا کر اندر جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ نیچے گاڑی رکنے کی مخصوص آواز پر تیزی سے دوبارہ نیچے جھانکا۔

بڑی سی گاڑی میں سے نگینہ اترتی ہوئی نظر آئی۔ ڈرائیور ادب سے دروازہ کھولے کھڑا تھا۔

"باجی نگینہ آگئی!"

مارے خوشی کے وہ اوپر سے ہی چلائی۔

نگینہ نے اسے بالکونی میں کھڑے ہاتھ ہلاتے ہوئے دیکھا اور مسکرا دی۔

شاما بھاگتی ہوئی نانی ستارہ کے کمرے کی طرف دوڑی۔ سب سے پہلے انہیں اطلاع دینا ضروری تھی۔

نانی ستارہ فیروزہ کی تصویر کے آگے کھڑی تھیں۔ آج کل فرصت کا وقت وہ ان ہی کے ساتھ راز و نیاز کرتے ہوئے گزارتی تھیں۔

شاما نے کئی بار انہیں بڑبڑاتے ہوئے سنا تھا۔

"نانی! باجی نگینہ آئی ہیں۔ خیر سے اتنی بڑی گاڑی میں بیٹھ کر۔"

"یہ کوئی وقت ہے۔ ہزار بار کہا ہے کہ آنا ہو تو دن میں چکر لگا لیا کرے۔ اس وقت محلے میں لوگوں کی آمدورفت شروع ہو جاتی ہے۔ سب ہی کو پتہ ہے کہ یہ صندل کا گھر ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اب لوگوں کے دل میں یہ تاثر رہے کہ وہ اب بھی یہاں آتی جاتی ہے۔ مگر یہ نگینہ۔"

"وہ آج تو گیتی بھی ساتھ ہے۔"

اس نے ڈرتے ڈرتے دوسری خبر بھی بریک کی۔ اصل اس لیے کہ جو ڈانٹ کچھ دیر بعد نگینہ کو پڑنی ہے، اس کا پہلا حصہ خود ہی جھیل لے۔ نانی نے بے ساختہ ہی ہاتھ سینے کو چھوا۔

"میں نے ہی اصرار کیا تھا۔ جب سے گئی ہے ایک بار بھی نہیں آئی تھی۔ بہت یاد آرہی تھی تمہاری۔"

لجاجت خوشامد۔

شاما کو نانی ستارہ کو منانا اچھی طرح آتا تھا اور نانی کو اس کی بے لوث محبت کا لحاظ مجبور کرتا تھا۔ اپنا صفائی نامہ پیش کرتے ہی وہ واپس دوڑی تھی مگر اس وقت تک وہ دونوں ہی اوپر آچکی تھیں۔

شاما دوڑ کر گیتی سے لپٹی۔

"بڑی بے وفا ہے گیتی! پلٹ کر دیکھا تک نہیں شاما جیتی بھی ہے یا مرگئی۔"

"اچھا بس اب یہ ڈرامہ نہ کر تیری فرمائش پوری کرنے پر ابھی اماں سے کتنی باتیں سنی ہیں۔ چل اندر چل۔"

نگینہ نے پیار سے جھڑکا اور گیتی کی طرف مڑی۔

"گیتی بیٹا! اپنے استاد جی کو سلام کرلو۔"

"وہ سوئے ہیں باجی! ابھی کچھ دیر پہلے ہی ڈاکٹر دیکھ کر گیا ہے۔ بخار آرہا ہے کئی دن سے۔"

شاما کے فوراً ہی کہنے پر نگینہ کو رکنا پڑا۔

"پہلے سے کیوں نہیں بتایا مجھے۔ میں کسی اسپیشلسٹ کو دکھا کر لاتی استاد جی کو۔ خیر کل خود لے کر جاؤں گی سارے ٹیسٹ کرواؤں گی ان کے۔"

وہ یکدم ہی فکر مند نظر آنے لگی۔

شاما نے بڑی فخریہ مسکراہٹ کے ساتھ نگینہ کو دیکھا۔

"کیسا پیارا اجلا دل ہے باجی نگینہ کا۔ کتنے بڑے گھر میں رہتی ہیں صندل جیسی اسٹار کی ماں ہیں مگر ذرہ غرور نہیں۔"

بالکل ٹھیک ہو گئی ہیں اور بہت سال تو ذرا کسی کے دن بچھڑے نام نہ مجھے سب بدلا بدلا لگتے ہیں۔"

نگینہ اور گیتی کے پیچھے چلتے ہوئے وہ چپ چاپ کچھ سوچ رہی تھی!

اندر نانی منتظر تھیں۔

گیتی جس طرح ان سے لپٹ کر روئی تھی۔ اس نے انہیں غصہ کرنے کا بھی موقع نہیں دیا۔

"خدا نہ کرے کوئی ایسی ویسی بات ہے۔"

انہوں نے پریشان ہو کر نیچی آواز میں نگینہ سے پوچھ بھی لیا مگر وہ بے فکری سے ہنس پڑی۔

"آپ کے بغیر رہنے کی عادی نہیں ہے اس لیے گھبرا رہی ہے وہاں۔ ورنہ سارا دن میرے ساتھ ہوتی ہے۔ اکیلا نہیں چھوڑتی اسے میں۔"

اس نے مناسب الفاظ میں ان کی تسلی کروائی تو وہ کچھ مطمئن ہوگئیں۔

"پھر بھی گیتی کو یہاں لانے سے پہلے مجھ سے پوچھ ضرور لیا کرو۔ میں نہیں چاہتی کہ یہاں اب زیادہ تم لوگوں کا آنا جانا ہو۔"

جب وہ کمرے سے باہر گئی تو نانی نے ایک بار پھر تاکید کرنا ضروری سمجھی۔

"آپ کے بغیر دل بھی تو نہیں مانتا اماں! میرا بس چلے تو روز چکر لگاؤں۔ بس آپ کے ڈر سے دل مار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اب صندل بھی مارچ گئی ہے۔ آؤٹ ڈور پر۔ گھر میں ایسا سناٹا ہے کہ وقت گزارنا مشکل ہو رہا ہے۔ اوپر سے یہ گیتی۔"

"کوئی سلسلہ بنا گیتی کا؟" جو فکر نانی ستارہ کو دن رات کھا رہی تھی، پہلا سوال یہی تھا۔

"ہاں اماں! بلال صاحب نے بتایا ہے [illegible]"

نگینہ کے چہرے پر رنج کے آثار آئے تھے۔

"مگر کیا علی تو ہو نا تم ان دونوں سے؟"

"جی اماں ہوں، پر دل نہیں مان رہا اماں! شکل سے ہی اوباش، شوقین مزاج سے نظر آتے ہیں۔ عادی شرابی، دو دو بیویاں پہلے سے گاؤں کی حویلی میں۔ بلال صاحب کا اصرار ہے کہ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلینا چاہیے۔"

تفصیل گوش گزار کرکے وہ ان کی طرف اس طرح امید بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی جیسے وہ مذکورہ امیدواروں کے حالات و حرکات میں کسی تبدیلی کی پیش گوئی کرسکتی ہیں۔ مگر ایسا نہیں تھا۔

"ہمارے ہاں تو ایسے ہی لوگ آئیں گے نگینہ! ایک شریف سیدھا سادا لڑکا نہ تو آئے گا نہ ہی ہمیں قبول ہوگا۔ ایسے لڑکے تحفظ نہیں دے سکتے ہمارے ہاں کی لڑکی کو۔ عزت اور شرافت کے ساتھ خاندان اور معاشرے کا دم چھلا ضرور لگا ہوتا ہے۔ فیروزہ ان ہی کے ہاتھوں بھری جوانی میں خاک کا رزق بن گئی۔ اب ہمت نہیں ہے وہی سب دہرانے کی۔" ان کی آواز بتدریج نیچی اور اونچی ہوئی۔

آخری جملہ محض ایک خوف زدہ سی سرگوشی کی صورت ہی نگینہ نے سنا۔

خوف کی ایک سرد سی لہر اس نے اپنے سارے وجود میں دوڑتی ہوئی محسوس کی تھی۔

(اگلی قسط آئندہ ماہ)

اُمِ ثمامہ

چمپا کلی اور گورا صاحب

آج ہفتے کا دن تھا۔ چمپا کلی صبح سے ہی ادھ ٹوٹے شیشے کے آگے اپنے روپ کو سنوار رہی تھی اس نے ہونٹوں کو مسی سے رنگا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل کی دھار کھینچی۔ سانولے رنگ کو سستی سی کریم سے گورا کرنے کی ناکام کوشش کی۔ رنگ سانولا تھا مگر نین نقش کھلے کھلے تھے ناگن سی بل کھاتی کالی چوٹی میں کھولی کے پچھواڑے لگے چاندنی کے پھول اٹکائے‘ پیروں میں پائلوں کے ساتھ کولہا پوری چپل پہنی‘ ماتھے پر بندی لگائی‘ ریشمی ساڑھی کے پلو کو آگے سے پھیلا لیا‘ تیاری پر آخری تنقیدی نظر ڈالی اور جانے کو تیار کھولی سے باہر آگئی۔

"چمپا کلی! اتنا کاہے کو سج دھج کر محل جاوے ہے کسی راجا کی نجر میں آگئی تو کھٹنائی میں پڑ جاوے گی۔" ماتا نے ہمیشہ کی طرح سمجھانا چاہا۔

"چاچا! ارے بھری بھولی ماتا! ان کی نجرن میں تو چاند اترت ہیں ان کی بانہوں میں تو پھول مہکت ہیں ہم ان کی نجراں میں کیسے آسکت ہیں‘ یہ سب سنگھار تو ہم اپنے لیے کرت ہیں تم بے پھکر رہو چمپا کلی کو کوئی میلی آنکھ سے دیکھن کے بعد کدھر جاوے گا اب ہم چلت ہیں۔ دیر ہورہی ہے۔"

اور پھر وہ کھولی سے باہر نکل کر راج بھون کی طرف روانہ ہوگئی۔ ہفتے کے تین دن محل کی صفائی ستھرائی کا ذمہ سرکار کی طرف سے چمپا کلی کا تھا وہ محل میں جانے کے لیے محل کے شایان شان تیاری کرتی تھی‘ وہاں موجود رانیوں مہارانیوں سے اس کا کوئی مقابلہ تو نہیں تھا مگر اس کا من اسے اس تیاری پر اکساتا تھا۔ وہ تھی تو بنجارن مگر مزاج مہارانیوں والا ہی پایا تھا‘ سات پشتوں سے اس کے باپ دادا ٹھاکروں مہاراجوں اور گورا صاحب کے محلوں کی صفائی کرتے آرہے تھے۔

سوچوں سوچوں میں وہ راج بھون کے بڑے سارے آہنی دروازے کے آگے پہنچ گئی۔ دروازے پر خاکی نیکر بوشرٹ پہنے ایک دربان کھڑا تھا۔

"آگئی چمپا کلی! آج تو آفت لگے ہے‘ آفت۔" اس نے ہمیشہ کی طرح دانت کھوستے ہوئے اسے چھیڑا۔

"ہٹ پرے موا! اب ایک شبدھ بھی جبان سے نکالا تو ای آفت سیدھی تمہارے اوپر ٹوٹ پڑے گی۔" ... وہ اندر داخل ہوگئی۔

سامنے بڑے ٹھاکر جی وکیل صاحب کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھے باتیں کررہے تھے اس نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کہا اور اندر دالان کی طرف مڑگئی چھن چھن کرتی وہ ابھی اندر داخل ہی ہوئی تھی کہ روپ متی ماسی نے اسے جا لیا۔

"آگئی چمپا کلی! جلدی آ کب سے تمہاری راہ تکوں ہوں۔"

"کیوں ماسی سب منگل شانت تو ہووے؟"

"ہو ہاں ہاں بڑے ٹھاکر جی کی لندن والی مہارانی کے سپتر آرہے ہیں بڑے ٹھاکر جی نے کہا ہے کہ محل کا کونہ کونہ چمکنا چاہیے راجکمار بہت صفائی والے ہیں۔ اب تو جلدی سے اپنے کام میں جت جا وہ شام کو اڑن کھٹولے میں بیٹھ کر آویں گے۔"

موٹی سی روپ متی ماسی راج بھون کی صفائی ستھرائی کے کام کی نگران تھی ادھر لے تھل تھل کرتی ادھر سے ادھر پریشان پھر رہی تھی‘ چمپا کلی نے سامنے سے آتی ہوئی ٹھکرائن نندی کماری کو نمسکار کیا اور کام میں جت گئی بڑی ٹھکرائن کے چہرے پر کچھ چھن جانے اور ناکامی کے واضح آثار نظر آرہے تھے۔

بے چاری بڑی مالکن تین بیٹیاں پیدا کر کے بانجھ ہوگیا ان کے لیے اس کارن سوت کے بیٹے کو تاج اور ساری ریاست کی بھاگ ڈور ہاتھ میں لیتا برداشت کررہی تھی۔

چمپا کلی نے دکھ اور ہمدردی سے سوچا بڑی ٹھکرائن کے سپتر نہ ہونے کی وجہ سے بڑے ٹھاکر جی مہاراجہ ادھے سنگھ نے اپنی لندن والی گوری میم کے بیٹے کو ریاست اور جائیداد کی رکھوالی کے لیے پردیس سے بلوایا تھا اور کچھ لمحے میں اس کی تاج پوشی بھی ہونی تھی۔

رات کا تاروں سے سجا گھونگھٹ شام کے مکھڑے پر ڈلنے ہی والا تھا چمپا کلی کام کرکے تھک کر چور ہوگئی تھی اوپر سے بھوک بھی ستا رہی تھی وہ رسوئی گھر کی طرف روانہ ہوئی جہاں ... شہر سے بابو ... بلوا لیا گیا تھا جو راجکمار کے لیے ولایتی بھوجن پکا رہا تھا اور محل کے باورچی پنڈت شرما منہ کھولے ساری چیزوں کو تک رہے تھے جو انہوں نے زندگی بھر نہیں دیکھی تھیں گھر کا بھوجن تو وہ پہلے ہی پکا چکے تھے چمپا کلی تھالی میں بھوجن لے کر باغیچہ میں آگئی اسے یہاں بھوجن کھانا بہت پسند تھا۔

ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی پھول ہی پھول تھے‘ اس نے دال اور چاول ملائے اور اچار کی ٹکڑی ملا ملا کر کھانے لگی۔ اتنے میں باہری دروازے کی طرف سے بگل بجنے کی آوازیں آنے لگیں‘ وہ دم دم کی باڑ کے پیچھے لگ کر کھڑی ہوگئی اب اسے دروازے والا حصہ بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا‘ سوٹ بوٹ پہنے ایک گورا صاحب سفید ہاتھی پر بیٹھا تھا بگل بج رہے تھے رستے میں پھولوں کی پتیاں بچھائی جارہی تھیں‘ اشلوک پڑھے جارہے تھے۔

بڑے مہاراجہ ادھے سنگھ اپنے پرکھوں کی تلوار ہاتھ میں تھامے بیٹے کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ولایتی بابو کو مہاوت نے ہاتھی سے نیچے اتارا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر بڑے ٹھاکر جی کے چرن چھوئے اور گلے سے لگ گئے۔ ٹھاکر جی نے پرکھوں کی تلوار ان کے ہاتھ میں تھمائی۔ باپ کا کوئی نقش چہرے پر نہیں تھا۔ ماں کی طرح نرے انگریز تھے گورا صاحب۔

پنڈاری جی انہیں ریاست اور شہر کے بڑے بڑے امراء اور ٹھاکروں سے ملوا رہے تھے‘ پھر وہ اندر کی طرف ہولیے چوکھٹ پر بڑی ٹھکرائن نے آرتی کے تھال سے ان کی آرتی اتاری۔ گورا صاحب نے چرن چھو کر نمسکار کیا۔ انہوں نے تلک لگا کر منہ میٹھا کروایا اور پھر وہ سب محل کے اندرونی حصے میں داخل ہوگئے۔

چمپا کلی کا کام ختم ہوچکا تھا۔ وہ بھی راج بھون کے داخلی دروازے سے باہر نکل گئی۔

"میں نے تمہارے ... کتنی بار بولا ہے کہ بھرے ...

ساتھ بدتمیزی نہ کرت ہو، مگر ہم انگریز کا یہ کپڑا پہن کر خود کو کیا سمجھتے ہو۔ آج ہم تم کو گولی سے اڑا دیں گے۔ ذات کا نائی سالا نیکر پو شرٹ پہننے سے کیا بابو بن جاوت ہے۔" وہ جو کوئی بھی تھی زبردست نارائن کا کالر پکڑے اسے بے بھاؤ کی سنا رہی تھی۔ ٹھاکر منسل سنگھ گاڑی سے نیچے اترے اور اس کے پیچھے جا کھڑے ہوئے۔

"اے مسٹر! کیا پرابلم ہو، مانگتا یہاں۔" چمپا کلی نے جلدی سے نارائن کا کالر چھوڑ کر گورا صاحب کو نمستے کیا۔

"وہ سر کچھ نہیں ہے، بس یونہی یہ چمارن ہم سے مذاق کرت ہے" نارائن نے بات سنبھالتے ہوئے کہا۔ چمپا کلی نے کھا جانے والی نظروں سے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔

"ارے کاہے کا مذاق تمہارے لیے اتی بڑی بات مذاق ہوت ہے اور چمارن کی اجت، اجت نہ ہوت ہے۔"

اس نے طیش میں آکر پلٹ کر ٹھاکر منسل سنگھ سے سوال کیا۔

"مگر اس نے کیا کیا ہے، جو تم اتنا غصہ کرنا مانگتا" گورا صاحب نے ٹھہر ٹھہر کر پوچھا۔ ولایت میں پلنے بڑھنے کے بعد بھی ان کی ہندی کافی اچھی تھی۔

"اس پاپی نے آج ہمارا ہاتھ تھاما اور فضول فضول بکواس کرت ہے۔ میں چمپا کلی ہوں، چمپا کلی۔ آج تو آپ کی وجہ سے بچ گیا ورنہ آج اس کا وہ حشر کرتی کہ سارا اسنسار تماشا دیکھت ہو۔" وہ بجلی سی چھوٹی بلا کی راج بھون کے اندر چلی گئی۔

"اے لڑکی! ہماری بات سنو!" چمپا کلی باہر ہی سیڑھیوں کو دھو رہی تھی۔ گورا صاحب کے بلانے پر دوڑی۔

"جی جی گورا صاحب! ہم سے کوئی کام ہوت ہے؟ آپ کے کمرے کو تو ہم نے ایک دم چکا چک چمکایا ہے۔" وہ جلدی جلدی اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کرنے لگی۔

"تو... تو کام تو تم نے فرسٹ کلاس کیا ہے۔ ایسے ہی تم سے بات کرنا مانگتا تھا، تمہارا نام کیا ہے؟" گورا صاحب نے پرشوق نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"چمپا کلی!" جلدی سے بتایا گیا۔

"واؤ! ویری بیوٹی فل نیم، تم ہم کو اچھی لگی ہو، وہاں ولایت میں ہم نے ایک سے بڑھ کر ایک پڑھی لکھی امیر اور خوب صورت لڑکیاں دیکھی ہیں، مگر تم میں کچھ خاص ہے، راج بھون میں تمہارا کام، تمہاری ذات پھر بھی تمہارا حد سے زیادہ کانفیڈنس جو بیوٹی سے زیادہ ہے، تم ہمارا بات سمجھتا چمپا کلی؟"

گورا صاحب نے جانے کیا بولا، وہ تو پلے نہ پڑا، مگر اس ملاقات کے بعد وہ راج بھون میں جہاں جہاں کام کرتی، وہ آنکھیں مسلسل اسے گھورتی رہتیں، وہ جلدی جلدی کام نپٹا کر کھسک جاتی۔

"اے چمپا کلی! تمہارے کو چھوٹے حکم جی اوپر کمرے میں بلاوت ہیں، جلدی سن کے آجا۔" وہ باغ میں بیٹھی بھوجن کر رہی تھی۔ راجی نے آکر اسے سندیسہ دیا تو وہ حیران پریشان گورا صاحب کے کمرے کی طرف دوڑی۔

دروازہ کھولا تو گورا صاحب کرسی پر بیٹھے تھے۔ وہ نمستے کر کے نیچے قالین پر بیٹھ گئی۔

"ارے چمپا کلی! یہاں نہیں، یہاں اوپر بیٹھو ہمارے پاس، آج ہم تم سے ایک خاص بات کرنا مانگتا۔"

"کیسی بات گورا صاحب؟" ان کی پیش کش کو نظر انداز کرتے ہوئے چمپا کلی نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"چمپا کلی! تم ہمارے من میں بس گئی ہو، ہم اپنی پڑھائی پوری کرنے کولکتہ جا رہے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ روپ متی بوبی کے ساتھ تم بھی ہمارے ساتھ کولکتہ چلو، ہم تمہیں بہت عیش کرائے گا، ہم کو سچ مچ کی چمپا کلی بنائے گا۔"

چمپا کلی کو لگا پورا راج بھون اس کے سر پر آن گرا ہو۔

"گورا صاحب! ہم حکم جی کی وجہ سے آپ کی بہت اجت کرت ہیں اور پھر اس محل کا نمک کھاوت ہیں، اگر چمپا کلی سے یہ بات اور کوئی بولتا تو ہم اس کی زبان گدی سے کھینچ لوت، ہر کوئی ایک سا نہیں ہوت ہے اور پھر کلاس کے چند روپوں اور دھرتی کی دھول کا کیا میل گورا صاحب! اچھا ہوت کہ آپ اس خیال کو دماغ سے نکال دیں۔"

چمپا کلی نے غصے سے گورا صاحب کو گھورتے ہوئے کہا۔

"او ڈیر! تم غلط سمجھا ہے، تم ہم کو اچھی لگتی ہو، ہم تم سے شادی بنانا مانگتا ہے، مگر ابھی کچھ عرصے تک ہم چاہتا ہے یہ بات گپت رکھنا مانگتا، ہماری تعلیم پوری ہونے کے بعد تم راج بھون میں ہماری پتنی کے روپ میں ہمارے ساتھ رہنا۔"

"گورا صاحب! آپ بھگوان کی سوگند کھا کر بتاؤ کہ آپ بھی مجھ سے بیاہ کرنا چاہتے ہو؟" چمپا کلی نے غیر یقینی کی کیفیت میں بس اتنا ہی پوچھا۔

"یا گاڈ! کلی! اس میں ہمیں کچھ نہیں، تم سے پریم ہو گیا ہے، تم کل ہم کو وچار کر کے بتا دینا، پرسوں ہم چلا جائے گا۔"

چمپا کلی جلدی جلدی ایک ساتھ دو دو سیڑھیاں پھلانگتی نیچے اتر آئی اور اوپر نیچے ہوتی دھڑکنوں کو بحال کرنے لگی۔ جو سب کچھ وہ ابھی اوپر سے سن کر آئی تھی کہ وہ سب سچ تھا کوئی سپنا، اگر سپنا تھا تو بھی بہت سندر تھا اور چمپا کلی کے نینوں سے مہنگا اور بہت بڑا تھا۔ کہاں وہ چمارن اور کہاں راجہ ٹھاکر منسل سنگھ گورا صاحب۔

کھاٹ پر کروٹیں بدل بدل کر جسم دکھنے لگا تھا، نیند کی دیوی مانو اس سے روٹھ گئی تھی، کبھی وہ خود کو راج بھون میں مہارانی بنی گھومتا دیکھتی، کبھی گورا صاحب کے پہلو میں خود کو کھڑا دیکھتی اور پھر جب وہ کولکتہ سے گورا صاحب کی پتنی کے روپ میں ان کے ساتھ واپس آئے گی تو بے چارے دربان نارائن پر کیا گزرے گی، وہ سوچ سوچ کر مسکراتی رہی اور پھر اس نے صبح تک حقیقت کے سب ہی کواڑ کس کر بند کرنے کے بعد سپنوں کا ہاتھ تھامے کلکتہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے سوچا اب جب وہ ٹھکرائن کے روپ میں ریاست میں قدم رکھے گی تو اس کے ماتا پتا کا سر کتنا اونچا ہو جائے گا، وہ انہیں یہ خوشی اچانک دینا چاہتی تھی۔

چمپا کلی راج بھون میں داخل ہوئی تو گورا صاحب باغ میں بے چینی سے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ اسے آتا دیکھ کر جلدی سے اس کے پاس چلے آئے۔

"تم نے کیا فیصلہ کیا چمپا کلی؟" انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔ چمپا کلی نظریں نیچی کیے کچھ دیر کھڑی مسکراتی رہی اور پھر شرما کر اندر کی طرف چلی گئی۔

ٹھاکر منسل سنگھ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ وہ اطمینان سے اندر آکر کل کی تیاری کرنے لگے۔ راج بھون سے حکم نامہ لے کر اس کے ساتھ روپ متی بوبی خود آئی تھی، پھر ماتا پتا کی کیا مجال تھی کہ انکار کرتے اور روپ متی بوبی کی وجہ سے انہیں کافی ڈھارس تھی اور پھر وہ چمپا کلی کے بھید بھاؤ سے بھی آشنا تھے۔

چمپا کلی نے اپنی گٹھڑیا سامان باندھا، ماتا کے گلے لگی، پتا کے چرن چھوئے اور آشیرباد لے کر گھر سے راج بھون کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہ بڑی ساری موٹر کار میں جب گورا صاحب کے ساتھ بیٹھ کر روانہ ہوئی تو نارائن کا منہ دیکھنے والا تھا۔ روپ متی بوبی گورا صاحب کے پروگرام کے مطابق بیمار پڑ گئی تھی اور وہ ان کے ساتھ نہیں جا رہی تھی، باقی نوکر وہاں پہلے سے ہی موجود تھے۔

کولکتہ آنے کے بعد چمپا کلی کے جیون میں وہ بدلاؤ آئے کہ اس نے کبھی سپنے میں بھی نہیں سوچا تھا۔ گورا صاحب کہیں باہر گئے تھے اور وہ بڑے سے محل میں بیٹھی ان کا انتظار کر رہی تھی، سب کچھ نیا نیا تھا، پہلی بار وہ اتنی بڑی موٹر میں بیٹھ کر اتنے بڑے شہر آئی تھی اور پھر محل میں وہ چمارن نہیں، مالکن بن کر رہ رہی تھی، نوکروں سے گورا صاحب نے اس کے بارے میں جانے کیا کہا تھا، وہ اس سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔

"چمپا! مائی ڈارلنگ' دیکھو ہم تمہارے لیے کیا لایا ہے۔" گورا صاحب نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے پکارا' اس نے پلٹ کر دیکھا' ان کے ہاتھوں میں بڑے بڑے سامان سے بھرے موٹی لفافے تھے۔

"ان میں کیا ہے گورا صاحب! میرا مطلب ہے ٹھاکر جی۔" سنیل سنگھ نے اسے گورا صاحب کہنے سے منع کیا تھا۔ مگر اس کے منہ سے یہی نام نکلتا تھا' کیونکہ پہلی بار جب اس نے انہیں دیکھا تھا اس کے دل سے یہی آواز نکلی تھی۔

"یہ دیکھو۔" انہوں نے ایک کے بعد ایک ڈبے کو کھولنا شروع کر دیا۔ چاندی اور سونے کے تاروں اور گوٹے سے بنی لال بنارسی ساڑھی جو آج تک اس نے بڑی ٹھکرائن اور مہارانیوں کے جسموں پر ہی بھی دیکھی تھی۔ اصلی سونے سے بنے ہار' بندے' نتھ' نیکلس' پائل وہ آنکھیں اور منہ کھولے ایک ایک چیز کو ڈر ڈر کر چھو رہی تھی جیسے سب کچھ ابھی آنکھوں کے سامنے سے اوجھل ہو جائے گا' اپنی قسمت اور گورا صاحب کی محبت کے بارے میں سوچ کر اس کی آنکھوں میں موتی چمکنے لگے۔

"ارے یہ کیا سویٹ ہارٹ' ہم تمہاری خوشی کے واسطے یہ سب لاتا مانگتا اور تم رونا مانگتا' تم یہ سب پہن کر جلدی سے تیار ہو کر آجاؤ۔ ابھی تھوڑی دیر میں پنڈت صاحب آنے والے ہیں' پھر وہ ہمارے پھیرے کروا دیں گے اور ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے' ہری اپ جلدی کرو میں تمہیں دلہن کے روپ میں دیکھنے کو بے تاب ہو رہا ہوں۔" گورا صاحب نے چمپا کلی کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھایا اور سارا سامان اسے دے کر اسے کمرے کی طرف روانہ کر دیا۔

بڑے سارے سنگھار میز کے قد آدم آئینے کے آگے چمپا کلی کو اپنا بنا سنورا روپ نظر آرہا تھا' اس وقت ماتا ہوتی تو بہت خوش ہوتی' اس نے دکھی دل سے سوچا' اب لگ رہی ہوں نا مہارانی چمپا کماری' تب گورا صاحب نے آکر اسے کندھوں سے تھام لیا' آگے پتا ہی نہیں چلا' "چلو نیچے پنڈت جی ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔" وہ سج سج قدم اٹھاتی ٹھاکر سنیل سنگھ کا ہاتھ تھام کر سیڑھیاں اترنے لگی' اشلوک پڑھے گئے' پھیرے ہوئے' کب گلے میں ور مالا ڈالی' کب منگل سوتر پہنایا گیا' کب گورا صاحب نے اس کی مانگ میں سندور بھرا' اسے کچھ پتا نہیں چلا' سب کچھ خود بخود کسی جادو منتر کی طرح ہوتا چلا گیا۔

پنڈت جی سے آشیرباد لیتے ہوئے اسے ماتا پتا پھر بے طرح یاد آئے۔

گورا صاحب اس کا ہاتھ تھامے تھامے اسے اپنے کمرے میں لائے' انہوں نے سارے کمرے کو لال گلابوں سے سجایا تھا۔ انہوں نے اسے بیڈ پر بٹھایا اور جیب سے وہ بہت پیارے جڑاؤ کنگن نکال کر اس کی سانولی کلائی میں پہنا دیے۔

"چمپا کلی! تم میں جانے ایسا کیا تھا کہ جس نے ہمیں اتنا بڑا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے اسے اپنا حال دل اور دیوانہ پن بتا رہے تھے اور وہ ان کی محبت کے سمندر میں ڈوبتی ابھرتی رہی' رات کے آخری پہر سے صبح کی پہلی کرن کے نکلنے میں کوئی پیار بھری سرگوشی اور وعدے بسے۔

ان کے دیوار کو ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ اس سارے سمے میں گورا صاحب نے اسے اتنا پیار دیا کہ وہ راج بھون' ماتا پتا' اپنی کھولی' اور ٹوٹا شیشہ' پچھواڑے کی چاندنی' جھاڑو سب کچھ ایک دم فراموش کر چکی تھی۔ ایک ہفتے کے پیار' اچھے رہن سہن' خوراک' کپڑوں' زیور نے چمپا کلی کے روپ میں ایک انوکھی سی چمک بھر دی تھی۔

چمپا کلی باغیچے میں سے لائی موتیا کی کلیوں کا گجرا بنا رہی تھی کہ گورا صاحب تیار ہو کر کمرے سے باہر آئے' آج ان کی رہائی کا پہلا دن تھا۔ اس نے گورا صاحب کی آرتی اتاری' تلک لگایا' چرن چھوئے اور منہ میٹھا کروایا۔

"چمپا کلی! ادھر آؤ" آرتی کی تھالی میز پر رکھ کر پلٹی تو گورا صاحب نے آواز دی' وہ ان کی ٹائی کی ناٹ سے کھیلتی ہوئی مخمور مخموری ان کے قریب کھڑی تھی۔

"ہاں ٹھاکر جی!" اتنے سے دنوں میں گورا صاحب والی اجنبیت کہیں دور جا کھڑی ہوئی تھی اور چھوٹی ٹھکرائن ٹھاکر کہنا سیکھ گئی تھی۔

"آج شام تک روپ متی موتی ریاست سے آجائے گی تم اسی موٹر میں بیٹھ کر واپس چلی جانا اور وہاں جاتے ہوئے یہ سب سامان یہیں چھوڑ جانا۔ کسی اور کے کام آئے گا۔" جب ٹھاکر سنیل سنگھ نے اسے اپنی پسندیدگی کے بارے میں بتایا تھا تو اسے لگا تھا کہ پورا راج بھون اس کے سر پر آن گرا ہو' مگر اب جو وہ کہہ رہے تھے اسے سننے کے بعد پورا کا پورا لکھنؤ چمپا کلی کے سر پر آن گرا تھا۔

"آپ کا ہے کو مذاق کرت ہو ٹھاکر جی۔" اس کے حلق سے بامشکل یہی جملہ نکل سکا۔

"چمپا ڈیئر! کیسا مذاق۔ ہم نے آج تک جو چاہا وہ پایا' تم راج بھون کی ساری نوکرانیوں سے تھوڑا ہٹ کر تھیں' تمہارے اندر جو غرور تھا وہ تمہیں ہماری طرف کھینچتا مانگتا' ہم تمہیں پیسے دے کر پانا چاہتے تھے مگر اس دن [illegible] اور تم نے بھی اس سارے ہفتے میں وہ سب کچھ دیکھا برتا اور پایا جس کے بارے میں تم سپنے میں بھی نہیں سوچ سکتی۔

سو حساب برابر اور اس کے بارے میں کسی کو بتانے کی کوشش کی تو تم اور تمہارا پریوار بہت مشکل میں پڑ جائے گا۔"

"لیکن گورا صاحب!" اجنبیت کی ایک اونچی سی دیوار پھر سے بیچ میں حائل ہو گئی تھی۔ "وہ پھیرے' وہ پنڈت' وہ سہاگ کا جوڑا' زیور۔" چمپا کلی نے سپنا نما حقیقت کا ایک چھوٹا سا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ اسے ابھی تک وشواس نہیں ہو رہا تھا کہ ٹھاکر جی سے گورا صاحب کا سفر اتنا مختصر بھی ہو سکتا تھا۔

"ڈارلنگ! وہ بھی اس ڈرامے کا ایک حصہ تھا' ہم نے اپنا کام اپنے شایان شان ہی کرنا تھا اور وہاں اپنی ماتا سے کہنا' کوئی بھلا مانس چمار دیکھ کر تمہاری شادی کروے' ہم سارا خرچا اٹھائے گا۔"

شام تک چمپا کلی نے اپنی کھدر کی سادہ سی اور میلی ہوئی کولہاپوری چپل پہنی' بدرنگی بندی لگائی اور واپس جانے کے لیے تیار ہو گئی' جس گاڑی میں روپ متی موتی بیٹھ کر آئی وہ اسی گاڑی میں بیٹھ کر ریاست واپس آگئی' اس کے واپس آنے تک گورا صاحب واپس نہیں آئے تھے۔

"دیکھو چمپا کے باپو! ہماری چمپا کلی کو کیا ہوت ہے' کیسے کملائی گئی ہے۔ شہر سے آنے کے بعد۔"

وہ پانچ دن سے کھولی میں اپنے کمرے میں پڑی بخار میں پھنک رہی تھی' اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا' وہ جو بڑا اچھوت کا شور مچاتی تھی' کبھی تھی کہ چمپا کلی کی طرف کوئی میلی نظر سے نہ دیکھ سکت ہے' وہ گورا صاحب اور اپنے دل کے لالچ کے آگے مات کھا گئی تھی گورا صاحب نے اس سے پریم کے نام پر دھوکا کیا تھا۔ وہ کیوں یہ بھول گئی تھی کہ کوئی چمارن کیسے راج بھون کی مہارانی بن سکتی ہے' ابھی تو [illegible] آن گرا تھا۔

آج بخار کی شدت میں کچھ کمی محسوس ہوئی تو وہ راج بھون جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پہلے ہی وہ دن کی چھٹی ہو گئی تھی اور وہاں سے سندیس بھی آچکا تھا کمرے کی دیوار پر لگے ادھ ٹوٹے شیشے نے حیرت سے چمپا کلی کو دیکھا۔ کاجل مسی کریم سب ویسا کا ویسا ان چھوا رکھا تھا۔ کھولی کے پچھواڑے سے چاندنی کے پھول جھانک جھانک کر دیکھ رہے تھے۔ پائلیں بچھوؤں کی جھنکار کے بغیر میز پر جوں کی توں دھری رکھی تھیں۔ بدرنگ بندی ٹوٹے شیشے کے ماتھے پر چپکی ہوئی تھی۔ وہ کمرے سے باہر نکلی جھاڑو اٹھائی اور کھولی سے باہر نکل گئی۔

"چمپا کلی کے باپو! مجھے تو بہت چنتا ہوت ہے' ناری کے بے حد شنگھار کرنے اور بالکل شنگھار نہ کرنے کا کارن ہمیشہ کوئی پُرش ہی ہووے ہے جب سے چمپا کلی شہر سے آئی ہے بالکل بدل گئی ہے۔"

"ارے کاہے پریشان ہوت ہے بھگوان سب بھلی کرت ہے اسے ملپ تھا اسی لیے اتنی کمزور لگت ہے۔" ماتا پتا کی آوازوں نے گلی کے کونے تک اس کا پیچھا کیا۔

راج بھون کے دروازے پر نارائن بیٹھا تھا۔

"ہائے چمپا! تم کب واپس لوٹت ہو۔ آنکھیں ترس گئی تمہارے دیدار کو۔ کیسی ہو کچھ بیمار لگت ہو۔ شہر میں سب ٹھیک تھا ناں؟" نارائن نے ہوس زدہ ٹٹولتی نظروں سے اسے دیکھ کر کہا آج چمپا کلی بنا کوئی جواب دیے نظریں جھکائے راج بھون کے اندر داخل ہو گئی اب کاہے کا لڑتی جس اجت اجت کا شور کرتی تھی۔ وہ اب اس کے پاس رہی ہی کہاں تھی۔ ابھی وہ اپنا کام کر کے رسوئی سے بھوجن لے کر آرہی تھی کہ رستے میں اسے راکھی نے بتایا۔

"چمپا کلی! اگلے ہفتے بڑا مزا ہوئے گا' راج بھون میں چھوٹے حکم جی کی منگنی ہوت ہے۔ ناچ گانا ہوئے وا، بھوجن تیار ہوت ہے تو بھی آئیو، سنا ہے ساتھی بہن اگر آنکا اور ساتھ والی ریاست کے ٹھاکر راجا بلب سنگھ کی پوتی کے ساتھ چھوٹے حکم جی کی منگنی بھی ہے۔"

وہ خوشی خوشی یہ خبر باقی نوکرانیوں کو سنانے چل دی یہ دیکھے بنا کہ اس خبر سے بیچاری چمپا کلی پر کیسی قیامت ٹوٹی ہے، وہ بھوجن وہیں واپس رکھ کر محل سے باہر نکل آئی۔

آج وہ صبح صبح ہی راج بھون میں آگئی تھی۔ آج کافی سارا کام تھا۔ بڑی بڑی موٹر کاروں سے مہمان اتر کر مہمان خانے میں جمع ہونے شروع ہو گئے تھے صفائی کرتے ہوئے ایک دو دفعہ چمپا کلی کا گورا صاحب سے آمنا سامنا بھی ہوا لیکن ان کی آنکھوں میں وہی اجنبیت تھی جو محل میں کام کرنے والی کسی بھی چمارن کے لیے ہو سکتی تھی۔ وہ رات کو ہی کول کتھ سے واپس آئے تھے سارے مہمان سورج چڑھنے تک پہنچ چکے تھے۔ گورا صاحب تیار ہو کر باہر آئے ٹھاکر لوگ بڑھے گئے اور پھر ٹھاکر اوھے سنگھ نے ریاست کی دیکھ ریکھ کا سب انتظام ان کے ہاتھوں میں سونپ دیا۔ رانا بلب سنگھ نے اپنے ہونے والے داماد کو ہیرے کی انگوٹھی پہنائی۔ شام ڈھلے جب سب بھوجن پرشاد لے کر واپس جارہے تھے چمپا کلی رسوئی کی طرف چلی آئی۔ مہاراج باورچی گورا صاحب کے لیے چائے بنا رہا تھا چمپا کلی کو معلوم تھا کہ گورا صاحب اس وقت چائے پینے کے عادی ہیں۔

"مہاراج جی نمسکار۔"

"ارے آؤ آؤ چمپا کلی کیا بات ہے آج کل کاہے اداس اور نراش لگت ہو" "مہاراج جی آپ کو چھوٹے حکم جی باہر بلا رہے ہیں۔" اس نے ان کی بات نظر انداز کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔

مہاراج کپ میں چائے انڈیل چکے تھے کپ وہیں چھوڑ کر جلدی سے باہر کی طرف بھاگے ہوئے گئے اور تھوڑی دیر بعد واپس بھی آگئے۔

"عجب ناری ہے، وہاں تو کوئی بھی نہیں بلاوت ہے خیر چائے دے آؤں ورنہ چھوٹے حکم بھی ناراض ہو جاوت۔" چمپا کلی نے رسوئی کی اوٹ سے مہاراج کو چائے کی ٹرے اٹھائے اور گورا صاحب کے کمرے کی طرف جاتے دیکھا۔ اوڑھنی میں چھپائے ہوئے منگل سوتر کو گلے سے نوچ کر موسم کی کیاری کے پاس پھینکا۔ اکلوتی چیز وہ کول کتھ سے اپنے ساتھ لائی تھی اور پھر نیلی سی ساڑھی کے پلو میں بندھی ایک چھوٹی سی شیشی نکالی اور اس میں موجود باقی دوائی منہ میں ڈال لی۔ ایک دو دن سے اسے اپنی بدلی ہوئی طبیعت کا احساس ہو گیا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی اور چمپا کلی کے لیے کوئی اور گورا صاحب پیدا ہو۔

✳

عتیقہ محمد بیگ

علاج

وہ بستر پر دراز سوچوں میں گم تھا۔ سکینہ خفگی سے بولی۔

"ارے حنا کے ابا یوں ہی بستر پکڑے رہو گے۔ تو سر پر دھرا دو جوان بیٹیوں کا بوجھ کیسے کم ہو گا۔" تمین

دن سے وہ اسکول نہیں جا رہا تھا — تو سکینہ نے تیور دکھانے شروع کر دیے۔ احمد تو ریٹائرمنٹ لینا چاہتا تھا — مگر سکینہ رونے کو بیٹھ گئی تو مجبوراً" احمد نے اسکول کا سلسلہ جاری رکھا۔ احمد حساب کا قابل ماسٹر تھا — مگر زندگی کے حساب میں وہ پھنس کر رہ گیا۔

زندگی کے حساب کو وہ جتنا حل کرنے کی کوشش کرتا — وہ ناکام ہو جاتا — خدا تعالیٰ نے اس کو بیٹے سے بھی محروم رکھا — احمد اس بات پر بھی خدا سے شکوہ نہ کرتا — مگر سکینہ صبح و شام تذکرہ کرتی کہ اگر اس کا بیٹا ہوتا — تو حالات یوں نہ ہوتے — اور بیٹیاں بھی بیاہ کر اپنے گھر ہوتیں۔ وہ کراہ کر اٹھا اور بولا۔

"حنا کی اماں! یہ بخار تو مجھے کافی کمزور کر گیا ہے — مجھے تو لگتا ہے — میری جان لے کر چھوڑے گا۔"

اس نے بے بسی سے سکینہ کی بات کا جواب دیا۔

"آپ حکیم غفار کے پاس کیوں نہیں جاتے — یہ ڈاکٹری علاج چھوڑیں — اس نے جیب ہلکی کر دی ہے — مگر [illegible]" اس نے [illegible] سے کہا تھا۔

"اچھا — حکیم غفار کے پاس ہو کر آتا ہوں — شاید افاقہ ہو جائے۔" احمد نے ہاتھ منہ دھویا — اور گھر سے باہر نکل آیا — گلی کی نکڑ پر ہی پہنچا تھا تو اپنا دوست خیام مل گیا۔

"احمد! کیا حال چال ہے — طبیعت کچھ ٹھیک ہوئی؟" خیام نے احمد کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

"نہیں یار — ڈاکٹر نے ملیریا بتایا تھا — طبیعت سنبھل نہیں رہی ہے — بڑی زیادہ [illegible] محسوس کرتا ہوں — یوں لگ رہا ہے اس دنیا میں میرا وقت ختم ہونے والا ہے۔" احمد نے سنجیدگی سے اپنا حال بیان کیا۔

"او احمد! برا مت سوچو — سب ٹھیک ہو جائے گا — باقاعدگی سے دوائی لو۔ ان شاء اللہ بہت جلد صحت یاب ہو جاؤ گے۔" خیام نے اس کا کندھا دبایا — تو وہ مسکرا دیا۔

احمد نے پھر پوچھا۔

"جمیلہ کا رشتہ طے ہو گیا ہے کیا؟" خیام نے اپنی بیٹی جمیلہ کے رشتے سے اس کو آگاہ کیا ہوا تھا۔ اس لیے احمد نے فکر مندی سے پوچھا تھا۔

"ہاں — بات پکی ہو گئی ہے۔ ان شاء اللہ بہت جلد شادی کا کارڈ لے کر گھر آؤں گا۔" خیام نے گرم جوشی سے کہا تھا — اور پھر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد خیام نے اپنے گھر کی راہ پکڑی — اور احمد کے قدم حکیم غفار کی دکان کی جانب بڑھنے لگے۔

احمد کو یوں لگا — جیسے اس کا جسم ضرورت سے زیادہ درد کرنے لگا — وہ اپنی بیٹیوں کے متعلق سوچنے لگا۔ جو دونوں اب شادی کے لائق ہو چکی تھیں مگر ان کو مناسب رشتے نہیں مل رہے تھے — احمد سوچنے لگا کہ اگر وہ اس دنیا سے چلا گیا تو اس کی بچیوں کا کیا ہو گا اسی سوچ میں کھو کر ایک گاڑی سے ٹکرا گیا۔

"ابے اندھا ہے کیا؟ — اتنی بڑی گاڑی نظر نہیں آ رہی۔" — سیاہ گاڑی کے شیشے کو اتار کر اس نوجوان نے گردن باہر نکال کر کہا تھا۔

"بیٹا! اندھا نہیں ہوں — البتہ بوڑھا ضرور ہو گیا ہوں —" احمد نے شائستگی سے اس نوجوان کو جواب دیا — احمد کی شائستگی پر وہ نوجوان باہر نکلا اور اس نے اپنی جیب میں سے دو سو روپے نکال کر احمد کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"نہیں — بیٹا! یہ کیا کر رہے ہو — میں بھکاری نہیں ہوں —" احمد نے اس کے رد عمل پر بوکھلا کر حیرت سے کہا تھا۔

"بابا جی! بیٹا سمجھ کر رکھ لیں —" اس نوجوان نے احمد کو پیار سے کہا تھا۔

"نہیں بیٹا! میرا ضمیر گوارا نہیں کرتا۔" احمد نے دو سو روپے اس کے ہاتھ میں واپس تھما دیے — اور کمر پر ہاتھ رکھ کر آہستگی سے چلنے لگا — وہ لڑکا تیزی سے پھر گاڑی لے اڑا — اور احمد کو افسردہ کر گیا — بیٹیوں کی فکر اس کے ذہن سے اس لمحے اوجھل ہو گئی اور بیٹے کی

وحشت نے اس کو گھیرے میں لے لیا۔

"کاش! میرا بیٹا ہوتا — تو بالکل آج اس نوجوان کی عمر کا ہوتا — میرا سہارا ہوتا — مجھے اپنے بیٹے پر فخر ہوتا — جیسے جمال کو اپنے بیٹے پر فخر ہے — جو پائلٹ بننے کے لیے گیا ہوا ہے — جمال اس کے بچپن کا دوست تھا۔ جو دبئی میں رہائش پذیر تھا — اور کبھی کبھار فون پر احمد کی خیریت دریافت کر لیتا۔ تو سکینہ خواب سجانے لگتی۔

"ارے حنا کے ابا! جمال سے بچیوں کے رشتے کے متعلق بات کریں — شاید وہ اپنے بیٹے کا رشتہ حنا کے لیے مانگ لیں۔" اس نے چالاکی سے شوہر کو پٹی پڑھانی چاہی — جس پر احمد نے انکار کر دیا تو وہ خفا ہو گئی آج اس نوجوان نے اس کو اپنے بیٹے کی کمی محسوس کروا دی تھی۔

"شاید سکینہ ٹھیک ہی رونا روتی ہے — بیٹا ہوتا تو کچھ ذمہ داریوں کا بوجھ کم ہو گا۔"

اسی فکر میں وہ چلا جا رہا تھا جب اسے اپنے اسکول کا ساتھی [illegible] مل گیا — [illegible] احمد کو دیکھ کر مسکرا اٹھا۔

"کہاں جا رہے ہو — کہیں بھابی کے علاوہ کوئی اور تو نہیں انتظار کر رہی ہے۔" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا۔

"ارے شرم کرو — اس عمر میں یہ باتیں —" احمد نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا تھا۔ وہاب ہنس پڑا۔

"یہی عمر تو ہمارے لیے مناسب ہے — شک کی نظر نہیں ہو گی — اور ہم بوڑھے لوگ مستی بھی کر لیں — کوئی یقین نہیں کرے گا۔" اس نے قہقہہ لگا کر کہا تھا — جس پر احمد کی بھی ہنسی نکل گئی۔ پھر ہنستے ہنستے وہ کھانسنے لگا — وہاب اس کو چائے کی دکان پر لے آیا — احمد نے بھی رکنا مناسب سمجھا۔ صبح کی پی چائے کب سے احمد کے وجود کو طاقت دے کر استعمال ہو چکی تھی۔

احمد نے چائے کی چسکی لی تو اس کے ذہن کو سکون ملا۔

وہاب نے ہنس کر کہا۔ "یار! زندگی مستی کا نام ہے — اس دنیا میں آئے ہیں — تو مستیاں نہ کریں — تو کیا فائدہ —؟" اک عجیب سی سوچ لے کر وہ اپنی زندگی گزار رہا تھا — عمر تو اس کی پچاس تھی مگر سوچ اس کی سولہ سالہ لڑکے جیسی تھی۔

"تمہاری اس بجول کا کیا حال چال ہے —" احمد نے چائے کا کپ لے کر پوچھا۔

"بجول — وہ ٹھیک ہے — مگر کبھی کبھار اس کی گاڑی پٹری سے اتر جاتی ہے۔"

"کیوں — کیا کہتی ہے؟" احمد نے ہنس کر پوچھا۔

"فرمائشیں میری جیب سے بڑھ کر کرتی ہے۔" وہاب نے قہقہہ لگا کر کہا تھا۔ احمد نے سنجیدگی سے کہا۔

"یار! اس بجول پر پیسہ خرچ کرنے کے بجائے اپنے بیوی بچوں کا خیال رکھو —" احمد نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

وہاب نے آہ بھر کر کہا — "بیوی بچوں کی خدمت کرتے کرتے تو بوڑھا ہو گیا ہوں — اب تو تمہاری بھابی [illegible] اس عمر میں [illegible] تو بچے کیا سوچیں گے۔" وہاب نے افسردگی سے بتایا۔

احمد خاموش ہو گیا۔ جیسے اس کی دکھتی رگ کسی نے پکڑ لی ہو۔ سکینہ بھی اس کی شوخی پر اکثر طعنے دے جاتی کہ اپنی عمر کا تو لحاظ رکھیں — جب ایسی عمر اس کی تھی — تب گھر کی فکر ذہن میں گھومتی رہتی تھی — اور جب گھر کی فکر تھوڑی کم لگنے لگی — تو بڑھاپے کی مہر لگ گئی۔

"مرد بھی کبھی بوڑھا ہو سکتا ہے —" اس نے یہ سوچا — تو ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

وہاب سے کچھ اس کی سن کر اور کچھ اپنی سنا کر وہ پھر حکیم غفار کی طرف چل پڑا — راستے میں سوچنے لگا۔ وہاب کے پاس پیسہ ہے — جبھی تو بجول جو تقریباً بیس برس کی لڑکی تھی اس کو محبوب تسلیم کر رہی تھی۔ آج اس کے پاس بھی پیسہ ہوتا تو وہ بھی وہاب کی طرح خوش

ہوتا ہے۔ مگر اس کی قسمت میں پیار بھری باتیں نہیں تھیں۔ سکینہ کے پاس جب بھی بیٹھتا گھر کے دو اچھے کام کہہ دیتی کہ اس کا خوشگوار موڈ بجھ سا جاتا اور بڑھاپے میں ایسے ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے جو خوشگوار باتیں کرتا رہے جو احمد کو نصیب نہ تھیں۔

وہ حکیم غفار کے مطب پر آ گیا۔ مریضوں کی لمبی قطار دیکھ کر اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ خاموشی سے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ ایک مریض اٹھ کر حکیم کے کمرے کی طرف بڑھا تو تھوڑی سی جگہ بنچ میں نکل آئی۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ایک مریض بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے قیمتی لباس پہنا ہوا تھا اس کی سنہری گھڑی تقریباً پانچ ہزار سے کم کی نہیں لگ رہی تھی۔ جس پر وہ بار بار نظر ڈالتا۔ اور پھر کوفت ظاہر کرتا۔

حکیم غفار نے ایک ملازم دوائی دینے کے لیے رکھا ہوا تھا۔ اس نے گرم جوشی سے اس آدمی کو دیکھا۔ اور پکارا۔

"آپ اور یہاں؟"

"جی۔ دوائی لینے آیا ہوں۔ مگر اس لمبی قطار کو دیکھ کر عجیب سی پریشانی میں مبتلا ہوں۔ میری کسی کے ساتھ میٹنگ ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں سوچتا ہوں کہ کل حاضر ہو جاؤں گا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

حکیم کے ملازم عثمان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور خفگی سے بولا۔ "میں کس کام کا ہوں آپ ٹھہریے میں ابھی حکیم صاحب کو اطلاع دیتا ہوں۔" وہ اس آدمی کو تسلی دے کر اندر چلا گیا۔

عجیب سی خفگی پھر احمد کے چہرے پر جھلکنے لگی۔ وہ انسان ہشاش بشاش لگ رہا تھا احمد کی طرح بخار میں مبتلا نہیں تھا۔ احمد کو عثمان پر غصہ آیا۔ کہ وہ پاس بیٹھا تھا اور جانتا بھی تھا کہ احمد بخار میں مبتلا ہے تو اس کو احمد کا درد نہیں محسوس ہوا۔ عثمان پھر حکیم غفار کے کمرے سے نکلا تو پیچھے حکیم صاحب بھی تھے۔

"جناب! آپ کو قطار کی کیا ضرورت ہے۔ آئیے اندر آ جائیے۔" حکیم غفار نے خوش دلی سے اس آدمی کو اپنے کمرے میں خوش آمدید کہا۔ احمد کے دل میں جلن کی لہر اٹھی۔ جب وہ آدمی حکیم صاحب کے کمرے سے نکلا تو احمد نے دل ہی دل میں کہا۔

"خود کو کیا سمجھ رہا ہے' ہر جگہ پیسے کا رعب دکھائے گا۔" احمد کو اس آدمی پر شدید غصہ آنے لگا۔ عثمان نے جلدی میں دوائی کا ڈھکن مضبوطی سے بند نہ کیا۔ وہ آدمی تیزی سے نکلنا چاہتا تھا۔ مگر دوائی کی بوتل اس کے کپڑوں پر الٹ گئی۔

"اوہو۔" عثمان کہتے ہوئے رومال سے اس کے کپڑے صاف کرنے لگا۔

وہ آدمی مسکرا کر بولا۔

"رہنے دیں۔ آپ مریضوں کو دیکھیے۔ میں گھر جا کر چینج کر لیتا ہوں۔ شاید آج کی میٹنگ میری کینسل ہونی ہے۔"

اس نے مسکرا کر کہا تھا اور پھر مطب سے نکل گیا۔ احمد کو اس پر شدید غصہ آیا۔ اور اس نے دل ہی دل میں اسے بد دعا دے دی۔ نہ جانے کیوں۔ صرف اس بات پر کہ وہ امیر تھا اور وہ خود کو غریب تصور کر رہا تھا۔

احمد اس کے جانے پر تھوڑا سا پھر مطمئن ہوا تھا مگر اس کے ذہن میں بات گھومنے لگی۔ کاش وہ آج امیر آدمی کی جگہ پر ہوتا۔ تو شاید اس کو بھی آج کی عزت ملتی۔ اس نے لمبی آہ بھری۔ اور آنکھیں موند لیں۔ مریض اپنی اپنی باری پر جا کر دوائی لے رہے تھے۔ وہ خاموشی سے آنکھیں بند کر بیٹھا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا تب ہی اس کے ساتھ ایک مریض آ بیٹھا۔

"کیا ہوا ہے آپ کو؟" اس نوجوان نے احمد کو مخاطب کیا۔

"جی۔" احمد نے آنکھیں کھولیں تو سامنے ایک نوجوان کو پایا تھا۔

"بخار ہے۔" احمد نے شائستگی سے جواب دیا۔

"آپ کیا کرتے ہیں؟" اس نوجوان نے دوسرا سوال کیا۔

"میں استاد ہوں۔" احمد نے کھانستے ہوئے جواب دیا۔

"استاد کا معاشرے میں جو کردار ہے۔ شاید کسی اور پروفیشن کا نہیں ہے۔ مگر اس پیشے سے عزت تو ملتی ہے۔ مگر آسائشوں کے لیے۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ احمد کے جملے کا بغور جائزہ لینے کے بعد اس نے کہا تھا۔ جس پر احمد بھی متفق تھا۔

"آپ کیا کرتے ہو؟" اس بار احمد نے پوچھا۔

"گاڑیوں کا شوروم ہے۔" وہ مسکرایا۔

"کیا۔؟" احمد بے ساختہ بولا۔

"جی۔ کبھی گلشن ٹاؤن کا چکر لگا تو اس کے قریب ہی میرا شوروم ہے' ضرور تشریف لائیے گا۔" اس نوجوان نے ثبوت پیش کیا۔

اس کی کم عمری پر احمد کے دل سے آہ نکلی۔ احمد خود کو اس کے سامنے بہت چھوٹا محسوس کرنے لگا۔

وہ نوجوان ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا جو احمد نے توجہ سے نہ سنیں۔ احمد کا دل خود کو اس بات پر مطمئن کر رہا تھا۔ کہ بے شک اس نوجوان کی آمدنی کئی گنا اس سے زیادہ ہے۔ مگر عزت میں وہ اس سے بڑھ کر ہے۔ جبکہ نوجوان نے کوئی ایسی بات بھی نہیں کی تھی۔ مگر احمد ہاں ہوں کر کے اس کو چھوٹے پن کا احساس دلا رہا تھا۔ وہ نوجوان بڑوں کی عزت کرنا جانتا تھا۔ اس لیے پھر احمد کے افسردہ رویے پر وہ خاموش رہا۔ احمد جو پہلے کندھے جھکا کر بیٹھا تھا۔ اب فخر سے اکڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ اس نوجوان سے حسد کرنے لگا۔ کہ اتنی کم عمری میں وہ کس جگہ پر ہے اور احمد کس مقام پر۔

آہستہ آہستہ مریض کم ہونے لگے۔ وہ نوجوان پھر خاموش رہا۔ عثمان نے پھر ایک مریض جو احمد کے بعد آیا تھا۔ اس کو حکیم صاحب کے کمرے میں بھیج دیا تو احمد اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ خفگی سے عثمان کی طرف بڑھا اور بولا۔

"عثمان! یہ کیا کر رہے ہو؟"

"ہم کیا تمہیں نظر نہیں آ رہے ہیں۔" احمد نے خفگی سے کہا تھا۔

عثمان نے نفی کی۔

"جناب! مجھے آپ کی مصروفیات کا پتہ ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ یہ دونوں لوگ جن کو میں نے پہلی باری دی۔ ان کے کاروباری مسئلے تھے۔" اس نے احمد کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔ مگر عثمان کی یہ بات سن کر وہ آگ بگولہ ہو گیا۔

"کیوں۔ جن لوگوں کے کاروباری مسئلے ہوتے ہیں۔ وہ دوسرے انسانوں سے ہٹ کر ہوتے ہیں۔ میں استاد کا پیشہ رکھتا ہوں۔ تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میری زندگی میں مصروفیات نہیں ہیں۔ میرے خیال میں ان دو آدمیوں سے زیادہ ضرورت مجھے ہے۔ کیونکہ تین روز سے میں اسکول نہیں جا رہا ہوں۔ اور میرے طالب علم تعلیم سے محروم ہیں۔" احمد نے اکڑ کر کہا تھا۔

عثمان مسکرا کر بولا۔

"استاد صاحب! غصہ کیوں کر رہے ہیں۔ آپ کی باری آ گئی ہے۔" اس نے احمد کا کندھا دبایا۔ تو احمد خفگی سے اس کا ہاتھ ہٹا کر بنچ پر آ بیٹھا۔ وہ نوجوان وہاں پر موجود نہیں تھا۔ شاید زیادہ دیر ہونے پر وہ بھی

بجھوا کے چلا گیا تھا۔

اب وہاں ایک عورت موجود تھی۔ جس نے سونے کے جھمکے پہن رکھے تھے اس کے جھمکے دیکھ کر اسے سکینہ کی بات یاد آگئی۔

"مجھے جھمکے کب خرید کر دیں گے۔ جب میری ٹانگیں تو می قبر میں ہوں گی۔" شادی کے ایک سال کے بعد اس نے فرمائش کی تھی۔ اور اس خواہش کو اس نے چالیس برس بیت جانے کے بعد بھی پورا نہیں کیا تھا۔ جس کی وجہ سے سکینہ کا دل احمد کی طرف سے پتھر ہو گیا تھا۔

وہ اس عورت کو گھور رہا تھا، جب وہ عورت خفگی سے بولی۔

"اپنی عمر کا لحاظ نہیں کرتا۔ شاید گھر میں ماں بہن نہیں ہے۔" اس نے منہ میں بڑبڑاتے ہوئے کہا تھا۔

احمد نے نظریں جھکا لیں۔

آخر کار اس کی باری آگئی۔ وہ بوجھل قدموں سے اندر داخل ہوا۔ حکیم صاحب مسکرائے اور بولے۔

"آپ کی استاد صاحب ابھی ابھی شکایت ملی ہے۔" احمد نے حیرانی سے پوچھا۔

"میری شکایت؟ کس نے کی ہے؟" وہ بوکھلا سا گیا۔

"ابھی جو عورت آئی تھی۔ اس نے شکایت کی ہے کہ آپ اس کو عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔" حکیم صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"اوہو۔ وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئی ہیں۔ میں انہیں نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں تو..." احمد نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

اس کو عورت پر شدید غصہ آیا۔ کہ اگر وہ امیر ہوتا اور اس پر نظر ڈالتا تو شاید وہ حکیم صاحب سے اس کی شکایت نہ کرتی۔ دل پر پتھر رکھ کر اس نے زبان پھر نہ کھولی۔ ورنہ وہ اس عورت کو وہ چار باتیں سنا کر آتا۔ حکیم صاحب نے اس کی نبض دیکھی تو نبض کافی تیز تھی۔ اس کو شدید غصہ تھا جس پر وہ قابو پا رہا تھا۔

"اوہ۔ آپ کو بہت تیز بخار ہے۔ اور بلڈ پریشر بھی زیادہ لگ رہا ہے۔" حکیم صاحب نے گھبرا کر کہا تھا جب احمد نے کہا کہ اس کا سر گھوم رہا ہے۔

حکیم صاحب نے عثمان کو پکارا۔ اور جلدی سے پرچی پر کچھ لکھ دیا۔ اور کہا۔ "جلدی سے لے آؤ۔"

احمد نے حیرانی سے کہا۔

"کیا ہوا ہے۔ آپ نے عثمان کو کہاں بھیجا ہے؟"

"وہ۔ احمد! تمہیں انجکشن کی ضرورت ہے۔ میری جڑی بوٹیوں کی دوا کا عمل آہستگی سے ہو گا۔ مگر تمہاری اس وقت جو کیفیت ہے۔ تمہیں جدید ادویات سے سہارا لینا پڑے گا۔ اس لیے انجکشن منگوایا ہے۔"

احمد نے آنکھیں موند لیں۔

حکیم غفار نے سنجیدگی سے کہا۔ "آج کل کا مریض جڑی بوٹیوں سے بمشکل ہی صحت مند ہو پاتا ہے۔ انسان کی سب سے بڑی بیماری فکر کرنا ہے۔ اگلے سال ڈسپنسری کا بورڈ بھی ساتھ لگا دوں گا۔" اس نے آہ بھر کر کہا تھا۔

احمد نے اس کی بات پر سر ہلا دیا۔ واقعی اس کو فوری علاج کی ضرورت تھی۔ اس کو چکر آ رہے تھے۔ کیونکہ گھر سے وہ بیمار حالت میں نکلا تھا اور تفکرات نے اس کو آگھیرا۔ ایسے میں انجکشن ہی سکون دے سکتا تھا۔ اس کے ذہن پر بیٹیوں کی فکر، بیٹے کی حسرت، جوانی کی دبی خواہشات، غربت کا تماشا، حسد کی آگ۔ اور احساس کمتری جیسی بیماریاں چمٹی ہوئی تھیں ان بیماریوں کا مقابلہ کرنے کے قابل تو وہ نہیں تھا۔ البتہ چند گھنٹوں کے لیے اسے ان بیماریوں سے نجات ملنے والی تھی۔ کیونکہ حکیم نے اسے نیند کا انجکشن دے دیا تھا۔

☼

تالیاں بجاتے' اس پہ نئی نئی پھبتی کستے' گالیوں کی پریکٹس کرتے' کنکر اٹھا اٹھا کے مارتے' وہ بڑے خوش رہتے۔

اس وقت بھی یہی ہو رہا تھا۔

بابا کوڑھی آگے آگے اور گلوں بھر کے وہ سب بچے پیچھے پیچھے جن کی ماؤں نے انہیں پیدا تو کر بیٹھی تھیں مگر بھول کے بھی انہیں ڈھنگ کی کوئی بات سکھانے کی غلطی نہیں کی تھی انہوں نے تربیت کے کونے دے کر گھر سے نکالے بچے' جن کے لیے سب سے سستی تفریح یہی بابا کوڑھی تھا۔

گالیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ دونوں جانب سے جاری تھا۔ فرق بس اتنا تھا کہ وہ کل کے بچے ذرا زیادہ فصاحت و بلاغت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ بابا کی زبان کی لکنت اس کے نمبر کم کر رہی تھی۔ بولتے وقت اس کی زبان صرف ہکلا نہیں جاتی تھی بلکہ گول گھوم کے رہ جاتی تھی۔ آسان لفظوں میں غوطہ کھا جاتی تھی۔ اس کی وجہ سے لفظ وہ کچھ ادا کرتا [illegible] پہنچا اس کا فائدہ بھی ہوتا تھا۔ جب [illegible] سن تک تو سولی سی گالی بے دھڑک ہو کے بک سکتا تھا۔ اس کا باپ بھی نہیں پہنچ سکتا تھا اس گالی کے مفہوم تک۔

لیکن اس کا نقصان بھی بڑا تھا۔ کسی کو دعا بھی دیتا تو اسے لگتا منہ بھر بھر کے کوس رہا ہے۔

ویسے یہ بھی ہے کہ اس نے دعا دینا بھی کے تھی۔ سوائے کرموں والی کے' وہ تو اسے بھی دعا دینے کا روادار نہیں تھا۔ وہی اللہ والی تھی جو اس سے زور زبردستی' دھکے سے دعا منگوایا کرتی۔

"مل ... دا... اللہ ... مل دا..."

پیچھے کنکریاں کھاتے کھاتے اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ وہ چار پانچ پھوڑے پھوٹ بہے تھے' وہ مڑ کے ان بچوں کو بد دعائیں دینے لگا۔

"مرجا... اللہ کرے مرجا۔"

مگر وہ بے چارے کیا سمجھتے۔ کہ اس کے منہ سے یہ الفاظ کس کس ڈھنگ سے نکل رہے ہیں۔

"دلو جو... دلو جو..." (بھاگو۔ بھاگو۔) اب وہ زمین سے وہی کنکر اٹھا اٹھا کے انہیں دکھاتے ہوئے دھمکانے لگا' جو وہ اسے مار رہے تھے۔ کچھ ڈر کے پلٹے۔ کچھ دم دبا کے بھاگے۔

کچھ ماں' باپ کی دھلائی سے ایسے شیر دل جوان ہو چکے تھے کہ یہ چھوٹے موٹے کنکر انہیں ڈرانے میں ناکام ثابت ہوتے تھے۔ وہ الٹا اسے للکارنے لگے۔

"او کنجا بے... روڑا کھاتا ہے۔ تیری تو..."

"آرام نال بابے۔ ابھی جا کے تو سے شکایت کروں گا کہ بابا کوڑھی بچوں سے گندی باتیں کرتا ہے۔"

جواب میں بابے نے بھی اس کی ماں سے شکایت کرنے کی دھمکی دی تھی جو ان کے پلے نہ پڑی۔ البتہ قسمت کے مارے دو چار الفاظ اس گفتگو میں ایسے آ گئے جن میں ذرا سی بھی زبان پھسل جائے تو اچھے بھلے بے ضرر لفظ ماں' بہن کی گالی بن جائیں۔ یہی ہوا... بابے کی زبان ذرا سی ہی پھسلی تھی۔ پھسل کے دھڑام سے نیچے جا گری تھی۔ اس لیے بچوں کا گروہ نعرے لگاتا بابے کی اس گستاخی کی شکایت باجماعت طور پہ کرنے کے لیے بھاگا۔

"ملن دودے۔" (مر جو گے۔) بابا انہیں کوستا... رستی ہوئی ٹانگ لنگڑاتا اس گلی میں مڑا' جہاں سے اسے آسرا تھا۔

کاکے کی ماں موتیے توڑ کے آ رہی تھی' سامنے سے بابے کو آتا دیکھ کے اس نے اپنی حلوہ کدو جیسی ناک ایسی چڑھائی جیسے تازے تازے توڑے موتیے ہانڈی میں چڑھا بیٹھی ہو اور ان کی ناگوار سی بو نتھنوں کے اندر گھسی جا رہی ہو۔

بابا اس کے پاس رکا کہ کیا ہاتھوں کاکے کی شکایت بھی کر دے' وہ یہ سن کر پرے ہٹی۔

"پرے مر۔"

جواب میں بابے نے ایک سمجھ میں نہ آنے والے

نقطوں کی بھرمار سی کر دی۔ کاکے کی شکایت لگائی جا رہی تھی اصل میں' جو کہ گاؤں کے سبھی شرارتی بچوں کا سرغنہ تھا۔

"ہے ہائے۔ سویرے سویرے متھے لگ گیا ہے منحوس کہیں کا' دفع دور' ہو رے کون سے اگلے پچھلوں کے رونے میرے آگے رو رہا ہے۔"

وہ ناک پہ دوپٹہ رکھ کے دور دور ہٹ رہی تھی گویا بابا پنڈلی سے ملی کیچڑ دھوتی اٹھا اٹھا کے وہ زخم دکھانے لگا جو کہ اس کے کاکے نے ہرے کر دیے تھے۔

"شرم دا گھاٹا۔ اس کی کسر رہ گئی تھی کہ اب پنڈ کی ماں' بہنوں کو لتاں نکال نکال کے دکھائے گا' اس کوڑھی کا تو اب کچھ سوچنا ہی پڑے گا۔ (بندوبست کرنا پڑے گا۔) آ لینے دو کاکے کے پیو کو۔ بٹھاتی ہوں پنچایت۔"

کاکے کی ماں کو پنچایتیں بٹھانے کا بڑا شوق تھا' بارہ سال ہو گئے تھے اسے بیاہ کے آئے... اس پنڈ میں بارہ کے بارہ [illegible] بار پنچایتیں بٹھا چکی تھی' دو بار تو سسرال والوں کے نام' دو تین بار ہمسائیوں کی شامت آئی' ایک بار اسکول کے ماسٹر صاحب کی بھی آ گئی' جو اس نے کاکے کو تیسری بار فیل ہونے پہ اسکول سے نکال دیا' خیر' کئی کیس تھے' اب بابے کے لیے ارادہ باندھا جا رہا تھا۔

"دفع ہو' جا کے کہیں کرموں والی کے متھے لگ۔ اسی نے شہہ دے کر تجھے چوڑ کیا ہوا ہے۔"

وہ جاتے جاتے یہ مشورہ نہ بھی دیتی تو بابے کوڑھی نے وہیں جانا تھا۔ ملا کی دوڑ مسجد تک اور بابے کی کرموں والی کے گھر تک' وہ سیدھا وہیں جا کے رکا۔

"آ... آ... جا... بھائے لو۔" ناقابل فہم الفاظ کا ایک دھارا اس کے بے ساختہ مارے منہ سے نکل رہا تھا اور گارے سے اٹے ہاتھ مسلسل لکڑی کے کواڑوں پر برس رہے تھے۔

"صبر۔"

اندر سے کرموں والی کی مصروف سی آواز ابھری اور بابے کا ہاتھ اور زبان حیرت انگیز طور پہ فوراً ساکت ہو گئے۔

چند سیکنڈ کے توقف کے بعد دروازہ کھلا۔

چالیس بیالیس سالہ کرموں والی ہاتھ میں تام چینی کی ٹیڑھی میڑھی تھالی اور مٹی کا روغنی پیالہ لیے نمودار ہوئی۔ ایسا پیالہ جس کا روغن جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا اور پیندے میں دراڑ بھی آ چکی تھی' جس سے پیالے میں موجود سالن کی تری قطرہ قطرہ رستی رہتی تھی اور جس جگہ پیالہ رکھ کے بابا کھانا تناول کرتا تھا' اس جگہ دہلیز کے پاس سے مٹی مستقل چکنی سی ہوئی رہتی تھی۔

"لے کھالے۔ آج جوؤں اروی پکائی ہے۔ کوڑے تیل میں۔"

وہ یہ صاف چھپا گئی کہ یہ سننے کے لیے اروی گوشت پکایا تھا۔ اس میں سے تین ٹکڑے اروی نکال کے ان بینگنوں کی بھاجی میں ڈال دیے تھے جو کل کے [illegible] کی ماں نے [illegible] بھیجے تھے اور کرموں والی کا منہ پہلے نوالے پہ ہی کڑوا زہر ہو گیا تھا۔ باقی سالن اس نے بابے کوڑھی کے لیے بچا کے رکھ دیا تھا۔

بابا آگے ہو کے تھالی اور پیالہ لے کر دہلیز پہ بیٹھ گیا تھا۔ کل رات کی بچی ہوئی روٹی' صبح کا بچا آدھا پراٹھا اور تازہ روٹی میں سے بچا آدھا ٹکڑا جوار کا' وہ بے ڈھنگے پن سے بڑے بڑے لقمے منہ میں ٹھونسنے لگا۔ انگلیوں کی مدد سے داڑھوں کے اندر نوالے کو دے رہا تھا۔ آگے کے دانت جھڑ چکے تھے۔ انگلیوں میں جہاں جہاں زخم رس رہے تھے وہاں سالن کی مرچوں سے بھرپور تری لگتی تھی تو زخم دکھ جاتے تھے۔ جلن کی لہر پھیل جاتی تھی۔ مگر وہ اس وقت درد بھلائے بس کھانے میں مگن تھا۔

کرموں والی سکون سے اس کے پاس کھڑی کھاتے دیکھ رہی تھی۔ اسے ذرا سا بھی کراہیت کا احساس نہ ہو رہا تھا۔

برات واپس لے گئی ہے' آج اس کے گھر پائے کے ہیں' بھلا پائے بھی کبھی پھلکے کے ساتھ اچھے لگتے ہیں' وہ تو تندوری روٹیوں کے ساتھ مزا دیتے ہیں' یہ میں لگا رہی ہوں' پہلے اس کے گھر پہنچا آ' اتنی دیر میں تھوڑی مسی روٹیاں بھی لگا دوں گی' خنکی کے باوجود بھی اسے فکر تھی کہ کاکے کی ماں کے گھر کا کھانا بے سواد نہ ہو جائے۔

☼ ☼ ☼

اور یوسف چلا گیا۔

مہینے ڈیڑھ کے لیے جاتا تھا تو بھی کرموں والی کی آنکھیں دھندلا جاتی تھیں۔ یہ تو پھر پردیس کا معاملہ تھا اس نے تکیے بھگو لیے رات بھر میں رو رو کے۔ مگر صبح جب وہ گلی میں نکلا اور اپنے یاروں کے جلوس میں لاری اڈے تک جانے لگا تو اپنی ہمسائیوں اور رشتے کی بہنوں' نندوں کے جھرمٹ میں دہلیز پہ کھڑی کرموں والی کے دیدے بالکل خشک تھے۔ ہونٹوں پہ ایک حماقت بھری مسکراہٹ لیے۔

اسی جگہ اس دہلیز پہ بیٹھے بابا' لودھی کے آگے قیمہ کریلے رکھتے ہوئے اس نے لودھی کے پلو سے آنسوؤں کو خشک کیا اب چھپانے کی ویسے ضرورت تو کوئی نہیں تھی' بابے کو سوائے قیمے کریلے کے اور نظر بھی کیا آ رہا تھا۔

"کھالے۔ میرے یوسفے کو بڑے پسند ہیں' اس لیے میں نے کلو قیمے میں ڈال دیے کریلے کہ رج کے کھا کے جائے' کیا پتا پردیس میں ملے نہ ملے' ملے بھی تو اس میں ماں کے ہاتھ کا سواد ہو نہ ہو' اس کے ابے کو بھی قیمہ کریلے اور سری پائے بڑے پسند تھے۔ جس دن وہ دنیا چھوڑ کے گیا تھا' میرے سے سری پائے کی فرمائش کر کے گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کبھی سری پائے نہیں پکائے۔ مگر یوسفے کے لیے قیمہ کریلے ضرور پکاتی رہی۔ اب بھی پکاؤں گی اور تجھے کھلایا کروں گی' تاکہ تو اس کے لیے دعا کرے۔"

بابے نے دعا کرنے کی کوشش کی۔ مگر منہ لقموں سے بھرا ہوا تھا۔ غوں غاں تک نہ نکل سکی۔

"کھالے' کھالے آرام سے کھالے' دعا کہیں بھاگی نہیں جا رہی۔ جب کھالے تو سکون سے دعا کرنا کہ میرا یوسفا خیریت سے پہنچ جائے۔ کبھی تتی (گرم) ہوا نہ لگے اسے' اور یہ بھی کہنا اللہ سوہنے سے کہ اس کے رزق میں برکت دے اور اس کے دل میں اپنی ماں اور اپنی مٹی دونوں کی محبت بھی باقی رکھے۔"

آخری نوالہ ٹھونسنے کے بعد بابے نے بڑا سا ڈکار لیا اور ہاتھ اٹھا کے دعا مانگنے کی ڈیوٹی بھی ادا کرنے لگا۔ مگر اس کے ادا کیے سیدھے الفاظ سمجھنے کی فرصت کسے تھی۔ کرموں والی ہاتھ کا چھجا بنا کے اوپر اڑتے ہوائی جہاز کو دیکھ رہی تھی۔ شاید اسی میں اس کا یوسف دور' بہت دور جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

کرموں والی اپنے آنگن میں ٹوٹی میز کو اینٹوں کو سہارا دیے اس پہ کھڑی' دیوار سے لگی زلیخا سے بات کر رہی تھی۔

یوسف کو گئے دو مہینے ہو گئے تھے۔ اس کے پیچھے پیسے آئے تھے' میز بھی ترکھان سے بنوا لیا تھا' پنکھا کرنٹ مارتا تھا' اس کو بھی ٹھیک کرا لیا گیا' کاکے کی ماں کے ساتھ قصور شہر جا کے دو جوڑے ریشمی جوڑے اور دو نئی سینڈل بھی خریدی تھیں۔ بستر کی نئی چادریں اور رنگی دھاگے بھی خریدے تھے۔ فارغ بیٹھ کے اور کچھ نہیں تو بندہ کڑھائی سلائی ہی کر لے۔ گڑ والے چاولوں اور مرغی کے سالن کے یہ بڑے بڑے پتیلے پکا کے محلے اور برادری کی دعوت بھی کر دی تھی بیٹے کے دبئی جانے کی خوشی میں۔ اس کے باوجود اتنے سارے پیسے بچ گئے تھے اور وقت بھی اتنا ہی بچا رہتا تھا اس کے پاس۔

"کتنا بڑا ہوتا ہے جہاز' ادھر نیچے سے دیکھو تو ذرا سا لگتا ہے' پر میں کیا جانوں کتنا بڑا ہوتا ہے۔"

اب اس کا دل باتوں میں بہت لگتا تھا۔ پہلے تو سنبھال سنبھال کے رکھی ہوئی تھیں باتیں کہ کب

یوسف آئے' کب اس سے کریں' اب ادھر ادھر فارغ بندے ڈھونڈتی رہتی تھی کہ اب کون اکیلا نظر آئے اور اسے پکڑ کے باتیں شروع۔

"بس یہ سمجھ' تیرا' میرا' اور کاکے کی ماں کا گھر ملا کے دیکھو تو جہاز بنتا ہے اور اندر کرسیاں ہی کرسیاں' بستر ہی بستر۔"

"بستر؟ نہیں نہیں کملی۔ کرسیاں ہی ہوتی ہیں' میں نے خود ڈراموں' فلموں میں دیکھا ہے۔"

کاکے کی ماں جو جب حلوت کٹوری اٹھا کے اس سے مکھن مانگنے آئی تھی۔ دخل دیے اور اپنی فلم بینی کا رعب ڈالنے لگی۔

"نی چل نی۔ فلموں' ڈراموں میں کچھ اصلی نہیں ہوتا۔ نہ گولیاں' نہ بارش' نہ آنسو' نہ مرنا' نہ جینا' تو جہاز کدھر سے اصلی ہوں گے۔"

"صحیح کہہ رہی ہے کرموں والی' ڈرامے جھوٹ ہوتے ہیں۔" زلیخا نے تائید کی تھی۔

پچھلے دنوں اپنے کسی پسندیدہ ڈرامے کے چہیتے کردار کے مرنے پہ وہ کھل کھل کے رو لی تھی۔ تب بھی لوگوں نے کہا تھا جھوٹا تھا' مرا نہیں تھا۔ مانا تب جب پرسوں اسی ایکٹر کو کسی نئے ڈرامے میں مونچھیں رکھے تھرتھلی مچاتے دیکھا تھا۔

"اور کیا۔ سب نقلی ہوتا ہے' زنانیوں کے جوڑے نقلی' دوپٹے بھی رنگ برنگے نقلی والے تو ہوائی جہاز بھی نقلی دکھاتے ہیں' میرا یوسف اصلی والے جہاز میں گیا تھا' جہاں بستر لگے تھے' کمبل منہ پہ لو اور سو جاؤ۔"

"سنا ہے ہوٹل بھی جہاز کے اندر ہوتا ہے' مفت کا کھانا پینا؟"

"ہور کی؟" کرموں والی خوامخواہ اترا رہی تھی۔ بیٹا باہر گیا تھا۔ نخرے اس میں آ گئے تھے۔ کاکے کی ماں کو ذرا بھی نہ بھا رہی تھی اس کی اتراہٹ' ناک چڑھاتی' کو کاما تھے سے لگاتی وہ مکھن لیے بنا ہی خالی کٹورا واپس لے گئی۔

"پر ایک بات تو میں یوسفے سے پوچھنا ہی بھول گئی' بھلا کل فون آئے گا تو پوچھوں گی۔"

"وہ کون سی بات؟"

"کہ جہاز میں غسل خانے ہوتے ہیں کہ نہیں۔"

"ہوتے ہوں گے' اتنے لمبے سفر میں غسل خانے کے بغیر کیسے گزارا ہوتا ہے' لاری تو بندہ جہاں چاہے رکوا کے فارغ ہو لیتا ہے۔ لیکن دیکھ نا' ریل گاڑی میں بھی اندر ہی لیٹرین بنی ہوتی ہے' اسے تو جگہ جگہ نہیں روکا جا سکتا' اسی طرح جہاز کو بھی تو کھڑے آسمان پہ نہیں روکا جا سکتا' یہ اڑتا ہے تو اڑتا رہتا ہے' آسمان پہ رکنے سے گر جاتا ہے۔"

"خیری صلا۔ چنگی گل منہ سے نکال زلیخا۔" بیٹا جہاز کی سیر کرنے کے قابل کیا ہوا تھا کرموں والی کو اب جہاز بھی پیارے ہو گئے تھے ان کے خلاف بھی کچھ سننے کو تیار نہ تھی۔

"بات تو ٹھیک کر رہی ہے' مگر دیکھ نا وہ تو اوپر ہواؤں میں اڑتا ہے تو ہوائی جہاز کے غسل خانوں کا پانی اور گند کہاں جاتا ہو گا۔"

[illegible]

"یہ جہاز بھی تو کسی چوڑے انگریز نے ہی بنایا ہو گا۔ اور انگریز' مرن جوگے ہوتے ہی گندے ہیں' غلیظ' پلید۔"

"پر سوچنے والی بات یہ ہے کہ جہاز بنایا انگریزوں نے ہے' پر اس پہ جاتے تو ہمارے لوگ بھی ہیں اور وہ صرف انگریزوں کے ملک پہ سے نہیں گزرتا' ہمارے اوپر سے بھی گزرتا ہے' ہائے ہائے' استغفراللہ۔ سارا گند نیچے گرتا ہو گا۔"

"اوں ہوں۔" کرموں والی نے کراہیت کے مارے ایک جھرجھری لی۔

اسی وقت دور سے ہی کسی جہاز کے بادلوں کا سینہ چیر کے گزرنے کی آواز ابھری۔ زلیخا اوڑھنی سے سر ڈھانپ کے اندر کو بھاگی اور کرموں والی نے میز پہ رکھی ٹوکری سر پہ اوندھی کی اور بگٹٹ ہو گئی۔

"ہائے میرے ربا۔"

☆ ☆ ☆

مہینے پہ مہینے گزرتے گئے، یوسف کے فون بھی آتے رہے اور کبھی کبھی رقمیں بھی۔

کرموں والی کو تو نہ بدلنا تھا نہ وہ بدلی، البتہ گھر کی حالت بدلتی گئی۔

ایک پکے کمرے اور ایک کچی کوٹھڑی پہ مشتمل گھر میں اب دو پکے کھلے ہوادار کمرے اور پکی چھت والا برآمدہ تھا۔ جس کے آگے جالی کی دیوار اور جالی کا ہی دروازہ لگا تھا۔ برآمدے میں رکھا چولہا اب گیس والا تھا۔ اور وہ چھتی پہ شیشے کے گلاس اور جگ رکھے تھے۔ چینی کے کپ، پرچ سمیت اور بام چینی کی نئی کٹوری، چکنے پیندے والی کیتلی بھی اور گرم رکھنے والی تھرماس بھی۔

گھر کے دونوں کمروں میں چھت والے پنکھے تھے اور برآمدے میں ایک پیڈسٹل فین، پیلے بلب کے بجائے سفید ٹیوب لائٹیں تھیں۔ چودہ انچ کا رنگین ٹی وی بھی تھا۔ فون بھی لگ چکا تھا اور یوسف سے ہر دوسرے تیسرے دن بات ہو جاتی تھی۔

اس وقت بھی وہ اس کے فون کے انتظار میں اسی کے لیے سجائے نئے والے کمرے میں تھی۔ خود وہ پرانے والے مرمت شدہ کمرے میں ہی رہتی تھی۔ یہ الگ بات کہ اب اس کی بھی حالت بدلی ہوئی تھی۔ پہلے سب الا بلا اس کمرے میں ٹھنسا ہوا تھا، اب صرف ایک بان کی چارپائی تھی، جس پہ ہرے چکور رنگ کا موٹا کھیس بچھا تھا۔ اس پہ ہرے رنگ کے بارڈر والی دوسوتی کی سفید چادر، موٹا سا سرہانہ۔ کرموں والی کو نرم گدے والا بستر اچھا نہیں لگتا تھا۔ کھرے بان پہ ہی چین کی نیند آتی تھی۔ اس لیے اس کمرے میں جست کی اونچی سی پیٹی تھی جسے اینٹوں پہ رکھ کے مزید اونچا کیا تھا اور جو پوری نئے نکور لحافوں، گدوں، سرہانوں اور کھیسوں سے بھری تھی۔ کرموں والی نے سوچ رکھا تھا۔ جب یوسف کی شادی کے دن رکھے گی تو نزدیک کے سب ہی رشتے داروں کو پندرہ دن پہلے کا نیوتا دے گی۔ ان کی مہمان داری کے خیال سے ہی بستر سنبھال رکھے تھے۔ اسی پیٹی پہ اس کا بکسہ رکھا تھا، جس میں باہر آنے جانے والے جوڑے، گرم چادر وغیرہ رکھی تھی۔ اسی پہ ٹی وی رکھا تھا جسے سفید کروشیے کے غلاف سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک جانب پتائی سلائی مشین بھی سفید کروشیے کی جھالر سے سجے پھول دار کپڑے سے ڈھکی تھی۔ اوپر والی شیلفوں میں تانبے کے بڑے بڑے قلعی شدہ دیگچے، پتیلیاں اور پراتیں جو اس کے جہیز کے برتن تھے سب قطار در قطار برسوں سے سجے تھے۔ البتہ نیا والا کمرہ جو اس نے یوسف کے لیے تیار کروایا تھا اس کو سب نئی چیزوں سے آراستہ کیا تھا۔

نواڑی ڈانگر پلنگ، اس پہ شنیل کے پھولوں والا نسواری رنگ کا غلاف، نرم روئی والے سرہانے جن کے کونوں سے ریشمی دھاگوں کے پھندنے لٹک رہے تھے۔ دو کرسیاں، ان کے درمیان رکھا میز، میز پہ سجا گلدان، گلدان میں رکھے رنگ برنگے چمکیلے کاغذ کے پھول، دیوار پہ لگی تک تک کرتی بڑے ہندسوں والی گھڑی [illegible] ہاتھوں سجی تھی۔ اسی کمرے میں فون بھی رکھا تھا۔ یہیں بیٹھ کے بیٹے سے بات کرتی تھی تو لگتا تھا کہ وہ یہیں کہیں پاس ہے۔

سناٹے میں گھنٹی کی آواز گونجی تو یوسف کے خیال میں گم کرموں والی بری طرح تھرا اٹھی، پھر فوراً ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو۔" اور پھر ریسیور کو گھور کے رہ گئی۔ گھنٹی دوبارہ بجی۔

"اس میں سے تو ٹوں ٹوں بج رہی ہے۔ دفع۔ یہ تو دروازے کی گھنٹی بج رہی ہے۔ ایک تو یہ اچھا سیاپا یوسفے نے میرے گلے ڈال دیا ہے۔ گلی کے لفنگے بچے سارا دن گھنٹی پہ گھنٹی دیتے رہتے ہیں، بجاتے رہیں میں بھی نہیں جانے والی۔"

ذرا وقفے سے پھر گھنٹی بجی تو اس نے چپل اتاری اور لگی چلانے۔

"دفع ہو نئے۔۔۔ جاتے ہو کہ نکلوں اک اک پھجے۔" گھنٹی پھر سے بجی تو ذرا غور کیا۔

"ہائے۔۔۔ یہ تو فون کی گھنٹی بجی ہے اب۔" اس نے بے تابی سے ریسیور اٹھا کے کان سے لگایا۔ پہلے تسلی کی کہ دوسری جانب سے ٹوں ٹوں تو نہیں ہو رہی پھر کہا۔

"یوسفے۔۔۔ تو ہے پتر؟"

"ہاں بے بے۔۔۔ اور کون ہو سکتا ہے اپنی بے بے کو تنگ کرنے والا۔" یوسف کی آواز سے بشاشت چھلک رہی تھی۔ وہ سرشار ہو گئی۔ اسے بھیج کے دل تو بہت دکھا تھا مگر جب اسے خوش پاتی تھی تو اطمینان ہوتا تھا کہ اس نے بیٹے کی ماں کے اسے سکھ تو دیا ہے۔

"میں صدقے، میں قربان، شالا واری جاؤں تنگ کرنے والے کے۔" وہ نہال ہو رہی تھی۔

"اور کیا حال ہیں بے بے، گوڈوں کا درد کیسا ہے؟"

"میری نہ پوچھ، اپنی سنا۔ صحت تو ٹھیک ہے؟ نیند پوری آتی ہے؟"

"ہاں بے بے! محنت کرنے اور حلال کمانے کے بعد نیند تو آ ہی جاتی ہے۔"

"ماشاء اللہ۔۔۔ ماشاء اللہ۔"

"پیسے مل گئے تھے بے بے؟"

"ہاں پتر! مل گئے تھے۔ اس بار تو نے پہلے سے بھی زیادہ بھیج دیے ہیں، میں نے کیا کرنے ہیں اتنے پیسے، میں اکیلی جان، چٹنی بھی بنالوں تو ایک ڈنگ نکل جاتا ہے۔"

"کمال ہے بے بے! میں تیرے لیے کما رہا ہوں اور تو چٹنیاں کھانے کی بات کرتی ہے، انڈے کھایا کر، سیب کھایا کر، دودھ پیا کر۔"

"انڈے، سیب، دودھ، میں کوئی بیمار ہوں؟"

"تو اچھی خوراک صرف بیمار کھاتے ہیں؟" وہ ہنسنے لگا۔

"میری خوراک تو تیری محبت ہے۔" جھلیا۔

"اچھا شہر ہو آنا، اچھے کپڑے لتے لے لینا۔"

"وہ پہننے کا شوق تو تیرے باپ کے ساتھ ہی مر گیا تھا۔ ساری جوانی پھیکے رنگوں میں گزار دی۔ اب سنور کے کیا کرنا ہے بڈھی نے۔" وہ اداس ہوئی تو یوسف جھلا گیا۔

"کمال ہے بے بے! تجھے تو پیسہ خرچ کرنا بھی نہیں آتا۔"

"کروں گی، رج کے کروں گی، تیرے ویاہ پہ خرچ کروں گی، اتنا سونا ڈالوں گی بری میں کہ وہ بھی بیلی کرے گی، پچاس جوڑے لے کر جاؤں گی، جہیز اس سے لینے کی بجائے خود ڈالوں گی، شریکوں کے دیدے پھٹ جائیں گے، خالص گھیو میں دیگیں پکواؤں گی، چھوٹے گوشت کی اور متنجن بھی بداموں والا۔"

"بے بے تم بھی نا۔" ہنسی یوسف کے لبوں سے بار بار پھسلتی تھی۔ "اچھا بے بے پھر کروں گا فون، ٹائم پہ جا رہا ہوں۔"

وہ بجھ سی گئی۔ "ابھی سے۔ ابھی تو میں نے بہت ساری باتیں۔۔۔ اچھا خیر اللہ رکھا، رب کے سپرد۔" ست ہاتھوں سے ریسیور رکھتے ہوئے وہ اداس ہو گئی۔

"بہت وقت جلدی میں رہتا ہے۔" گھڑی کی سیکنڈ والی سوئی [illegible] نکلتی جا رہی تھی۔ گھٹنوں پہ ہاتھ کا بازو ڈال کے وہ اٹھ رہی تھی کہ گھنٹی کے دوبارہ بجتے ہی کرسی پہ گر سی گئی اور ریسیور جھپٹ کے کان سے لگایا۔

"ہیلو یوسف۔"

"ٹوں۔۔۔ ٹوں۔۔۔ ٹوں۔" ماتھے پہ لاتعداد بل لیے کرموں والی نے ریسیور پٹخا اور دہائیاں چلانے لگی۔

"مرجاؤ اللہ کرے گھنٹیاں بجانے والو، جا کے اپنے جمن والوں کے سر پہ رولا ڈالو، سیاپیو۔"

☆ ☆ ☆

"یوسف علی بتا رہا تھا۔" بیٹے کی۔۔۔ اور بیٹے کے حالیہ وطن دبئی کی باتیں سناتے ہوئے کرموں والی کے چہرے پہ وہی جوش و خروش، وہی تمتماہٹ، وہی بچپن تھا مگر سننے والیوں کا ولولہ اب دم توڑ چکا تھا۔ کوئی کب تک سنے اور کتنا سنے، وہ اکتانے لگی تھیں۔

"ہائے ہائے یہ ہی تو مسئلہ ہے بے چاری کا۔" یکایک زلیخا کے دل میں پھر سے اس کے لیے ہمدردی جاگی۔

"وہ اکیلی ہے نا ' نہ کوئی آلے نہ دوالے ' ڈھونڈتی پھرتی ہے بے چاری کسی ایسے کو جو اس کی رونگیاں سن سکے۔"

"تو بلالے اپنے یوسف علی کو۔" کاکے کی ماں کو اس کی حمایت ایک آنکھ نہ بھائی۔

"ہم ہی رہ گئے ہیں۔ ویسے تو سیدھے منہ بات نہیں کرتی ' اپنے آپ کو پتا نہیں کیا سمجھنے لگی ہے ' دیکھ لے تمہارے گھر کنگالوں کی بچی ہیں تو تڑکا لگا کے سب سے پہلے اسے دیئے جاتے ہیں کہ اکیلی بڑھی عورت ہے اور یہ ' سوہن حلوہ بنایا تھا گریاں ڈال کے ' میرے بچے خوشبو سونگھ کے بلکتے رہے ' اس سے اتنا نہ ہوا کہ ذرا سا بھیج ہی دیتی حق ہمسایوں کا۔"

اپنے درد مشترک پہ دونوں نے دوبارہ سر جوڑ دیا اور متفقہ نتیجہ یہ نکالا کہ کرموں والی بدل گئی ہے ' پہلے جیسی محبت کرنے والی ملنسار مزاج نہیں رہی ' سادہ اور آسان لفظوں میں اس میں اکڑ اور گردن میں سریا آگیا ہے۔

☆ ☆ ☆

دونوں صلاح مشورہ کرکے اور گلی کی ایک بزرگ خالہ کو لے کر کرموں والی کے پاس آگئی تھیں ' طریقے ' سلیقے سے بات شروع کی ' مگر کاکے کی ماں کی زبان بھلا قابو میں رہتی تھی ' غلطی سے منہ سے نکل ہی گیا۔

"دیکھو کیا! ہمیں پتا ہے تم بے چاری اکیلی عورت۔۔۔"

بس۔ ابھی اس نے فقط اتنا ہی کہا تھا کہ وہ آپے سے باہر ہو گئی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ کون بے چاری ' کون اکیلی ' ذرا مجھے منہ بھر کے بے چاری کہنے والی اپنی حالت تو دیکھو ' میں تمہیں بے چاری نظر آتی ہوں؟ میں؟ کرموں والی؟"

"دیکھا خالہ! ایسے ہی بات بات پہ چڑھ جاتی ہے

یہ۔" زلیخا نے بوڑھی سیانی بیانی کو مخاطب کیا۔

"اور تم کتنی ہو اس کا تصور نہیں ہے۔"

"تو دیکھ کرموں والی! ان کو غلط نہ سمجھ ' یہ تو تیرے لیے فکر مند تھیں ' اسی لیے مجھے لائی تھیں۔" سیانی بیانی میدان میں اتری۔

"واہ جی واہ۔ فکریں کرنے کے لیے ان کے پاس اور سیاپے کم ہیں؟ یہ کاکے کی ماں ' خالی ہاتھ کڑی کی منگنی تو کر دی نہ داج جوڑا ' نہ کڑی کو کوئی کم سکھلایا ' یہ پہلے اس بات کی فکر کرے ' اس کا کاکا بارہ سال کا ہو گیا ہے ' الف کا بے نہیں آتا اسے ' پہلے اس کی فکر کرے اور زلیخا ' اس کی نوں چھ سالوں سے لڑکیاں جنتی آ رہی ہے ' اس کی فکر کرے۔ اس کا بندہ شوگر لے کے بیٹھا ہے ' اس کی فکر کرے۔ میری فکر کیوں کر رہی ہے؟"

"توبہ توبہ۔" کاکے کی ماں نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"نی کرماں والیے ' یہ دونوں کہہ رہی تھیں کہ تمہارا بیٹا ادھر نہیں ہے ' تم اکیلی۔۔۔"

اس نے ایک بار پھر سیانی بیانی کی بات بیچ میں سے اچک لی۔

"ہاں۔ بس یہ ساڑا ہے ان دونوں کو ' بلکہ سارے کے سارے پنڈ کو ' باقیوں کے منڈے ' جو گلیوں میں ویلے پھر رہے ہیں ' دھیلہ کمانے جوگے نہیں ' اسی لیے میرے یوسف علی سے جلتے ہیں۔"

"رب کی سوہں میں بڑا بچہ ہے۔ کیوں جلنے لگے پنڈ والے اس سے۔ اصل میں اکیلے رہ رہ کے تمہاری مت ماری گئی ہے۔" اس بار سیانی بیانی بھی تلخ ہو گئی۔

"مت ماری گئی ہوگی تمہارے آگے والے پیچھے ان دونوں نانیوں کی۔ ان کے اگلے پچھلوں کی ' اور میں کرموں والی ' میرے ماں پیو نے میرا نام کچھ سوچ کے رکھا تھا۔ میں تو جب بھری جوانی میں بیوہ ہوئی تب بھی میں نے کسی کو موقع نہیں دیا تھا کہ وہ مجھے بے چاری یا بدنصیب کہے۔"

"کیا۔ گل تے سن ' ہم نے تو بس یہ صلاح دینی تھی کہ اگر تم یوسف کی شادی کردو ' بہو لے آؤ تو

تمہاری چہ چہ بھی ختم ہو جائے گی ' گھر میں رونق بھی لگ جائے گی؟"

اس بار وہ آگے سے کچھ کڑوا نہ بول سکی ' بلکہ سوچ میں پڑ گئی۔

بات زلیخا کے دل کو بھی لگی ' وہ بھی صلاح دینے لگی۔

"ایک تو بیٹا ہے تمہارا ' اس کی خوشیاں بھی وقت پہ دیکھ لو ' ویسے بھی تم نے زندگی میں دیکھا ہی کیا ہے۔"

اس کا یہ کہنا غضب ہو گیا ' کرموں والی پھر سے بپھر گئی۔

"پھر وہی بات ' بڑی خوشیاں دیکھی ہیں میں نے ' اللہ کے فضل سے ' بھرے گھر سے آئی ' بھرے گھر میں آئی ' باپ نے ہتھیلی پہ رکھا ' شوہر نے بھی قدر کی ' اب بیٹا نوٹوں میں تول رہا ہے۔"

"چلو اٹھو۔ یہ نہیں سمجھنے والی۔" سیانی بیانی اکتا کے اٹھ گئی ' اسے عادت تھی ہر کسی کا جھکتا ہوا سر دیکھنے کی ' ہاں جی ہاں جی سننے کی ' اور یہ تھی کہ پیچھے ہاتھ ہی نہ رکھنے دے رہی تھی۔

ان کے جانے کے بعد کرموں والی نے سنجیدگی سے اس بات پہ سوچا ' بات وہ پتے کی کر گئی تھیں ' ان کے سامنے وہ مانے نہ مانے ' مگر ساری رات اس پہ سوچتی رہی تھی ' برابر والے کمرے سے اسے مسلسل کبھی جھانجھر چھنکنے کی ' تو کبھی چوڑیاں کھنکنے کی آواز آتی رہی ' کبھی دبی دبی نسوانی ہنسی کا ترنم ' وہ رات بھر آنکھیں کھولے مسکراتی رہی۔

اور اگلے دن یوسف کا فون آتے ہی اس سے اپنی خواہش کا اظہار بھی کر دیا اور ارادے بھی بتادیے۔

"نہیں کل سے ' بلکہ آج سے ہی تیرے لیے لڑکیاں دیکھنے لگی ہوں ' نائن اور دوجن کو بھی بلا بھیجتی ہوں ' پہلے تو برادری کی لڑکیاں دیکھوں گی ' کب سے تو نہیں ملی ' اللہ جانے کون کون اب بیاہ کے لائق ہے۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے بے بے۔"

"کیوں؟ اچھا اچھا۔ برادری میں شادی نہیں کرنی؟ چل نا سہی ' مجھے کون سے لاڈ اٹھ رہے ہیں

برادری کے ' یہ ہی برادری ہے جو کبھی مصیبت میں کام نہیں آئی ' میرے سوہنے یوسف علی کے لیے برادری کی چھینی چکوڑیاں ہی رہ گئی ہیں۔ سبھی ڈنگر۔"

"بے بے ' میری بات تو سن لو۔"

"اچھا اچھا۔ لگتا ہے کوئی پسند ہے تجھے۔" پہلے مسکرائی پھر کسی خیال کے تحت گھبرا گئی۔

"ہائے میں مر گئی ' پردیس میں تو کوئی نہیں پسند کر لی؟"

"وہ بہت اچھی ہے بے بے۔"

"تجھے تے سوہنا اچھی ہے۔" وہ بلبلا اٹھی۔

"باہر کی کڑیوں کا کیا بھروسہ ' اور وہ بے حیا جو خود پرایا مرد پھنسا کے بیٹھی ہے اسے اچھا سمجھ لوں؟"

"اس نے نہیں ' اس کے باپ نے پسند کیا ہے مجھے۔"

"باپ نے؟"

"وہاں کا بہت بڑا آدمی ہے ' اپنے بڑے بڑے اسٹور ہیں اس کے ' بڑا سارا ہوٹل بھی ہے ' میرے مالک کا جاننے والا ہے ' اپنے کام کے لیے کمپنی آتا جاتا تھا ' وہیں اس نے مجھے دیکھا ' اس نے اپنی بیٹی کے لیے پسند کر لیا۔"

"مگر یوسف علی۔ تو میرا اکو اک بیٹا ' میرے بڑے ارمان تھے کہ میں اپنی نوں خود پسند کروں گی۔"

"تم میری خوشی میں خوش نہیں ہو بے بے؟"

کرموں والی نے ایک پل کو سوچا۔

اکلوتا بیٹا ' وہ بھی چھبیس سال کا۔

اور سات سمندر پار ' کماؤ ' خود مختار۔

اگر اس کی خوشی میں وہ خوش نہ ہوتی تو کیا وہ اپنی خوشی ادھوری چھوڑ دیتا نہ۔ کبھی نہیں۔ ہاں۔ شاید اسے ادھورا چھوڑ دیتا۔ ممتا کا زعم ہار گیا ' حقیقت پسندی جیت گئی اور اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"بڑی۔ بڑی خوش ہوں ' چل ٹھیک ہے ' پہلے اس کی تصویر بھیج ' میں پسند تو کر لوں ' تاکہ میں سارے پنڈ کو کہہ سکوں کہ اپنے بیٹے کی ووہٹی میں نے پسند کی ہے اور ہاں ' ویاہ پہ میں نے تیرا بڑا خرچہ کرانا ہے ' مجھے

"وہیں تو مل کر امیری اپنی زبان ہے۔" وہ فون پہ ہنس رہی تھی۔

"سو رہی ہے ابھی 'ام' تھکی ہے تو کراتا ہوں۔"

"نہیں' مجھے پتا ہے تو کیوں نہیں کرا رہا۔"

"کیوں نہیں کرا رہا؟"

"پنڈ میں سارے کہہ رہے ہیں کہ تو نے کسی میم سے ویاہ کرلیا ہے' گٹ پٹ انگریزی بولنے والی عیسائن ہے۔"

یہ سن کے یوسف دل کھول کے ہنسنے لگا۔

"تھا زیادہ وہ منہ نکل 'اس کی بات کرا میرے سے' مجھے نہ انگریزی آتی ہے نہ عربی' مگر سن کے سمجھ تو سکتی ہوں کہ انگریزی کون سی ہے اور عربی کون سی' اس سے کہہ میرے سے بات کرے عربی میں' تب جا کے مجھے یقین آئے گا کہ وہ انگریزن نہیں ہے۔"

"صرف عربی کیوں بے بے! اسے اردو اور پنجابی بھی آتی ہے۔"

"ہیں ... پنجابی بھی؟" وہ حیران بھی ہوئی اور خوش بھی۔

"ہاں بے بے ... وہ وہیں پیدا ہوئی' وہیں پلی بڑھی' مگر اس کے ماں باپ دونوں کا تعلق یہاں سے ہے' وہاں کے جمے پلے ہیں' ان سے پنجابی میں بات کرتا ہوں تجھ سے بھی کرے گی۔"

یہ سن کے وہ اور نہال ہو گئی۔

"چنگا ... پھر تو اپنے بچوں سے بھی پنجابی میں بات کرے گی' میں ایویں ہی سوچ سوچ کے پریشان ہو رہی تھی کہ میرے پوتے بھی مجھ سے ملنے آئیں گے تو یا انگریزی بولیں گے یا اپنے ناکوں کی زبان عربی اور میں پھر ان کا منہ ہی تکتی رہ جاؤں گی۔"

"فکر نہ کر بے بے! اپنے پوتے کا منہ سب سے پہلے تم نے ہی دیکھنا ہے۔"

"مطلب ..." وہ ٹھٹکی۔

"خوش خبری ہے بے بے!" وہ ذرا شرما کے بولا۔

"میں صدقے" اس کا بس نہ چل رہا تھا ناچنے لگ جائے۔

"اور میں نے شادی تیرے بغیر کر کے دل دکھایا تھا تیرا' ایمان سے تب سے لے کر اب تک سکون کی نیند نہیں سویا' سوچ رہا ہوں اب تیرا پوتا تیری نظروں کے سامنے دنیا میں آنا چاہیے' تاکہ کفارہ ہو سکے۔"

"اس سے چنگی بات کوئی ہے ہی نہیں یوسف۔"

اور وہ ابھی سے تیاریوں میں لگ گئی' ننھے منے موزے' سویٹر' گودڑیاں' بچھونیاں' دلائی' گدے' رضائی' راتیں اب اون سلائیوں کے ساتھ گزرنے لگیں۔

یوسف اور کلثوم کے آنے کے دن قریب آ رہے تھے اور ان کا کمرہ ٹھیک ٹھاک کروایا جا رہا تھا۔

"شاباش ... ایک پوچا اور لگا' وہ سفید دیواریں کروے؟" وہ قلعی والے کے سر پہ کھڑی ہدایتیں دے رہی تھی۔ "اور اوپر ایک ایک پٹی گلابی قلعی کی کروے۔"

"بڑی خوش ہو آپا؟" کاکے کی ماں نے جھانکا' بڑا شوق تھا اسے کرموں والی کے ہاتھوں ذلیل ہونے کا۔

"کیوں نہ ہوں گی' میرا پتر آ رہا ہے' نوں آ رہی ہے۔ اس نے میرے پیچھے [illegible] گھر کی چوکھٹ اور مرمت ہو جائے' آخر اتنے بڑے گھر کی بیٹی ہے' وہ بھی اس کی شان کے مطابق ہونا چاہیے۔"

"تب بچہ تو اس کی شان کے مطابق نہیں ہو سکتا آپا؟"

"کیا مطلب؟"

"جس بڑے ملک سے وہ آ رہی ہے' اس کے مطابق ہمارے پنڈ میں کہاں ہیں کوئی اچھے اسپتال اور ڈاکٹر' اور وہ بچہ پیدا کرنے ادھر آ رہی ہے۔"

"یہ تو ان دونوں کی محبت ہے میرے ساتھ۔"

"مگر سمجھ میں نہیں آتا لوگ باہر کے ملک بھاگتے ہیں کہ وہاں کے ڈاکٹر لائق فائق ہیں اور علاج اچھا ہے' وہ وہاں اس چھوٹے سے پنڈ میں آ رہے ہیں۔"

"بچہ تو ظاہر ہے لاہور شہر کے کسی اچھے اور بڑے سے اسپتال میں ہی ہو گا' تو زیادہ گھنٹے نہ نکال' لاہور کون سا دور ہے' دو گھنٹے پار تو ہے اور یوسف نے آتے ہی گڈی بھی خرید لینی ہے۔"

"بی بی جا کے دیکھو تو' غسل خانہ بالکل نیا نکور کر دیا ہے۔" منور نے آ کے اطلاع دی۔

"غسل خانے میں ٹائلیں لگوائی ہیں' شیشہ بھی لگا بڑا سارا اور نیا بیسن بھی۔" اس نے فخر سے کاکے کی ماں کو جتایا۔

"لگتا ہے کافی دن رہنا ہے انہوں نے۔"

"آہو ... ہور کی۔"

"یوسف کی شادی کو پانچ مہینے ہوئے ہیں نا۔"

"ساڑھے پانچ مہینے۔"

"اچھا یعنی تین چار مہینے تو رہیں گے وہ۔" کاکے کی ماں نے حساب لگایا۔

مگر سارا حساب کتاب دھرے کا دھرا رہ گیا' جب دو دن بعد یوسف کلثوم کو لے کر گھر میں داخل ہوا۔

زلیخا' کاکے کی ماں' کاکے کی دادی' فضیلاں' صدیقاں' بچی' کتنی ساری عورتیں جمع تھیں اور شوکت' گاما حلوائی' مختار' خلیق' سارے کے سارے یوسف کو لاہور کے ایئرپورٹ سے لے کر آ رہے تھے اور سب کے سامنے ہوتے ہوئے [illegible] کی آنکھوں [illegible] سے پہلا [illegible] قصیدے پڑھنے والی کرموں والی اب وحشت سی ہوتے سکڑ رہی تھی۔

کلثوم کم از کم 32,30 سال کی گٹھے ہوئے جسم والی' چوڑے ہاتھ پیروں والی' بجھی رنگت کی کرخت صورت عورت تھی' واضح طور پہ یوسف سے سات آٹھ سال بڑی اور وہ تین انچ اونچی۔

"السلام علیکم بے بے۔" مسکرائی تو ٹیڑھے میڑھے پیلے دانتوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی اور بھاری کھردری آواز کانوں میں چھری کی طرح لگی۔

کرموں والی نے بڑا ڈھیلا سا ہاتھ پھیرا اس کے گنتی کے چار بالوں پہ' آگے سے تو بال اتنے ہلکے تھے کہ ماتھا پوری طرح عیاں ہو رہا تھا۔

ساتھ کو جڑی بھنوئیں' عیار سخت گیری آنکھیں' پھیلی ناک' چوڑا دہانہ۔

وہ آدھا جگ بھر کے شربت گھولنے لگی' اور کاکے کی ماں اور زلیخا دونوں ہنسنے لگیں تو ساتھ جڑے کمرے [illegible] ہو گئیں۔

"ہم تو کہتی تھی نیلی آنکھیں ہیں اس کی۔"

وہ چپ رہی' چمچ اور زیادہ زور سے جگ میں ہلنے لگا۔

"گورا رنگ' لمبے سنہرے بال' وہ تو ... کالوں کی لڑکی لگ رہی ہے۔"

"توبہ کر زلیخا توبہ' یہ کاکے کی ماں تو ہے ہی شودی' تو تو عقل کو ہتھ پا' وہ بے جی سے ہے کلثوم' بچہ سارا خون' سارا رنگ روپ چوس لیتا ہے' اکثر زنانیوں کے بال بھی جھڑنے لگتے ہیں اور ایسا تو صاف تب ہوتا ہے جب لڑکا ہونے والا ہو' ماشاءاللہ سے پوتر آنے والا ہے میرا۔" وہ ان دونوں پہ الٹ پڑی۔

"اور شکل و صورت کا کیا ہے' وہ اللہ کی دین ہے' شرم کرو کسی کے نین نقش میں کیڑے نکالتے ہو' میں نے اور یوسف نے اس کے گن دیکھے ہیں [illegible]" [illegible] کمرے میں گئی۔ پیچھے پیچھے زلیخا اور کاکے کی ماں بھی۔

اور دروازے پہ تینوں ٹھٹک کے رک گئیں۔

کلثوم چادر اتار کے ستا رہی تھی اور واضح طور پہ پورے دنوں سے نظر آ رہی تھی۔

سیانی بیانی مائی بڑے غور سے اس کے پیٹ کو دیکھ رہی تھی۔ زلیخا نے معنی خیز ہنکارا ابھرا اور کاکے کی ماں بھلا صرف ہنکارا بھرنے والوں میں سے کہاں تھی' فوراً "سیانی بیانی" سے پوچھنے لگی۔

"کیا ہوا ماسی' کیا دیکھ رہی ہو وہٹی کو؟"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی' کرموں والی شربت کلثوم کے آگے رکھ کر سب کو کمرے سے نکالنے لگی۔

"چلو نی ... باہر نکلو سب' آرام کرنے دو ان دونوں کو۔"

مگر باہر جا کے بھی کہاں زبانیں بند ہوتی تھیں ان

آوازاری ہوتی' نند' نالیوں کی بدبو سے جی گھبراتا' بچے سکون سے پیدا ہوتے' دو گھنٹے کا سفر طے کرکے اسپتال تک چیک اپ کرانے بھی جاتی۔

اس دن بھی زلیخا' کاکے کی ماں اور دو اور عورتیں جمع تھیں صحن میں کرموں والی آنے والے پوتے کے لیے کی ہوئی اپنی تیاریاں دکھا رہی تھی۔ تھوڑے سے تو دن رہ گئے تھے۔

"یہ کرتا دیکھو اچھا ہے نا۔"

"بڑا خوب صورت ہے آپا! کلثوم کو دکھاؤ اسے پسند ہے؟ وہ کاکے کو یہ کرتا پہنائے گی۔" زلیخا نے مشکوک سے انداز میں پوچھا' کیونکہ اس نے دیکھا تھا کلثوم ہمیشہ ہی سے بکسہ بھر کے سلے سلائے کپڑوں کا لائی ہے چھوٹے بچے کے لیے رنگ برنگے' آرام دہ' نرم ملائم جوڑے۔

"اچھا ہے' بہت پیارا' کیوں نہیں پہناؤں گی۔" کلثوم نے ساس کا سیروں خون بڑھا دیا۔

"کیسی بڑی نیک ماں کی تربیت ہے۔" زلیخا بھی کہنے پہ مجبور ہوئی اور پھر کھسکی۔

"نی کلثوم۔ تیرے ماں باپ کا اتنا دل کرتا ہوگا تیرے ہونے والے کاکے کو دیکھنے کا انھوں نے تجھے آنے کیسے دیا؟"

"وہ خود جو آرہے تھے پاکستان' میں وہاں رہ کے کیا کرتی۔" وہ ہنس کے بتانے لگی۔

"اچھا۔ میرے کڑم (سمدھی) بھی آرہے ہیں پاکستان؟" کرموں والی نے خوش گوار حیرت سے پوچھا۔

"وہ نہیں رہے' آچکے ہیں۔"

"ہیں۔ تو ہوٹل میں ٹھہرے ہیں کیا؟ یہاں آتے سیدھا۔"

"آئیں گے' ضرور آئیں گے' دراصل وہ لاہور سے سیدھے ننکانے گئے تھے۔ وہاں سے فارغ ہو کے اسی دن آئیں گے جس دن مجھے اسپتال جانا ہے۔"

"ننکانے وہاں رشتے دار ہیں تمہارے؟"

"نہیں۔ وہ یاترا کے لیے آئے ہیں۔" چند لمحوں کے لیے سناٹا سا چھا گیا۔

کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

پھر کاکے کی ماں نے ذرا ٹھٹکتے ہوئے سوال کیا۔

"یاترا۔ نام کیا ہے تمہارے ماں 'پیو' کا؟"

"پاپا کا نام سکھویندر سنگھ اور ماما کا پریت کور۔"

کرموں والی کا ہاتھ سینے پہ آکے ٹھہر گیا۔

✡ ✡ ✡

"سکھنی؟ سکھنی ملی تھی تجھے۔" وہ یوسف پہ برس رہی تھی اور وہ سر جھکائے منمنا رہا تھا۔

"وہ سکھ تھی' اب مسلمان ہے' کلمہ پڑھا ہے اس نے۔"

"اور اس کے ماں پیو۔ وہ تو اودھر متھا ٹیکنے گئے تھے گوردوارے بول۔"

"اس کے ماں باپ سے آپ کا کیا لینا دینا' کلثوم بھی اب دلجیت کور نہیں ہے۔"

"پر تھی تو سکھنی' تو نے تو۔ میری نسل ہی خراب کردی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

"بے بے! خدا کے لیے چپ ہو جاؤ' اتنا ہی سوچ لو کہ وہ صرف میری بیوی نہیں ہے' اب میرے مالک کی بیٹی بھی ہے' میں اب کمپنی کا نہیں اپنے سسر کا ملازم ہوں۔"

"ہائے۔ بیڑہ ترجائے۔ تو سکھوں سے لے کر کھلاتا ہے مجھے' میری روٹی بھی حرام کردی یوسفے تو نے۔"

✡ ✡ ✡

اگلے دو دن وہ سب سے کتراتی کتراتی پھرتی رہی کہ نہ کسی سے سامنا ہو نہ کسی کی تمسخر بھری نظروں کو سہنا پڑے' نہ ہمدردانہ بولوں کی صفائی دینی پڑے۔

مگر تیسرے دن جب وہ بابے کو زمی کو کھانا کھلاتے ہوئے بڑی دل سوزی سے کہہ رہی تھی۔

"سچ کہتا ہے یوسف علی! یہ محلہ' یہ پنڈ اب رہنے کے قابل نہیں رہا' دیکھ نا۔ میرے گھر کی بات تھی' مگر سب میں پھیل گئی۔ اس پنڈ کی زنانیاں ہیں ہی بڑی فسادی۔ سارا وقت دیواروں سے لگی سن گن لیتی رہتی ہیں۔"

تو اس وقت کاکے کی ماں اپنی بڑی بیٹی کے کاکے کو گود میں لیے اور اپنے درمیانے والے کی انگلی تھامے اس کے دروازے کے آگے سے گزری' کرموں والی کو عجیب سے انداز میں دہلیز میں گڑے دیکھ کے اس کے دیدے چمک گئے۔

"آپا۔ لگتا ہے صدمہ ذرا کم ہوگیا ہے' جبھی نکلی ہو باہر۔"

"دفع۔ صدمہ ہو تیرے پچھلوں کو۔ تیری بیٹی کے سہروں کو۔ میرے گھر تو خوشی آنے والی ہے۔"

"ہاں۔ خوشی بھی آنے والی ہے اور۔"

اس نے خبیث سی مسکراہٹ اپنے جامنی سوجے ہونٹوں پہ سجاتے ہوئے کہا۔

"اور تمہارے پوتے کے سکھڑے نانا' نانی بھی۔"

"لعنت جو گئے' پھکریاں لگانے آئی ہے؟"

کرموں والی نے کمر پہ ہاتھ رکھا اور بابا اس ساری بک بک سے بے نیاز انھیں بے ایمان سا تک رہا تھا۔

"پھکریاں کیسی آپا۔ ساروں کو ہی افسوس ہو رہا ہے کہ ایسی نماز روزے والی بی بی کے گھر کافر۔"

"خبردار۔ خبردار جو میرے گھر کی عزت کو۔ میرے ہونے والے پوتے کی ماں کو کافر کہا تو۔ ہاں کی ہے میرے بیٹے نے سکھنی سے شادی۔ مگر کلمہ پڑھا کے۔ مسلمان کرکے۔ کوئی گناہ نہیں کیا میرے یوسفے نے۔ الٹا ثواب کمایا ہے اور پھر جو میں نے تم ساریوں کے کرتوت کھولے تو منہ چھپاتی پھرو گی۔ سب کی سب عید شب برات پہ بھی کسی کو ختم نیاز دلانے کی توفیق نہیں ہوتی' بنتی ہیں مسلمان۔"

اسے طیش میں آتے دیکھ کے وہ کھسک گئی۔

کرموں والی نے سر جھٹکا اور بابے کی پلیٹ میں اور سالن ڈالنے لگی۔

"ویسے بھی مجھے اپنے پوتے سے مطلب ہے۔ وہ تو پکا مسلمان ہوگا ان شاء اللہ۔ جب یوسف نے مجھے اپنے ساتھ دبئی لے جانے کی بات کی تھی تو میں نے انکار کردیا تھا کہ اپنا پنڈ۔ اپنا گھر چھوڑ کے نہیں جاؤں گی' پر اب خود ساتھ جانے کا کہوں گی' پنڈ اور گھر سے زیادہ ضروری خاندان کا نام اور وارث ہے' میں خود پالوں گی اپنے پوتے کو' بابا۔ دعا کرنا' میں اپنے پوتے کو اچھا نیک مسلمان بناؤں' اپنی نسل سنواروں' دعا کر بابا۔"

مگر بابا اس کے دبئی جانے کے ذکر سے ہی حواس کھو بیٹھا اور منہ کھول کے آں غاں' آں غاں کرنے لگا۔

کرموں والی اسی کو ہی دعا سمجھ کے صدق دل سے دہرانے لگی۔

"آمین۔ آمین۔"

✡ ✡ ✡

اور وہ دن آہی گیا۔

ننھے گلابی سے وجود کو لیے کرموں والی نے اپنے کانپتے لب اس کے ماتھے سے لگائے تو آنکھیں خوشی سے چھلک پڑیں۔

پھر اسے سینے سے لگایا تو ایک ٹھنڈی میٹھی سی لہر دل کے اندر تک اتر گئی۔

وہ اس رات اسپتال میں رہی۔ بچہ صحت مند تھا۔ کیس نارمل تھا اس لیے اگلے دن چھٹی ہو جانی تھی' کسی وجہ سے کلثوم کے ماں باپ ننکانے سے اب تک نہ آسکے تھے۔ کرموں والی نے دل ہی دل میں شکر کیا' وہ ان سکھڑوں کا منہ دیکھ کے اپنی خوشی کرکری نہیں کرنا چاہتی تھی۔

یوسف نے اسے لاری پہ بٹھا دیا کہ وہ گھر جا کے بہو اور پوتے کے استقبال کی تیاری کرے۔

اس نے گھر آکے سارا گھر دلہن جیسا سجا دیا۔ گلی کے بچوں کو پانچ پانچ روپے دے کر جھنڈیاں' ساری گلی میں لگوائیں' نائی سے حلوائی کی بھی دیہاڑی لگ گئی' صبح کو لڈو تلنے بیٹھا اور شام کردی۔ وہ شام کو لڈو بانٹنے دروازے پہ کھڑی تھی اور آتے جاتے لوگوں کی مبارک بادیں بھی وصول کررہی تھی۔

"ابھی کرموں والی تمہارے ساتھ ہے؟" زلیخا پوچھنے لگی۔
"تو نہ آئی خیر سے سویرے سویرے یوسف اور کلثوم بھی بچے کو لے کر آرہے ہیں۔"
"کیسا ہے تمہارا پوتا؟"
"گورا چٹا۔ ماشاء اللہ چاند کا ٹکڑا۔"
"وہ تو تم نے وہ بہو کے بارے میں بھی کہا تھا کہ انگریزنی ہے انگریزنی۔ نکلی وہ سکھنی۔"
ایک تو یہ وحشت عورتیں کوئی موقع نہ چھوڑتی تھیں طعنے دینے کا۔
"چل چل بی بی۔ کام کر اپنا۔ پوتا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کے آرہی ہوں۔ ماشاء اللہ ایسا نور والا چہرہ ہے اس کا۔" اس کے لہجے میں تفاخر نمایاں تھا۔

☆ ☆ ☆

"فنکشن کا کیا بنا؟" گھر آنے کے بعد گھر لگاتے ہوئے کلثوم نے پوچھا۔
"بے بے گھٹنے کے پھوڑے اور وزن کی وجہ سے لیٹ ہو رہا تھا۔ اب بے بے کا وزن گھٹ گیا ہے۔ دو چار دن میں فنکشن کر لیں گے۔"
"شکر ہے تمہاری بے بے ساتھ جانے کے لیے مانی، ورنہ میرے پاس کہاں وقت ہے بچہ پالنے کا اور میری ماما وہ تو اور بھی بزی رہتی ہیں۔"
"بے بے بھی نہ مانتیں، اگر تم انہیں خوش اور راضی نہ کر دیتیں۔" وہ مسکرایا تو کلثوم بھی مسکرا دی۔
"گزارہ کے کمپرومائز سے کوئی خوش ہوتا ہے تو میرا کیا جاتا ہے، ویسے بھی یہ طے تھا کہ میں نے یہ ڈیڑھ مہینہ یہاں گزارنا ہے۔ اب میں منہ بنا کے روتے دھوتے گزارتی یا ہنس کھیل کے، یہاں رہنا مشکل تو تھا مگر ہنستے کھیلتے گزارا تو جلدی گزر گیا۔"
اسی وقت کرموں والی اندر داخل ہوئی۔
"کدھر ہے کاکا؟" اسے پلنگ کی جانب بڑھتے دیکھ کے ذرا دیر کو کلثوم کے ماتھے پہ ناگواری کے بل آئے، وہ بھی تو ان کی پرائیویسی کا ذرا خیال نہ رکھتی تھی۔ جب دل چاہتا آندھی طوفان کی طرح اندر داخل ہو جاتی مگر پھر کلثوم نے کمال مہارت سے یہ ناگواری چھپائی۔
"کیا ہوا ہے بے؟ سو رہا ہے ابھی۔"
"خیر سے۔ سوئے۔ میں تو مولوی صاحب کو لائی تھی۔"
"مولوی؟" کلثوم چونکی۔
"اس کے کان میں اذان دینی ہے اور عصر کے بعد اس کی سر منڈائی اور ختنے بھی ہوں گے یوسف علی جانانی کو زردے کی دیگ کہہ آ۔"
"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔" کلثوم نے خشک لہجے میں کہا۔
"لے۔ ضرورت کیوں نہیں، سارا محلہ اور برادری اکٹھے ہو رہے ہیں ان کا منہ نہیں میٹھا کراتا؟"
"آپ ایک چھوڑ چار دیگیں بنوالیں زردے کی، میں یہ کہہ رہی تھی کہ اس کے کان میں اذان وغیرہ دینے کی ضرورت نہیں۔"
کرموں والی صدمے سے گم صم ہو کے مدد طلب نظروں سے یوسف کو دیکھنے لگی وہ نظر چرا گیا۔
"یوسف علی، تو نے کہا ہے اس نے کلمہ پڑھا ہے، مسلمان ہو گئی ہے۔ جھوٹ بولا تو نے۔ یہ پہچانی جاتی ہے۔ یہ کسی باپ کے مذہب پہ ہی چلے گا۔"
"بے بے۔ میں نے کلمہ پڑھا ہے اور دل سے مسلمان ہوئی ہوں۔" کلثوم نے نرم لہجے میں وضاحت کی۔
"لیکن مذہب کے معاملے میں میں ذرا آزاد خیال ہوں جیسے میں نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا ہے، ویسے ہی میرا بچہ بھی بڑا ہو کے اگر چاہے تو اسلام قبول کرلے، چاہے تو باپ کے مذہب پہ ہی رہے۔"
"باپ کے مذہب پہ؟ وہ ہی تو میں۔"
مگر کلثوم نے کرموں والی کا سوال مکمل نہ ہونے دیا۔
"یوسف نے آپ کو بتایا نہیں؟ کہ یہ بچہ میرا اور یوسف کا نہیں میرا اور ڈیوڈ کا ہے۔"
وہ حیرت سے اور کرموں والی صدمے سے یوسف کو دیکھ رہی تھی۔
"مکمل ہے یوسف۔ تم نے بتایا کیوں نہیں، حالانکہ میں نے کہا بھی تھا۔"
یوسف بغلیں جھانک رہا تھا۔
"تک۔ کو۔ کون۔ ڈیوڈ؟" کرموں والی نے دیوار کا سہارا لے لیا۔
"میرا بوائے فرینڈ۔ مگر وہ شادی کرنا چاہتا تھا نہ بچہ چاہتا تھا لیکن میں بچے کا قتل گناہ سمجھتی تھی۔ میں ماں بننا چاہ رہی تھی۔ اور میرے ماما پاپا نہیں چاہتے تھے اس بچے کی وجہ سے سوسائٹی ان پر انگلیاں اٹھائے۔ اس لیے انہوں نے یوسف سے میری شادی۔ یوسف کو سب پتہ ہے۔ اس نے سب۔"
مگر کرموں والی اس کی بات سنے بغیر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ تینوں جا چکے تھے۔
ان کے لاکھ منانے پہ بھی نہ کرموں والی کی چپ ٹوٹی نہ وہ ساتھ جانے پہ مانی۔
اس کی چپ ڈھولوں نے توڑی اور بھانت بھانت کے سوالوں پہ بھی نہیں ٹوٹ رہی تھی۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ سب آ آ کے اس سے ہمدردی کر رہے تھے۔ اس کی حالت زار پہ ترس کھا رہے تھے اور اسے برا نہ لگ رہا تھا۔ وہ انہیں منع نہیں کر رہی تھی۔ اپنی عزت بنائے رکھنے کے لیے صفائیاں نہ دے رہی تھی۔
بھرم کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے بہانے اور تاویلیں نہ گھڑ رہی تھی۔
سارا دن وہ بت کی طرح بیٹھی سب سنتی رہی اس کی خاموشی سے اکتا کے ایک ایک کر کے سب چلی گئیں۔
ادھ کھلے دروازے کی کنڈی کھڑکنے پہ اس نے چونک کے سامنے دیکھا جانا پہچانا انداز صاف بتا گیا کہ دروازے پہ بابا کوڑھی تھا اور صبح سے بے حس و حرکت بیٹھی کرموں والی اسے دیکھ کے تیر کی طرح آگے بڑھی۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے کچھ مانگ رہا تھا۔
"زہر نہ دے دوں تجھے۔ کوڑھی۔ خبیث۔
بھاگ جا یہاں سے تو وہ اسے دھکے دینے لگی۔
بابا اس کا پلٹنے پہ حیران پریشان تھا۔
"نکل۔ کو۔ تیرے جھلے میں بھی کتنی پاگل تھی تیرے سے دعائیں کراتی تھی۔ ایک لفظ پلے نہیں پڑتا تیرا۔ ہو رے منہ ہی منہ میں بڑبڑ کر کے کون سی الٹی سیدھی بکواس کرتا تھا۔ سارا کچھ ہی کر کے رکھ دیا۔ جو جو دعا تیرے سے منگوائی۔ ساری کی ساری الٹی گئیں۔ نکل جا یہاں سے۔"
اور سارے پنڈ نے یہ منظر دیکھا کہ بابا کوڑھی آگے آگے تھا اور اس کو کنکر اور ڈھیلے اٹھا اٹھا کے مارتی کرموں والی پیچھے پیچھے۔

☆

کالی چادر

اماں برکتے کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ساری کائنات جیسے چپ کی چادر اوڑھے لیٹی تھی۔ اور سرِشام بستر پر خراٹے لینے والی اماں برکتے جاگ رہی تھی۔ بار بار کالی چادر میں لپٹا سراپا اس کی نظروں کے سامنے آجاتا اور وہ بے چین ہو کر کروٹیں بدلنے لگتی۔

اس کے ذہن میں یہی سوال گونج رہا تھا کہ کالی چادر میں وہ کون عورت تھی جو نئے کرائے دار کی بیٹھک سے نکل کر بازار جانے والی گلی میں مڑ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اماں برکتے اس وقت ٹھیکیدار صاحب کے گھر سے اس کے پوتے کی پیدائش کی مبارک باد دے کر واپس آرہی تھی۔ ٹھیکیدار صاحب کا گھر گلی کے سب سے آخر میں تھا اور کرائے دار کی بیٹھک گھر کے سامنے تھی۔ جوں ہی وہ ٹھیکیدار کے گھر سے نکلی۔ بیٹھک سے کوئی عورت تیزی سے نکلی اور بازار جانے والی گلی کی طرف مڑ گئی۔

وہ حیران پریشان وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ گھر آکر بھی سر تھامے یہی سوچتی رہی۔ رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ ثریا نے تین بار آکر کھانے کا پوچھا مگر اس نے انکار کردیا۔ ثریا بھی حیران تھی کہ آج اماں کو ہو کیا گیا ہے، جو کھانا بھی نہیں کھا رہی اور پریشان بھی لگتی ہے۔ بات بھی نہیں کر رہی۔

برتن سمیٹ کر وہ سونے کے لیے چلی گئی۔ پر اماں کافی رات تک نہیں سوئی۔

☼ ☼ ☼

اماں برکتے پورے محلے کی جانی پہچانی شخصیت تھی۔ بیوہ تھی یہ دو دکانیں تھیں جن کے کرائے سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ ایک ہی بیٹی تھی جس کی شادی کے لیے آج کل کوشش کر رہی تھی۔ یہ عام سا محلہ تھا جہاں تقریباً سب لوگ ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ کسی کا کوئی راز نہیں ہوتا۔ سب ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہوتے ہیں۔

اماں برکتے کا سب لوگوں کے گھروں میں بے تکلفانہ آنا جانا تھا۔ ان کی سب لوگ عزت کرتے تھے۔ اس میں ایک عادت تھی کہ کسی کی بھی بات کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرتی تھی۔ اس عادت کی وجہ سے کئی بار اسے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ پھر بھی اپنی عادت سے باز نہیں آئی تھی۔

اب جس دن سے اس نے نئے کرائے دار کی بیٹھک سے کسی کالی چادر والی عورت کو نکلتے دیکھا تھا اس کا سکھ چین رخصت ہو گیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کوئی عورت تھی یا لڑکی۔ بہرحال اس کا خیال یہی تھا کہ وہ اسی محلے کی کوئی لڑکی تھی۔

☼ ☼ ☼

نئے کرائے دار کو اس محلے میں آئے ہوئے دو ماہ ہو چکے تھے۔ وہ کسی فیکٹری میں ملازم تھا۔ دیکھنے میں اچھا تھا۔ اگرچہ نیا آیا تھا پھر بھی محلے والوں کے دکھ درد میں شریک ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہاں کئی کرائے دار آکر رہتے رہے تھے۔ کیونکہ وہ بیٹھک صرف کرائے داروں کے لیے ہی مخصوص تھی۔

یہ بیٹھک نواب دین دودھ والے کی تھی۔ جو وہ ضرورت مندوں کو کرائے پر دیتا تھا۔ آج تک محلے والوں کو اس معاملے میں کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے کبھی بھی کسی نے نواب دین سے بازپرس نہیں کی تھی کہ وہ غیر آدمی کو محلے میں کیوں جگہ دیتا ہے۔ مگر اب جو اماں برکتے نے دیکھا تھا وہ اس کے ہوش اڑا گیا تھا۔

پہلے تو اس نے سوچا کہ محلے کے معتبر افراد کو بلا کر یہ ساری بات بتا دے پھر اس نے فیصلہ کیا کہ خود ہی اس معاملے کی چھان بین کرے گی۔ اس نے محلے کی جوان لڑکیوں پر کڑی نظر رکھنا شروع کر دی۔ محلے میں کتنی ہی جوان لڑکیاں تھیں۔

ماسٹر رحمت کی بیٹی شاہدہ، صدیق کباڑیے کی بیٹی رشعال، ٹھیکیدار صاحب کی بیٹی فریحہ تھی۔ پھر اور بھی کئی جوان ہوتی لڑکیاں تھیں اب اماں کی نظر سب کی نقل و حرکت پر تھی۔

☼ ☼ ☼

آج دوپہر کے وقت ہی لائٹ چلی گئی۔ گرمی کا موسم تھا۔ محلے کے تمام مرد اپنے اپنے کام کاج پر گئے ہوئے تھے۔ عورتیں بھی گھر کے کاموں سے فارغ ہو چکی تھیں۔ اماں برکتے نے چارپائی گلی میں نکال لی گلی میں ہوا تھی اس کی دیکھا دیکھی دوسری عورتیں بھی گھروں سے نکل آئیں آپس میں سب بات چیت کرنے لگیں۔

لڑکیاں بڑی عورتوں سے ذرا ہٹ کر خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ اماں برکتے نے بات کرتے کرتے لڑکیوں کی طرف دیکھا تو چونک پڑی۔ صدیق کباڑیے کی بیٹی رشعال نے کالی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ وہ کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔

رشعال بہت شوخ لڑکی تھی۔ اماں کو یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو رشعال ہی وہ لڑکی ہے جو کرائے دار کی بیٹھک سے نکلی تھی۔ اس نے کن اکھیوں سے ثریا کی طرف دیکھا۔ رشعال والی ٹولی میں بیٹھی ثریا بھی سفید دوپٹہ اوڑھے قمیص پر کڑھائی کر رہی تھی۔ ثریا بہت کم گو لڑکی تھی۔ کبھی اونچی آواز میں نہ بولتی، ہمیشہ نظر جھکا کر بات کرتی۔

اماں کو اپنی بیٹی پر فخر محسوس ہوا اس نے قریب بیٹھی ماسٹر رحمت کی بیوی صابرہ سے کہا۔

”آج کل کی لڑکیوں کو ذرا بھی شرم و حیا نہیں بزرگوں کے پاس بیٹھ کر ٹھٹھے لگا رہی ہیں۔“

”ہاں تو اور کیا۔“ صابرہ نے اماں کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”اب رشعال کو ہی دیکھ لو ہر وقت اس کے دانت نکلے رہتے ہیں۔“

”بالکل ٹھیک اور آج کل تو زیادہ ہی شوخی ہوتی جارہی ہے دراصل بات ہوتی ہے تربیت کی۔ صدیق بے چارہ سارا دن گلی گلی پھر کر پرانا سامان اکٹھا کرتا ہے۔ ماں سدا کی بیمار ہے بیٹی کو کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے“

جب دیکھو بازار جا رہی ہوتی ہے۔ سارے محلے کی چیزیں خریدتی پھرتی ہے مجھے تو کوئی اور ہی چکر لگتا ہے۔"

صابرہ کی اس بات نے اماں کو جیسے سہارا دے دیا وہ راز داری سے صابرہ کی طرف جھک کر بولی۔

"ایک بات بتاؤں کسی سے ذکر نہ کرنا ہماری بھی بیٹیاں ہیں۔"

"کیا ہوا؟" صابرہ اشتیاق سے بولی۔

"چند دن پہلے میں نے کرائے دار کی بیٹھک سے کسی کالی چادر والی لڑکی کو نکلتے دیکھا تھا۔"

"کیا...؟" صابرہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

اس کی نظریں کالی چادر میں لپٹی ہوئی ریشماں پر جم گئیں۔

"کالی چادر تو ریشماں ہی لیتی ہے۔" صابرہ بیگم نے سوچا۔ "جبھی تو آج کل اتنی کھلی کھلی رہتی ہے۔"

"پھر کیا کیا جائے؟" اس نے اماں برکتے سے پوچھا۔

"کرنا کیا ہے کسی دن رنگے ہاتھوں پکڑیں گے آخر ہماری بھی جوان بیٹیاں ہیں ان پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کو تو محلے سے نکلوا دینا چاہیے۔"

"دیکھو اماں برکتے! ابھی تم اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرنا صرف اس پر نظر رکھنا۔"

ابھی وہ دونوں یہ باتیں کر رہی تھیں کہ نیا کرائے دار گلی سے گزرا اسے دیکھ کر ریشماں نے پاس بیٹھی رشیدہ کے کان میں کوئی سرگوشی کی اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

صابرہ اور اماں برکتے نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اب تو شک کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

✡ ✡ ✡

کچھ دن اور گزرے اماں کے ساتھ ساتھ اب صابرہ بھی ریشماں پر نظر رکھتی تھی۔ ان ہی دنوں ریشماں کے لیے ایک رشتہ آیا۔ لڑکا کسی اسکول میں چپراسی تھا لڑکے کی ماں نے ریشماں کو کسی کے گھر دیکھا تھا وہ اسے پسند آگئی تھی سو پتا پوچھ کر ریشماں کے گھر چلی آئی۔

ریشماں کی ماں جوڑوں کے درد میں ایک عرصے سے مبتلا تھی۔ چلنا پھرنا محال تھا سو اس نے اماں برکتے کو مشورے کے لیے بلا لیا۔ اماں اس عورت کی شرافت اور سادگی دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ اتنے شریف لوگ ہیں اور کیسی بری لڑکی کو بہو بنانے کا سوچ رہی ہے۔

ریشماں کی ماں نے صدیق سے مشورہ کر کے جواب دینے کا کہا۔ تو لڑکے کی ماں نے کہا وہ چند دنوں تک دوبارہ آئے گی۔

وہ عورت ریشماں کے گھر سے اماں برکتے کے ساتھ ہی نکلی تھی۔ اماں اسے اپنے گھر لے گئی اور جب وہ اماں برکتے کے گھر سے نکلی تو دوبارہ نہ آنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ وہ اماں کی احسان مند تھی کہ اس نے اسے ریشماں کے کردار کے متعلق بتا کر اس کی آنے والی نسل خراب ہونے سے بچا لی۔

ریشماں کے ماں باپ کتنے دن تک اس کا انتظار کرتے رہے۔ وہ حیران تھے کہ خود ہی رشتہ مانگا اور خود ہی دوبارہ نہیں آئی۔

اس واقعہ سے ریشماں نے کوئی اثر نہیں لیا تھا۔ وہ ویسے ہی خوش باش تھی۔ جب بھی بازار جاتی سب سے پوچھتی کہ کوئی چیز تو نہیں منگوانی۔

اماں یا صابرہ اس کا بازار تک پیچھا ضرور کرتی تھیں۔ ابھی تک انہیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی مگر انہیں یقین تھا کہ ریشماں کسی دن بیٹھک میں ضرور جائے گی۔ انہوں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔

✡ ✡ ✡

ایک دن ثریا کی طبیعت خراب تھی محلے میں ایک کمپاؤنڈر تھا اسی سے سب لوگ دوا لیتے تھے۔ اماں برکتے ثریا کو ساتھ لیے بازار کی طرف جا رہی تھی کہ اس نے ریشماں کو دیکھا جو کالی چادر لپیٹے شاید بازار جا رہی تھی۔

دوائی اور ثریا کو بھول کر اماں برکتے صابرہ کے گھر پہنچ گئی۔ ابھی وہ بات کرنے والی تھی کہ ریشماں ہنستی ہوئی وہیں چلی آئی۔ اس نے شاہدہ سے پوچھا۔

"بازار چلو گی؟ میں جا رہی ہوں۔"

شاہدہ برتن دھو رہی تھی اس نے انکار کر دیا۔

"اچھا میں جا رہی ہوں کڑھائی کے لیے دھاگہ لینا ہے۔" یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔

اماں نے صابرہ کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ صابرہ نے سر ہلا دیا۔

"اماں دوا لینے چلو۔" ثریا نے کہا۔

اماں نے چند لمحے سوچا اور بولی۔

"تم اکیلی چلی جاؤ پاس ہی تو کلینک ہے۔ پہلے بھی تو جاتی رہی ہو۔"

"اچھا اماں!" ثریا نے سفید ململ کا دوپٹہ اچھی طرح اوڑھا اور باہر نکل گئی۔

محلے میں ہی جانا تھا اس لیے اماں نے اسے اجازت دے دی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد صابرہ اور اماں برکتے کرائے دار کی بیٹھک کی طرف چل پڑیں۔

دوپہر سر پر آگئی تھی، دھوپ بڑھتی جا رہی تھی اور اماں اس انکوائری کے چکر میں ثریا کی بیماری کو بھی بھول چکی تھی بہرحال اسے اطمینان تھا کہ ثریا دوا لے کر آگئی ہوگی۔

بیٹھک کے قریب پہنچ کر دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر اماں نے آگے بڑھ کر بند دروازے پر دستک دی۔ دروازہ نہیں کھلا پھر دستک دی اور متواتر دستک دیتی چلی گئی۔

پھر دروازہ کھلا کرائے دار کا گھبرایا ہوا چہرہ ان کے سامنے تھا۔

"کیا بات ہے؟" وہ بوکھلایا ہوا تھا۔

"بات بھی بتاتی ہوں پہلے اندر تو آنے دو۔" اماں نے کہا۔

"اندر میرے مہمان ہیں۔" پسینہ اس کی پیشانی پر چمکنے لگا۔

"ارے میں جانتی ہوں کون سے مہمان ہیں۔" اماں برکتے نے اسے دھکا دے کر اندر کیا اور خود بھی اندر داخل ہو گئی۔

ایک کونے میں کالی چادر میں لپٹی دیوار کی طرف منہ کیے وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"بے غیرت۔" اماں غصے سے اس کی طرف بڑھی اور چادر کھینچ کر اتار دی۔

"ذلیل کمینی! کچھ ماں باپ کا ہی خیال کیا ہوتا۔" صابرہ بھی غصے سے آگے بڑھی۔ لیکن ٹھٹک کر وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔ ان کے سامنے ثریا تھی۔ بکھرے بالوں سمیت لرزتی کانپتی۔

اماں برکتے کو جیسے سکتہ ہو گیا، باہر ہجوم جمع ہو رہا تھا۔ اماں نے ایک نظر اپنی گم صم اور شریف بنی بیٹی پر ڈالی دوسری نظر باہر جمع ہوتے لوگوں پر۔ اس کی نظر ریشماں پر پڑی جو ثریا کا سفید ململ کا دوپٹہ اوڑھے ہاتھ میں [illegible] حیران پریشان کھڑی تھی [illegible] ثریا ڈاکٹر کے پاس دوا لینے گئی تھی۔

[illegible] کے تمام دروازے بند ہوتے ہوئے اس کا ذہن تمام الجھن سلجھا گیا تھا۔ باہر کھڑے لوگوں کی نظروں سے چھلکتی ہوئی نفرت اسے اس گناہ کا صلہ لگ رہی تھی جو اس نے ایک بے گناہ اور معصوم لڑکی پر الزام لگا کر کیا تھا اور اس کا رشتہ ختم کروا دیا تھا۔

بے ہوش ہو کر گرنے سے پہلے اس کے ذہن میں آخری خوف ناک خیال یہی تھا کہ ریشماں کو تو دوسرا رشتہ مل جائے گا مگر شاید ثریا کی ڈولی لینے اب کوئی نہیں آئے گا۔

سعدیہ عزیز آفریدی
محبت سنگ دل راستہ
"تم جس راستے پر جارہی ہو، کسی منزل پر ختم نہیں ہوتا۔"
تایا نے اس کی تیاری پر تنقید کی تھی لیکن وہ سنی ان سنی کیے لپ گلوس لگا رہی تھی۔
"میں لڑکیوں کی نوکری کے اسی لیے خلاف ہوں۔"
"کیوں آپ نوکری نہیں کرتیں؟ آپ بھی تو ایک آفس میں کلرک ہیں اور آپ بھی میک اپ کرکے جاتی ہیں۔" اس نے ٹون بدل کر سوال داغ دیا۔
"میرا میک اپ ترغیب انگیز نہیں ہوتا۔" ان کے اس لہجے میں ہلکا سا اپنی ذات کا دفاع تھا اور وہ ہنس پڑی تھی۔
ناولٹ

"تب ہی تو پندرہ سال سے آپ اسی پوسٹ پر ہیں۔ مجھے دیکھیے مہینوں کی کامیابی دنوں میں حاصل کرلی میں اور زندگی پر عمل پیرا ہوں۔"

"تم ابھی کم عمر ہو تمہیں زندگی کی سمجھ نہیں۔" انہوں نے پھر سے کوشش کی لیکن وہ پھر ان سے کوسوں دور تھی۔

"صبا آپا! آپ زندگی کو خود سمجھیں۔ مجھے مت سمجھائیں۔ آپ کو پتا بھی ہے آپ کی عمر 35 برس ہو چکی ہے اور اس عمر میں لڑکیاں اپنے گھر میں رچ بس چکی ہوتی ہیں۔"

"تمہیں معلوم ہے میری نوکری میری ضرورت ہے اگر ابا ٹھیک ہوتے یا ہمارا کوئی بھائی ہوتا تو میں بھی اپنے گھر میں بس چکی ہوتی۔"

"کیا اصل بات یہی ہے صبا آپا؟" وہ سفاکی سے بولی۔

صبا جہانگیر کی آنکھ میں نمی آ ٹھہری تھی ان کی نظروں میں وہ بہت سی خواہشیں گھوم گئی تھیں جنہوں نے انہیں بڑی عمر اور معمولی صورت ہونے کی وجہ سے مسترد کر دیا تھا۔

"کیا تمہیں لگتا ہے میں اس قابل نہیں ہوں کہ کوئی مجھے پسند کر سکے۔"

"یہ سوال آپ کو مجھ سے نہیں آئینہ دیکھتے ہوئے خود سے کرنا چاہیے۔" وہ آج ہر حد پھلانگ گئی تھی کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ صبا آپا اس سے قطع تعلق کر لیں تاکہ وہ ان کی جا و بے جا روک ٹوک سے بچ سکے مگر وہ اپنی تینوں بہنوں سے بہت محبت کرتی تھیں باقی دو ابھی اسکولنگ میں تھیں اور ان کی باتوں کو حرفِ آخر مانتی تھیں مگر یہ لڑکی۔

"عفی! میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔" انہوں نے پھر سے خود کو مجتمع کر کے اس کی طرف پیش قدمی کی اور وہ عجیب سی سرد مہری سے انہیں دیکھتی رہی۔

"ہوئے تم دوست جس کے۔" وہ گنگناتے ہوئے اسکارف پہننے لگی تھی صبا جہانگیر کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔

"ناشتہ نہیں کرو گی؟" انہوں نے بیگ کی طرف اس کے بڑھتے ہاتھ دیکھ کر ماں جیسی ممتا سے پوچھا اور وہ نفی میں سر ہلا کر رہ گئی۔

"آپ نے بہت اچھا سا ناشتہ کروا دیا ہے تھینک یو آپا۔" وہ اب سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ اس کی ہر سیڑھی کے ساتھ ان کا دل ایک سانس کم لے رہا تھا۔

اماں کی زندگی میں ساری ذمہ داری ان کے کندھوں پر تھی کیونکہ وہ اماں کے لیے ایک دھارس بھرا کندھا تھیں۔ شوہر اپنی ذمہ داریوں کو نباہ نہیں سکتے تھے۔ نشہ نہیں کرتے تھے مگر انہیں آلکسی اتنی تھی کہ ایک نوکری ایک ہفتے سے زیادہ نہیں چلتی تھی پھر پڑھے لکھے بھی نہیں تھے یہاں تک کہ کسی فیکٹری، کسی کمپنی میں چوکیدار کی نوکری بھی ملنے کا امکان ختم ہو گیا تب ان کی ماں نے انہیں اپنا دوست، اپنا بیٹا اور جانے کیا کیا مان لیا تھا اور وہ بھی ان کی زندگی تک اس معیار سے کم ثابت نہیں ہوئی تھیں مگر عفت جہانگیر کی یہ تیز چلنے کی عادت بہت افسردہ ہو کر تینوں بہنوں کو بچت کروانے لگی تھیں پھر ابا کے لیے تھرموس میں چائے اور توس رکھ کر وہ ابا کو جگاتی ہوئی باہر نکل گئی تھیں۔ آج انہیں پانچ منٹ دیر ہو گئی تھی پھر وہ آفس پہنچیں تو ان کی آنکھ میں لمحہ بھر پہلے والا ڈر اور نمایاں ہو گیا تھا۔ عفت جہانگیر کی ادائیں اور سمیع عرفات کی آنکھوں کی بے چینی انہیں روح تک سے کپکپانے پر مجبور کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

عفت جہانگیر نے چائے میں چینی ڈالی تھی اور سمیع عرفات نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

"قسم سے عفی اگر تم چینی نہ بھی ملاؤ تب بھی چائے کا ذائقہ میٹھا ہوتا ہے۔"

"بس بلاوجہ کی تعریفیں۔" وہ چائے کے کپ کے ساتھ خود بھی اس کے بہت قریب آکر کھڑی ہو گئی

تھی۔

"قسم سے کبھی تمہاری تعریف میں نے اوپری دل سے نہیں کی مجھے تمہارا اندازِ بات کرنے کا ہنر تمہاری پر محبت توجہ۔ ہر چیز کشش کی طرح اپنی طرف کھینچتی ہے کاش! تم مجھے پہلے ملی ہوتیں تو میں تم سے ہی شادی کرتا۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "مجھ سے شادی کرنے کا اتنا کریز ہے تو اب کر لو مجھے تمہاری پہلی شادی پر کوئی اعتراض نہیں۔"

"نہیں یار! مجھے تم سے شادی نہیں کرنی۔ تم بغیر شادی کے ہی میرے بہت ناز اٹھاتی ہو اور میں چاہتا بھی نہیں ہوں کہ تم عصمت کی طرح چڑیل بن جاؤ۔"

"اچھا جی وہ چڑیل ہے۔" وہ اور قریب آ گئی۔

"ہاں وہ چڑیل ہے اور تم اپسرا ہو اور میں تمہیں اپسرا ہی کی طرح چاہتا ہوں۔"

"اچھا تو واقعی تم مجھ سے کبھی شادی نہیں کرو گے۔" وہ تھوڑی اور جھکی اور سمیع عرفات کو اپنا سانس بحال کرنا دشوار لگنے لگا۔ خوب صورت نظارہ دیتا اس کا حسن اس نے اسے قریب کر لیا تھا پھر اس کے بالوں سے الجھ کر بولا تھا۔

"تم میں ہے کوئی بات کہ میں تمام تر انکار کے باوجود اقرار کرنے لگتا ہوں۔ یہ تیرا حسن جمال جان لے لے گا میری، میری دلہن ہوتی تم عفی۔" اور عفت جہانگیر نے صبا جہانگیر کی تمام سمجھ بوجھ کی باتوں سے منہ موڑ کر کہا تھا۔

"ہاں مجھے تمہاری ہی دلہن بننا ہے کب لاؤ گے میری بارات؟"

"جب تم کہو۔" وہ مسرور ہو کر کہے جاتا یہاں تک کہ اس کے نمبر پر کوئی کال نہ آ جاتی یا اس کا سیل فون بجنے نہ لگتا۔

وہ خود کو سنبھالتا اور پھر سے چالباز سمیع عرفات میں ڈھل جاتا اور عفت جہانگیر پھر اپنی چھٹی کے وقت تک ان حسین لمحوں کو ہوس کی آنکھوں میں ہوس کی پیاس بجھتی رہ جاتی۔

☆ ☆ ☆

"اگر آپ جیسے لوگ دنیا میں آتے ہی کیوں ہیں جن کے اندر زندگی کی امنگ تک ادھار کی طرح مانگی ہوئی لگتی ہے۔" وہ کلام کر رہے تھے یکدم چونک کر اس ہستی کو دیکھنے لگے تھے جو ان کی بیوی ضرور بنی تھی۔ ساتھی نہیں بن پائی تھی۔

"آپ ایسے گھور کے کیا دیکھ رہے ہیں کیا میں نے غلط کہا ہے؟"

"نہیں صفیہ! تم کبھی غلط نہیں بولتی ہو۔"

"خدا کا شکر ہے۔ آپ نے اعتراف تو کیا۔" صفیہ کے تیور ابھی تک چڑھے ہوئے تھے اور انہوں نے منمنا کر کہا تھا۔

"میں نے تم سے جھوٹ کب بولا۔"

"ہاں کاش آپ جھوٹ بولنا سیکھ جاتے تو میری زندگی کتنی آسان گزرتی۔" وہ لگے ہاتھوں اپنی ہی بات کو جتلا رہی تھیں سو انہوں نے توجہ نہیں دی تھی۔ وہ اس وقت اپنے کپڑے پریس کر رہے تھے۔

"آپ کو لگتا ہے۔ میری وجہ سے آپ نے زندگی بہت تکلیف میں گزاری۔"

"لگتا ہے صرف لگتا ہے حمید صاحب! میں نے ایک ایک لمحہ آپ کے ساتھ کسی سزا کی طرح گزارا ہے۔" حمید الدین کی آنکھوں میں یاسیت بھر گئی۔

"میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ آپ کو زندگی کی ہر سہولت دوں۔" انہوں نے بے وقت کہا اور وہ طنزیہ ہنس کر بولی تھیں۔

"یہ زندگی ہے اور یہ زندگی کی سہولت۔ دو کمروں کا گھر، ایک سیکنڈ ہینڈ ٹی وی، فریج اس گھر کی ہر چیز سیکنڈ ہینڈ ہے حمید صاحب۔"

"میں نے ایمان داری سے اپنے عہدے سے وفاداری نبھائی ہے۔"

"ایمان داری! وفاداری! کتنے پرانے لوگوں کی باتیں ہیں مگر آپ کی تربیت ہمیشہ میرے لیے سوہان

رہی ہے۔ پتا نہیں یہ پرانے لوگ خود مرجاتے ہیں مگر اپنے اعمال کا ملبہ دنیا میں چھوڑ جاتے ہیں دوسروں کی زندگی تباہ کرنے کے لیے۔"

"صفیہ۔" حمید الدین صاحب نے غصے سے پہلی بار آواز اونچی کی تھی۔ صفیہ پر ان کے غصے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"جو لوگ کچھ نہیں کر سکتے وہ بہت تیز آواز میں چیخا کرتے ہیں، جو کر سکتے ہیں ان کا رعب ان کا کام ان کا نام خود بنا دیتا ہے۔"

"اللہ کا شکر ہے میرا معاشرے میں بہت نام اور عزت ہے۔"

"عزت کیا ہوتی ہے حمید صاحب! آپ کے ابا نے یہ گھر نہ بنایا ہوتا تو میں دیکھتی اس دس ہزار کی تنخواہ میں آپ گھر، بچے سب کیسے سنبھال سکتے تھے۔ پتا نہیں میرے ابا نے کیا دیکھا تھا آپ میں۔" وہ تخت پر بیٹھ کر واویلا کرنے لگی تھیں۔

"سب کہتے ہیں۔ آپ دنیا کی خوش قسمت خاتون ہیں، مرزا اچھا شوہر ہے، وہ بے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں مگر آپ کو کیا۔"

"دنیا کو نہیں پتا میں کیسے جی رہی ہوں صبح شام کس طرح حسرتیں میرا منہ چڑاتی ہیں۔ زندگی میں مجھے اچھا کھانا پینا، خوب شاپنگ کرنا پسند تھا۔ آزادی سے گھومنا پھرنا اچھا لگتا تھا مگر گھر میں ابا اماں کے اصول روک ٹوک اور سفید پوشی کے بھرم زندگی دو بھر تھی۔ جب آپ کا رشتہ آیا۔ پڑھے لکھے تھے۔ ایک کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر تھے۔ مجھے لگا میرے سارے خواب شرمندہ تعبیر ہونے کا وقت آگیا مجھے کیا پتا تھا۔ میں اپنے بلیک وارنٹ پر دستخط کر رہی ہوں۔"

"آپ کو مجھ سے اتنی شکایتیں ہیں مگر آپ کی خفگی کو میں اتنا گہرا نہیں سمجھا تھا، مجھے لگا تھا آپ ظاہراً مجھ سے خفا رہتی ہیں مگر دل میں میرے لیے ایک نرم گوشہ رکھتی ہیں۔"

اب بھی ان کے لہجے میں حسرت تھی کہ وہ کوئی شک کا فائدہ دے کر انہیں اتنی ساری غلطیوں سے باعزت بری کردیں۔

"آپ کو میں کبھی معاف نہیں کروں گی آپ نے میرے سارے خواب چھین کر مٹی میں ملا دیے۔ رہی ظاہری خفگی تو بس مجھے ایک لاوا ہے، جو میرے اندر بلبلے بنا رہا ہے اچھال پیدا کر رہا ہے۔ مگر یہ لاوا اس لیے پھٹنے نہیں پاتا کہ میرا گھر قائم رہے بچوں میں آپ کا بھرم قائم رہے۔"

"میرا بھرم؟" وہ خالی الذہنی سے اٹھے تھے پھر نماز کر نکلے تو چھوٹے بیٹے کو ماں سے لاڈ کرتے پایا "اماں بس دو ہزار کی تو بات ہے یونیورسٹی کے سب لڑکے جارہے ہیں ٹور پر۔"

"مگر تم ان لڑکوں جیسے نہیں ہو۔ کیونکہ ان کے لیے دو ہزار دو روپے جیسے ہیں اور تمہارے لیے دو ہزار دو لاکھ جیسے۔"

"پتا نہیں ابا کو اتنا ایمان داری کا بھوت کیوں سوار ہے؟"

"افضل مت بولو وہ تمہارے ابا ہیں۔"

"تو کیا ہوا، کاش ایسے ابا مجھے نہ ملے ہوتے بندہ کوئی خواہش ہی نہیں کر سکتا ایک تمنا دل میں پنپتی کاٹتی ہے دوسرے پل اپنے اردگرد کو دیکھ کر واپس حقیقت میں آنا پڑتا ہے۔" وہ باہر کھڑے ہوئے سنتے رہے۔

"مجھ سے نہیں رہا جاتا آج کل کل کر ایسی زندگی صرف آپ اور صبا کو پسند ہوگی مجھے نہیں، میں موقع کی تلاش میں ہوں جہاں داؤ لگا میں تو اس گھر سے نکل جاؤں گا۔"

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے افضل؟" صفیہ نے غصہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔

اور وہ سر جھٹک کے بولا۔ "میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے اسے آپ تینوں کی طرح حالات کے آگے سر جھکانے کی بیماری نہیں لگی۔"

وہ ساکت سنتے رہے، پھر خاموشی سے تیار ہو کر اپنے

دفتر کے لیے نکل گئے بہت سے سوال گھر میں چھوڑ کے بہت سے سوال اپنے ساتھ اٹھائے ہوئے۔

☼ ☼ ☼

انہوں نے ڈاکٹر کو دو نہیں سہ بار دیکھا تھا۔

"آپ کہنا چاہتے ہیں میرے گردے۔"

"جی ہاں آپ کو اپنی ... لگوانا پڑے گی ورنہ آپ کے لیے بہت وقت ہو جائے گا زندگی کی قدر کیجیے مسٹر سلمان۔"

اور وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر آگئے پھر چلتے ہوئے قدموں نے ساتھ نہیں دیا تھا وہ ایک گارڈن کی بینچ پر بیٹھ گئے تھے "زندگی۔"

حسرت کی طرح انہوں نے بھاگتی دوڑتی زندگی کو دیکھا اور سوچا ان کا زندگی سے تعارف کیسا ہوا تھا۔ وہ شاید چودہ برس کے تھے جب زندگی نے تلخی کی طرح ان کی عمر کے دروازے پر دستک دی تھی۔ ان کے سر سے باپ نام کا جو سایہ تھا وہ یکدم اچانک چھین لیا گیا تھا۔ اچھے بھلے ابا جب ابھی دکان پر گئے تھے تو انہیں گمان نہیں تھا کہ زندگی ایک دم سے ... واردات میں مزاحمت پر ابا کو ... مار دی تھی وہ اسکول سے بلائے گئے تھے اور تب وہ پہلا لمحہ تھا جب انہوں نے موت کو باقاعدہ اپنے سامنے ساکت لیٹے ہوئے دیکھا تھا۔

"سلمان! تمہارے ابا اب اس دنیا میں نہیں رہے۔" کسی نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور انہوں نے خالی آنکھوں سے خالی دل ہو جانے والی اماں کو دیکھا۔

ابا کا اور ان کا ساتھ تو دل اور دھڑکن کا تھا۔ وہ ان کے غم زدہ تھے اور ظالم سماج ان کے بیچ کہیں سے نہیں آیا تھا۔ دونوں نے بہت آسانی سے ایک دوسرے کو پالیا تھا اور آج...؟

آج اس سے بھی آسانی سے کھو دیا تھا۔ کتنے سارے خواب ان بند آنکھوں میں یک بارگی ابھر کر آخری سانس کی طرح ڈوب گئے تھے۔

پھر انہوں نے دو بہنوں اور تین بھائیوں کو ایک ایک کر کے گنا اور کتنی کتنی سال تھوڑا تھوڑا ہوتے ہوئے پایا پھر زندگی میں خود ان کے لیے اپنی کوئی جگہ نہیں بچی تھی وہ بس اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے میں لگے رہے تھے اپنی خواہش اور تمنائیں سینت سینت کر رکھتے گئے تھے کہ جب وہ سہولت سے جینے کا سوچیں گے تو ساری تمنائیں یک بارگی ایک سانس ہی میں جی لیں گے اور اب پندرہ سال بعد وہ اپنی ذمہ داریوں کو احسن طور پر پورا ہونے کا جشن بھی منا نہیں سکتے تھے۔ ایک بہت زبردست ٹھوکر لگی تھی۔

"مجھے ابھی نہیں مرنا تھا۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہے میرا جس سے میں نے وعدہ نہیں کیا کوئی خواب نہیں دکھایا مگر وہ جانتی ہے کہ اگر میں زندگی میں کسی کے ساتھ جینا چاہوں گا تو وہ صرف وہی ہو سکتی ہے۔ ماہ نور جمال ان کی ہر اداسی ہر مایوسی کے لمحات میں امید کا روپ دھارنے والی زندگی سے بھرپور ایک لڑکی جسے ان کی اماں نے خوش خوش ان کے نام کی انگوٹھی پہنائی تھی۔ ان کی محبت تو وہ کہہ کر ان کی بہنوں نے اپنے شوہروں کے ساتھ کراس کو خوشی خوشی وصول کیا تھا اور اب اچانک یہ ... میں ان کی دھڑکن ہوئی تھیں بہت مایوس تھے جب بالکل اچانک ان کے سیل فون پر ماہ نور کی کال آئی۔

"ہیلو ماہ نور۔" ان کی آواز ان کے دل کی ناامیدی سے لڑ نہیں پائی تھی تب ہی دوسری طرف بیٹھی ماہ نور کی جان نکل گئی تھی۔

"آپ ٹھیک تو ہیں؟ آپ کی آواز کیسی ہو رہی ہے آپ نے تو آج ہسپتال جانا تھا اپنی رپورٹس لے کر پھر۔"

"نور! میں گیا تھا ڈاکٹر اجمل کے پاس۔" وہ دکھے لہجے میں بولے پھر آہستگی سے بتانے لگے۔ "ہم نہیں مل پائیں گے نور! ایک گردہ بالکل فیل ہے اور ایک پچاس فیصد کارکردگی دکھا رہا ہے اب تم ہی بتاؤ میں تمہیں کن خوابوں میں زندہ رکھوں میں تو خود۔"

"کچھ نہیں ہوا آپ کو اور اگر ہوا بھی ہے تو ہر بیماری کا علاج ہے بس آپ ناامید نہیں ہوں۔"

"امید کے لیے کون سا روزن کھلا رہ گیا ہے نور؟"

"یہ روزن، جب تک ایک بھی سانس باقی رہتی ہے زندگی کی امید کو مرنے نہیں دینا چاہیے۔ انسان ایک بار ہی مرتا ہے ایک بار ہی جیتا ہے۔ سو ہم موت اور زندگی کے بیچ کا یہ وقت ناامیدی کی نذر کیوں کریں۔"

"مگر نور! میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟ میری ساری زندگی ذمہ داریوں میں چلی گئی میں اب کچھ جینا چاہتا تھا اپنے لیے اور ایک دم سے زندگی نے کہا حساب ختم ہوا۔"

"سلمان! آپ سوچیں اگر یہ سب دس سال پہلے ہوا ہوتا تو آپ کی اماں یہ ذمہ داریاں کیسے اٹھا پاتیں وقت نے آپ کا کتنا ساتھ دیا ہے۔ آپ کو جنت سنبھال کر رکھا اور اب اگر کچھ تکلیف دی ہے تو بھی آپ کے گرد کتنی محبتیں ہیں جو آپ کا حوصلہ ہیں۔ آپ کی ہمت ہیں۔ آپ کے ساتھ میں ہوں سلمان! اور میرا اور آپ کا ساتھ صرف زندگی تک کا نہیں ہے۔"

سلمان احمد کی نمی میں ہلکی سی ہنسی شامل ہوئی تھی۔

"تھینکس سلمان سائنس کہتی ہے بیماری اتنی بڑی یا خطرناک نہیں ہوتی جتنا ہماری سوچ ہماری طرز زندگی ہماری مایوسی اسے خطرناک مقام پر لے جا کر کھڑا کر دیتی ہے لوگ کینسر جیسے سفاک مرض سے بھی لڑتے ہیں جیتتے نہیں ہیں تو بھی طویل تر ماہ و سال چھین کر جی لیتے ہیں اور زندگی مکمل ہے اگر اس میں کوئی آپ کا دل سے ہے۔ آپ کو کسی بھی حالت میں تنہا چھوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتا سمجھ رہے ہیں نا آپ؟"

"ہاں۔ تم واقعی میری ہمت میرا حوصلہ ہو نور!"

"اور آپ میرے لیے زندگی کا دوسرا نام ہیں" سلمان "اس کی آواز میں محبت ہی محبت تھی۔

"اچھا میں اب چلتا ہوں۔" انہوں نے آسودگی سے کہا تھا۔

"کہاں جائیں گے؟"

"گھر جاؤں گا۔ اماں کو بھی تھوڑا بریف کرنا ہے اپنی بیماری کے بارے۔"

"تو کیا میں اماں کے ساتھ گھر آؤں گی آج رات"

"اچھا ٹھیک ہے۔"

انہوں نے سیل آف کیا اور اپنے گھر کی سمت جانے والی بس کے روٹ پر چلنے لگے۔

☆ ☆ ☆

"تم نے مجھ سے پوچھے بغیر انٹرویو کیوں دیا اسفندیار؟" یکدم بہت غصیلی آواز اس کے قریب گونجی اور اس کی کمپیوٹر پر تھرکتی انگلیاں یکدم رک گئیں۔

"ماما میں نے پاپا سے پوچھ لیا تھا۔" اس نے رسان سے کہا۔

"کیا تم صرف اپنے پاپا کے بیٹے ہو؟ میرا تم پر کوئی حق نہیں؟" ماما کا غصہ پہلے سے سوا ہو گیا تھا اور وہ کمپیوٹر آف کر کے۔۔۔ متوجہ ہوا۔

"آپ کو آخر میرے فوج میں جانے پر کیا اعتراض ہے ماما؟"

"مجھے نہیں پتا لیکن میں اتنا جانتی ہوں۔ تم فوج میں نہیں جاؤ گے۔ تم اپنی فیملی کی طرح بزنس مین بنو گے۔"

"مگر میرا انٹرسٹ نہیں ہے بزنس میں۔ مجھے بچپن سے آرمڈ فورسز پسند ہیں۔"

"کیا تمہارے لیے صرف تمہاری پسند اور مرضی ہی اہم ہے۔" وہ سخت خفا تھیں۔

تب اس نے دلار سے ماما کو کندھوں سے تھام لیا تھا۔ "آپ صرف اس لیے ڈرتی ہیں کہ کسی محاذ پر آپ کا بیٹا مر نہ جائے۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"مگر ماما! موت کا ایک دن معین ہے جب موت کا

وقت آگیا تو بزنس مین ہونا میری ڈھال نہیں بنے گا۔ مجھے اتنا ہی وقت ملے گا زندہ رہنے کا۔"

"تمہیں پتا ہے فوج میں سیاست کا کتنا عمل دخل بڑھ گیا ہے اور اس وجہ سے فوج کی عزت بھی مجروح ہوئی ہے۔"

"ہاں مگر میں صرف اپنے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے فوج میں جانا چاہتا ہوں مجھے اقتدار اور زمینوں کی ہوس نہیں۔"

"صرف تم ہی کیوں اور بھی لوگ ہیں وہ فوج میں کیوں نہیں جاتے۔"

وہ ہنس پڑا۔ "اگر سب کی مائیں یہی سوچتی رہیں تو ہماری فوج جو ویسے ہی عددی برتری میں کم ہے صرف زیرو رہ جائے گی۔ کیا پہاڑوں اور گاؤں والوں کا فرض ہے اس ملک کے لیے افواج پیدا کریں اور حفاظت کرنے کے لیے فوجی بھی پیدا کریں۔ تارکول کی سڑکوں پر چلنے والے امریکن طرز زندگی گزارنے والے بہت اچھا ہے برا لائف اسٹائل [illegible] طرز زندگی جیتے ہیں ان کا کوئی فرض نہیں بنتا ہم صرف اس بات کا دم بھرتے رہیں کہ ہم ملک کی اکائی کو صفر سے ہزار تک لے جا رہے ہیں تو ہم ہر چیز سے بالاتر ہیں۔"

"تم فوج میں نہیں جاؤ گے۔"

"اس مہینے کی پندرہ تک ٹیسٹ کے لیے جانا ہے ماما۔"

"تو تم نہیں مانو گے۔" وہ غصے سے چلائی تھیں۔

"آپ ٹھیک بھی ہیں ماما پلیز کوشش کریں آپ دل سے میرے اس فیصلے کو مان لیں اور پھر رہے عارف بھائی ہیں نا پاپا کا بزنس سنبھالنے کے لیے۔"

"تم نے شہرین کو بتایا ہے اپنے اس فیصلے کا۔"

انہوں نے آخری امید کا نام لیا۔ وہ ان کی بھانجی تھی اور فوج میں بھرتی ہونے کے سخت خلاف۔

"جی میں نے اسے کل بتایا تھا۔ وہ بھی آپ کی طرح ری ایکٹ کر رہی ہے۔"

"اور تم مجھ کو بھی اپنی مرضی کرنا چاہتے ہو؟"

"جی ماما کیونکہ میں جانتا ہوں میں غلط نہیں ہوں۔"

اس نے ان کی طرف سے پشت کر لی تھی۔ ماما اٹھ کر چلی گئی تھیں۔ جب اچانک اس نے کل کی اپنی اور شہرین کی ملاقات کو یاد کیا تھا۔ اس نے ابھی اطلاع دی ہی تھی کہ بڑی بڑی ستارہ آنکھیں غصے سے اس پر جم گئی تھیں۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کچھ نہیں رکھا اس فیلڈ میں۔"

"میں حب الوطنی کے جذبے سے جا رہا ہوں شہرین! کوئی بزنس کرنے نہیں جا رہا میرے لیے یہ فیلڈ نہیں زندگی کو ٹھیک طرح سے جینے کا ایک راستہ ہے۔"

"میں نے ایک میسج بھیجا تھا آپ نے وہ نہیں پڑھا تھا۔" اس نے چنچلی سی تکلیف بھری یکدم اسے وہ میسج یاد آگیا تھا۔ "ایک فوجی کی ڈائری کا صفحہ۔" وہ اسے جھٹکنا چاہتا تھا کہ شہرین اسے پھر سے سنانے لگی تھی۔

"میری عمر کے بہت سے نوجوان کالج اور یونیورسٹی میں پڑھ رہے ہوں گے مگر میں یہاں محاذ پر ہوں جہاں کوئی بھی گولی میری زندگی ختم کر دے گی اور یہ زندگی میں ان لوگوں کے لیے ختم ہوتے دیکھوں گا۔ جنہیں سنگر اور پڑوسی ملک کے اداکاروں کو دیکھنا ان فوجیوں کی کہانی سننے سے زیادہ ضروری لگتا ہے۔ جو صرف ان کے لیے اپنی جان کی بازی لگاتے ہیں تاکہ وہ سکون سے سو سکیں۔"

"بس ہو چکا۔" وہ چپ ہوئی تو اسفندیار نے خفگی سے کہا۔

"تو تمہیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا؟"

"پہلی بات تو یہ ہے اگر میں ایک لمحے کے لیے یہ مان بھی لوں کہ ایک فوجی انسان ہے مگر میں یہ نہیں مان سکتا کہ کوئی فوجی جو واقعی میں فوجی ہے اپنے کسی فیصلے پر پشیمان نہیں ہو سکتا ہے وہ غازی شہید دونوں حالتوں

میں خود کو دنیا کے لیے اپنے بہن اور اپنے وطن کے لیے داؤ پر لگاتا ہے اور جو چیزیں شو آف نہیں ہوتیں ان میں پچھتاوا اور پشیمانی کا عنصر بھی نہیں آتا جب ایک فوجی اپنی جان اللہ کی راہ میں قربان کرتا ہے تو اسے اللہ ہی سے توقع ہوتی ہے اس کے بندوں سے نہیں۔ اس میرے کا آخری حصہ تو اس میں 'میں کہہ سکتا ہوں یہ ہماری واقعی کمزوری ہے ہم ان کی خدمت کا اتنا حق ادا نہیں کرپاتے جتنا کرنا چاہیے۔"

"او ر کیک میں اکیا سوچ رہے ہو۔" کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور وہ یکدم ہوش میں لوٹ آیا اس کے سامنے عارف بھائی کھڑے تھے۔

"ارے، آج آپ اتنی جلدی کیسے آگئے۔" وہ مسکرایا تھا۔

"بس ایسے ہی مستقبل کے آرمی آفیسر کے ساتھ چائے پینے کا دل چاہ رہا تھا۔" اس نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا وہاں خفگی کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔

"آپ میرے اس فیصلے سے خفا تو نہیں ماما کی طرح۔"

"نہیں مجھے کیا اعتراض ہوگا میرے بھائی! یہ تو خوش نصیبی ہے کہ تمہاری وجہ سے ہمیں یہ سعادت مل رہی ہے ماما اور نائلہ سخت خلاف ہیں مگر میں نے انہیں بھی یہی کہا ہے کہ فوج میں جانا کوئی برائی نہیں رہا موت کا ڈر تو اس کا ایک دن مقرر ہے۔ ماما نے کچھ کہا تو نہیں مگر مجھے لگتا ہے وہ اب بھی دل سے راضی نہیں ہیں اور شاید تمہیں سمجھانے کی ایک اور نشست رکھیں گی۔"

"ہم، وہ یہ معرکہ لڑ کر جا چکی ہیں بڑے بھیا۔"

"تم پریشان مت ہو 'میں' سعد اور پاپا تمہارے ساتھ ہیں۔"

"تھینکس بھائی۔"

"پاگل ابھی سے غیریت دکھا رہا ہے۔" وہ ہنس پڑے۔

"نہیں تو بھائی۔" وہ شرمندہ ہوا اور وہ اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "یہ سوری تو مجھے بھی اچھا لگتا ہے کبھی کبھی رشتوں کو باہم جوڑے رکھنے کے لیے مگر یہ تھینک یو مجھے نرا تکلف بھرا انداز لگتا ہے اپنوں میں تو محبت کے بدلے بس محبت چلتی ہے شکریہ غیروں میں اچھا لگتا ہے۔"

"ٹھیک ہے بھائی۔" وہ ان کے ساتھ اٹھا تھا پھر ان کے کمرے میں نائلہ بھابھی چائے بنا کر لائی تھیں اور وہ عارف بھائی کی الماری کھولے کھڑا تھا۔

عارف بیڈ پر بیٹھے لیپ ٹاپ پر کسی کام میں مصروف ہو گئے تھے۔

"چائے۔" عارف بھائی مسکرائے اور چھوٹی ٹیبل کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"چائے اتنی بدمزا تو مت کرو یار۔" وہ ہنس کر بولے پھر پیچھے مڑ کر اور اس کی طرف مڑے۔

"اسفند کیا ڈھونڈ رہے ہو الماری میں۔"

"سعد بھائی نے کہا تھا آپ پرسوں چار شرٹس لائے ہیں، بڑی کلاسی سی، وہی دیکھ رہا تھا۔"

"ارے وہ۔ وہ دوسرے حصے میں نائلہ نے استری کرکے ہینگ کر رکھی ہیں۔"

اس نے دوسرا پٹ بھی کھول لیا تھا پھر وائٹ اور میرون شرٹ کے ہینگر اٹھائے تھے۔

"یہ مجھے اچھی لگ رہی ہیں بڑے بھیا! یہ میں لے رہا ہوں۔"

نائلہ نے خفگی سے دیکھا اور وہ مسکرا دیے۔ "لے لو اسفند! میں اور لے آؤں گا۔"

"لوکے میری پاکٹ منی میں سے کاٹ لیجیے گا۔" اس نے ہینگر بیڈ پر رکھ کر چائے اٹھائی اور عارف ہنس پڑے پاپا کے ساتھ ساتھ سعد بھائی سے بھی وہ اچھا خاصا جیب خرچ لیتا تھا اور اسی وقت اسی جیب خرچ کی بابت بات کر رہا تھا۔

"چل بکو اس مت کر سب تیرا ہی تو ہے۔"

"مجھے میرے بھیا۔" وہ چائے پی کر شرٹس لے کر نیچے چلا گیا تھا پھر وہ سارا دن تھا جب اس نے سنا پاپا ماما سے کہہ رہے تھے۔

"تم بلاوجہ اسفند پر خفا ہو رہی ہو ورنہ اگر ملکی سیاست میں دیکھو تو بزنس مین آرمڈ آفیسر ٹپ کی پاور کو بیلنس رکھتا ہے میں تو سوچ رہا تھا کاش میرا ایک اور بیٹا ہوتا تو میں اسے وکالت کرواتا پھر وہ جسٹس بنتا پھر تم دیکھتیں کیا راج ہوتے تمہارے ہماری ہائی سوسائٹی میں جس کے جتنے کنٹیکٹ ہوں وہ اتنا ہی ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے تمہارا بیٹا آرمی آفیسر بن گیا تو تمہاری حیثیت ان سب عورتوں میں زبردست ہو جائے گی بیگم۔"

ماما کی آنکھوں نے سوچنے کا موڈ بنایا اس لگژری اس حیثیت کا اعداد و شمار لگانا شروع کیا اور اسے ہلکا سا غصہ آگیا پاپا یہ کیا گنتی سنا رہے تھے وہ تو صرف حب الوطنی سے سرشار تھا اور پاپا اس جذبے کو آلودہ کر رہے تھے اس نے کمرے کے اندر داخل ہونے کے لیے بڑھایا قدم روک لیا تھا پھر واپس کی طرف تھا اور انہوں نے دونوں کو اسے باتھ کے اشارے سے وہاں سے چلے جانے کو کہا تھا پھر چند منٹ بعد وہ اس کے پاس کھڑے مسکرا رہے تھے۔

"تمہاری ماں جس طرح کا دماغ رکھتی ہے اس میں ہمیشہ وہی خیال سیڑھی چڑھ سکتا ہے۔ جس کا ریشن اس سے بہتر لگے جیسا وہ خیال تھا اور ہر عورت حیثیت شناخت اور شان کی حسن کی حد تک پرورد ہوتی ہے کچھ عورتیں اسے برملا مانتی ہیں کچھ اسے قلبی الشعور کرتی ہیں تاکہ وہ ذرا اہسٹ کیٹگری میں آسکیں مگر میری سہولت یہ رہی کہ تمہاری ماما اس کا برملا اظہار کرتی ہیں تو مجھے انہیں دل سے راضی کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔"

وہ تھوڑا سا مسکرایا تو پاپا نے اس کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اسفندیار! میں تمہیں اپنے وطن کو عطیہ کر رہا ہوں کیونکہ جو میں اسے دے رہا ہوں اس نے اس سے کہیں زیادہ مجھے دیا ہے۔"

اس کی آنکھ شبنم بار ہو گئی اور اس کی آواز بھی بوجھل ہو گئی تھی اسفندیار آگے بڑھ کر پاپا کے سینے سے لگ گیا۔

☼ ☼ ☼

میں جب صحافت میں داخل ہوا تو میرے ذہن میں دور دور تک سچ کا علم بلند کرنے کا کوئی خیال نہیں تھا میں صرف اسے ایک نوکری کے سوا کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ جو مجھے ایک اچھی بیلنس شیٹ بنانے میں مددگار ثابت ہوتی تھی۔ میرے خواب میری تنخواہ سے بھی بہت بڑے تھے۔ اس لیے میں نے لفافہ کلچر کو سر جھکا کر سلام کیا تھا اور یوں میرے راستے کھلتے چلے گئے اور آج میں اپنے ہی اخبار کے ایک نیوز چینل میں ایک پروگرام ہوسٹ کر رہا ہوں میرا پروگرام "سچ بیانیاں" بہت تیزی سے مقبولیت کے گراف بنا رہا ہے یہ اور بات کہ یہ سچ بیانیاں صرف ان لوگوں کے لیے ہوتی ہیں جو من کے سچے اور تھوڑے کچے ہوتے ہیں اور ان لوگوں کے بارے میں ہوتی ہیں جن سے میری ڈیل فائنل نہیں ہو پاتی۔ مجھے یاد لگتے ہیں سو مجرمین کے ان فیورٹ ریٹ دینے کا مجھے بخوبی اندازہ ہے۔ بھی وہ سیاسی لوگ بھی ہوتے ہیں جو بزنس میں ہوتے ہیں بھی خود میری اپنی فیلڈ کے لوگ بھی سب لوگ مجھے چلتا پھرتا بم سمجھتے ہیں اور اس اہمیت کی قدر میرا دل خوب کرتا ہے۔

وہ لکھتے لکھتے ایک فون کال پر چونکا تھا۔

"ہیلو صبا آپا خیریت۔" وہ لمحہ بھر رک کر پھر بولا۔

"کیا ہوا عشی نے پھر کوئی پھڈا کیا ہے۔"

"وہ تو پاگل ہو گئی ہے تم جانتے ہو نا سمیع عرفات کو۔"

"جی ایک نمبر کا ٹھرکی ہے۔"

"وہ عشی اس سے محبت کرنے لگی ہے۔"

اور محبت کا لفظ آتے ہی وہ زور سے ہنس پڑا۔ "چھوڑیں صبا آپا آپ اینجل فرشتہ ہو سکتی ہیں مگر میں اور عشی بھی اینجل نہیں ہو سکتے اور شیطان کبھی محبت نہیں کرتا اگر محبت کا مزہ شیطان نے چکھا ہوتا تو

کبھی مردود نہ ہوتا۔ آپا! مجھے پتا ہے عفی صرف سمیع عرفات کی دولت ہتھیانے کے لیے یہ محبت کا ڈرامہ کر رہی ہے۔ سوری آپا! میری زبان ذرا تلخ ہوگئی ہے مگر آپ جانتی ہیں نا میں اپنی اور اس کی کلاس کو اچھی طرح محسوس کر سکتا ہوں۔"

"تم کچھ کرو۔"

"آپ بے فکر رہیں وہ خود کچھ ایسا کرے گا کہ عفی روتے ہوئے آپ سے آکر معافی مانگے گی۔ اپنی غلطی کی اور جو تیکھے مزاج کے بچے ہوتے ہیں نا" وہ روتے ہوئے بہت پیارے لگتے ہیں۔"

"تمہاری باتیں کبھی میری سمجھ میں نہیں آئیں۔" وہ ہنس پڑا تھا پھر آہستگی سے بولا تھا۔ "شکر کریں آپ کو میری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں ورنہ آپ اتنی ذہین ہیں کہ میری جگہ لے چکی ہوتیں۔" رکا پھر دھیما بولا۔

"آپ ذہین ہیں اور میں کمینگی کی حد تک چالاک۔ اس لیے آپ کے میرے اسکیل میں فرق ہے۔ آپ تو جانتی ہیں نا یہاں جو قابل ہے وہ ملازم اور جو چالاک ہے وہ حاکم۔ اعلا عہدے تنخواہ نہیں خریدے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے میں اپنی بیلنس شیٹ میں زیرو لگاتا جارہا ہوں۔ مستقبل میں بھی ایک ٹرسٹ بنانے اور کسی آفیشلی عہدے تک جانے کا ارادہ رکھتا ہوں تاکہ اپنے ماضی کو وائٹ کالر کر سکوں اور ٹرسٹ میرے سارے گناہوں کو دھو سکے۔"

"تم کتنا سوچتے ہو نا فرخ احمد۔"

"بس صبا آپا! اسی کی تو کھاتا ہوں۔" وہ رکا اور نرمی سے بولا۔

"آپ عفی کی فکر مت کیا کریں بس سمجھیے وہ میری ذمہ داری ہے۔"

"فرخ احمد۔" صبا آپا کی آواز میں واضح لرزش تھی۔

"آپ جو کچھ بھی ہیں ٹھیک کچھ بھی ہیں میں بچپن سے جانتا ہوں۔ ایک شیطان کے ساتھ ایک شیطان ہی چل سکتا ہے زہری الماں کی نخریلی طبیعت تو اس طرف سے بھی فکر نہ کریں اچھا خاصا فائدہ مند ہوں ان کے لیے وہ مجھے کسی بھی صورت میں لوز نہیں کرنا چاہیں گی۔"

"اچھا نہیں کہتے خالہ جان تم سے بہت محبت کرتی ہیں فرخ۔"

"وہ آپ کی خالہ جان سہی مگر میری امی جان ہیں اس لیے میں جانتا ہوں ان کی محبت کی حقیقت۔"

"بہت بدتمیز بچے ہو تم۔" صبا آپا نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

اور وہ ہنس پڑا۔ "بس کبھی غور نہیں کیا۔" پھر وہ فون رکھ کر اپنا آرٹیکل مکمل کرنے لگا اور وقت دھیرے دھیرے گزرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

وہ اس وقت مگن ہو کر کام میں مصروف تھا کہ اچانک ایک فون بیل پر وہ چونکا پھر یہ فون کئی دن تک آتا رہا یہاں تک کہ آج وہ اس فون کال سے کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گیا تھا۔ کافی نئی خبریں اس کے پاس تھیں وہ خود کو کمپوز نہیں کر پا رہا تھا۔ اچانک عفت جہانگیر آئی تو اس نے اپنی پریشانی کو خود سے جھٹک دیا تھا مگر عفت جہانگیر چالاک تھی فوراً بھانپ گئی۔

"کیا ہوا ہے؟ آپ آج بہت پریشان لگ رہے ہیں۔"

"نہیں کچھ خاص نہیں۔ بس ایک فون کال تھی کوئی مجھے بلیک میل کر رہا تھا۔ پتا نہیں اتنی خفیہ معلومات اسے کیسے ہو گئیں؟"

"آج کل دنیا بہت تیزی سے دائیں سے بائیں ہو رہی ہے سمیع! ہماری میڈیا میں کئی باتیں 'فون' سیل فون ہر طرح کی باتیں چھلنی میں سے گزر کر ہم تک آگئی ہیں تو جو لوگ ان معاملات سے متعلق ہوتے ہیں وہ کسی کی بھی معلومات کو اچھی قیمت پر بیچ دیتے ہیں ہاں بس اس کی قیمت آپ کے پبلک فگر ہونے سے بڑھتی گرتی رہتی ہے اور آپ تو اچھے خاصے مشہور انسان ہیں بزنس مین ہیں اسکالر بھی۔"

"ہاں مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے مگر فکر مت کرو میں ہینڈل کرلوں گا اسے۔" اور جب وہ یہ کہہ رہا تھا تب اچانک اس کے گلاس ڈور پر دستک ہوئی تھی۔

"کم اِن۔" سمیع عرفات نے ناگواری سے کہا تھا کیونکہ وہ ابھی کچھ وقت عفت جہانگیر کی کمپنی سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا اور کسی آنے والے نے یہ پلان ناکام بنا دیا تھا پھر دروازہ کھلا تھا اور سمیع عرفات کی سانسیں بے ترتیب ہو گئی تھیں۔

آنے والی ایک عام لڑکی تھی جس نے تنگ موری کی چست جینز اور بہت چھوٹا سا بلاؤز پہن رکھا تھا۔

"یہ پاکستان ہے محترمہ!" عفت جہانگیر نے سمیع عرفات سے بھی پہلے کہا اور وہ لڑکی اس بات پہ گھبرا گئی۔ سمیع عرفات کے چہرے پر اب ناگواری تھی۔

"عفت آپ میرے لیے کافی بنا کر لائیے۔"

عفت جہانگیر پیر پٹختی ہوئی باہر چلی گئی اور جب وہ کافی بنا کر واپس لوٹی تب تک اس کے پیروں سے زمین کھسک چکی تھی۔ وہ لڑکی سمیع عرفات کے بہت قریب بیٹھی ہوئی تھی۔

"یہ ایلی ہے آج سے میری پرسنل سیکریٹری ہے۔" اس کے ہاتھ سے چائے کی ٹرے چھوٹتے چھوٹتے بچی تھی۔

"یہ انگلش میں ایم اے ہے۔ فارن ڈیلی گیشن کے سامنے میرے لیے زیادہ اچھے طریقے سے کمیونی کیٹ کر سکے گی۔"

کھڑے کھڑے اس نے اس کی کم تعلیمی قابلیت کو جتا دیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے مگر اس نے پھر بھی اپنے آنسو بہنے نہیں دیے تھے جہانگیر نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا مگر وہ واش روم کی طرف بڑھتی چلی گئی تھی باقی ٹائم اس نے نارمل گزارا تھا۔

بہت سارے دن اسی طرح بے کیف گزرے تھے اپنی انسلٹ برداشت کر کے اپنی جگہ بناتے ہوئے مگر آج اتنے دن کی کاوش پر وہ پوری طرح سمیع عرفات کو ہار گئی تھی۔ اس نے لنچ ساتھ کرنے کو کہا تھا اور وہ ایلی کو ساتھ لے کر باہر چلا گیا تھا اس کی فرمائش پر۔

اتنے دنوں کے سارے آنسو جو تنہائی میں تکیہ بھگونے سے بچ گئے تھے بھرے آنکھوں میں بھر آئے تھے۔ آج وہ آفس ٹائمنگ سے پہلے اٹھ گئی تھی مگر آج صبا آپا نے بینک سے ہو کر آنے کا کہا تھا وہ سیدھی گھر پہنچی تھی۔ آپا نے حیرت سے دیکھا تھا۔ چھوٹی بہنوں نے بھی آج اس کی جلدی آمد کا نوٹس لیا تھا مگر وہ کسی سے بھی کچھ کہے بغیر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔

پھر کافی دیر بعد اس نے تنہائی سے تنگ آکر کسی کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو بچپن سے اس کا دوست تھا مگر جس سے کبھی اس کی دوستی نہیں ہوئی تھی مگر جس سے وہ بہت ساری باتیں شیئر کرلیتی تھی۔

"بولو عفی جی! آواز میں اتنا دکھ کیوں آگیا ہے؟"

اور وہ کچھ بولنے کے بجائے رونے لگی تھی۔ وہ کافی دیر تک تو اس کی ہچکیوں، سسکیوں سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر چڑ کے بولا۔

"یہ رونا دھونا معصوم لوگوں پر اچھا لگتا ہے تم جیسے اور مجھ جیسے لوگ روتے ہیں تو بڑی شرمندگی ہوتی ہے کیونکہ تم جیسے لوگوں کو جو تکلیف ملتی ہے ہماری ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے ملتی ہے اس لیے ہمیں رونا سوٹ نہیں کرتا۔"

"تم ایسے کیوں ہو؟" وہ چڑ گئی تھی۔

اور وہ ہنس کے بولا تھا۔ "اس لیے کہ میں بھی خود ترسی کا شکار نہیں ہوتا غلطی کرتا ہوں تو اسے مانتا ہوں اس غلطی پر مظلومیت کی، معصومیت کی گل کاری کرکے خود کو بھولا نہیں ثابت کرتا۔"

"تم بہت سفاک ہو۔" وہ چیخی تھی اور وہ نرمی سے بولا تھا۔

"تاتا۔ غصہ نہیں کرو۔ یہ بتاؤ ایسی افتاد کیا ٹوٹی ہے کہ تم جیسی لڑکی رونے لگی۔"

"تم ابھی مت کرو۔ آپا نے تمہیں سمیع عرفات کا تو بتایا ہو گا۔"

"مجھے تو انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔ لیکن کیا ہوا اس

کو؟"

"نہیں ماں جی نہیں سمجھیں کہ آپا جو تم سے ہر بات ڈسکس کرتی ہیں یہ بات نہیں ڈسکس کریں گی۔"

"اچھا! بابا... ہاں کی تھی انہوں نے یہ بات مجھ سے میں نے کہا تھا پریشان مت ہو لوٹ کے بدھو گھر کو ہی آئیں گے۔"

"تم ایسا کیسے کہہ سکتے ہو۔" وہ چونکی تھی اور اس نے اسی اطمینان سے کہا تھا۔

"ظاہر ہے وہ اپنی بزنس کمیونٹی میں ایک نمبر کا ٹھرکی مشہور ہے تو ایسے بندے سے یہی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ جلد کسی اور کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو جائے گا۔"

"مگر میرا دل۔" وہ تڑپی تھی تو وہ ہنس کر بولا تھا۔

"چل رہن دے میرے ساتھ یہ دل کی بات نہ کیا کر تو بھی جانتی ہے۔ میں بھی جانتا ہوں کہ ہمیں کبھی کسی سے محبت نہیں ہو سکتی۔ ہم دونوں فائدہ اور نقصان کی طرف بھاگنے والے عام سے لوگ ہیں محبت تو بڑا اعلا درجہ ہے زندگی کا۔"

وہ کچھ نہیں بولی تھی کیونکہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا اور وہ اس کی خاموشی کو محسوس کر کے بولا۔

"صبا آپا کی کمی محسوس کر رہی ہو نا۔ مجھے پتا ہے ایسے معرکے کے بعد دل کو ممتا بھری گود یاد آتی ہے۔ میری ماں کو تو یہ لفظ چھو کر بھی نہیں گزرا مگر صبا آپا ہیں نا۔ جب آئیں تو ان کی گود میں سر رکھ کر خوب رونا۔ معافی مانگنا اور پھر کبھی ان سے اختلاف مت کرنا کیونکہ میں نہیں چاہتا میری بیوی میری ماں جیسی بڑی بہن کی نافرمانی کرے۔"

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟" وہ یکدم بدک گئی تھی۔

"ہاں میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے کیونکہ میں جانتا ہوں تو ہی ہے زندگی گزارنے کا صحیح جوڑ۔"

"مجھے اتنی بدتمیزی سے بات کرنے والے آدمی سے رشتہ نہیں جوڑنا۔"

وہ روہانسی ہو کر بولی تھی اور وہ ہنس پڑا تھا۔

"دیکھو ایم اے جرنلزم ہوں۔ انگلش میں ماسٹرز کیا ہوا ہے پر خاص دوستوں سے ایسی گفتگو میں جو مزہ ہے وہ کہیں اور نہیں۔ رہا رومانٹک بھرے ڈائیلاگ، تو تم جانتی ہو میں کتنا صفائی کی حد تک صاف گو ہوں۔"

وہ چپ ہونے کے موڈ میں نہیں تھا تب اس نے فون بند کر دیا تھا۔ زبردستی مگر دو گھنٹے بعد تک جو صبا آپا گھر نہ پہنچیں اور کئی بار پر بھی وہ اپنا سیل فون نہ اٹھا رہی تھیں تو اس نے پھر فرخ احمد کو فون کیا تھا۔

"اچھا میں جا رہا ہوں اسی طرف ایک کام ہے۔ صبا آپا کے بینک کا چکر بھی لگا لوں گا۔"

اس نے جواباً کہا تھا۔

☆ ☆ ☆

آدھے گھنٹے بعد وہ صبا آپا کے سامنے تھا، دروازہ واچ مین نے ہی کھولا تھا مگر اس کے چہرے کے تاثرات اور اس کے ساتھ چپکے کھڑے شخص کی سین میں ناموزونیت۔ وہ چونکا پر اندر داخل ہو گیا عملہ سراسیمہ سا تھا۔

"صبا آپا! آج اتنی دیر کیوں لگا دی آپ کو تنخواہ نکلوانے میں۔ کتنی بار کہا ہے اے ٹی ایم کارڈ بنوا لیں مگر آپ بھی نا۔"

صبا آپا کا چہرہ ہونق سا ہو گیا۔ ایک لمحے میں اس کی سمجھ میں آ گیا کہ بینک لوٹا جا رہا تھا اور وہ غلطی سے اس ہنگامے کا حصہ بن گیا تھا۔

"جی میں آپ کا اکاؤنٹ ٹرانسفر کروا دیا ہے جی ابھی منیجر کے کمرے سے نکلا ہوں بس بیس منٹ میں گھر ہوں گا۔" مگر جب اس سے سیل فون چھنا تب اس کو علم ہوا وہ بینک میں محصور ہو چکا ہے۔ وہ اسفندیار جو ایڈونچر میں شامل ہونے کا خواہش مند تھا۔

"چپ کر کے بیٹھ جاؤ۔ ادھر کسی نے چوں بھی کی تو جان سے مار دوں گا۔"

اس نے پوری طرح سے جائزہ لیا ایک بہت خوش شکل سا شخص بیٹھا تھا مگر وہ بہت اداس لگ رہا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر کے وجیہہ شخص تھے ایک خاتون تھیں

اور ایک بہت تیز نظر رکھنے والا خوبرو لڑکا تھا اس وقت بینک میں بہت رش نہیں ہوتا تھا اکا دکا لوگ آیا کرتے تھے اس لیے ہجوم کے بجائے چند لوگوں کا قابو کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔

وہ صبا آپا سے کچھ فاصلے پر بیٹھا تھا اور اس کے بائیں طرف وہی نوجوان بیٹھا تھا جس کے ہاتھ سے سیل فون چھینا گیا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے۔"

"اسفندیار دلی۔"

"بابا خان سے تعلق ہے۔؟" وہ ہنسا تھا۔

"نہیں میرے پاپا معروف بزنس مین ولی افضل ہیں۔"

"آہستہ بولو تمہارے متعلق پتا چل گیا تو بینک ڈکیتی کے ساتھ تمہیں اغوا برائے تاوان میں اٹھا کر لے جائیں گے۔"

"میں کسی پرابلم سے نہیں ڈرتا۔"

"یعنی ابھی تمہارا زندگی سے تعارف پوری طرح نہیں ہوا۔ فرخ نے سے چھوٹے لگتے ہو۔"

اسفندیار پھر بولا۔

"کسی نے پولیس کو اطلاع دی؟" فرخ احمد نے اسفندیار سے پوچھا اور اسی لمحے اسی خوبرو شخص نے آہستگی سے اس کے کان میں جھک کر کہا۔

"انہوں نے سب سے پہلے پولیس الارم کو کٹ کیا ہے سارے فون شیپ منقطع کر دیے ہیں اور سارے سی سی فوٹیج کیمرے کے تار توڑ دیے ہیں۔"

"اتنی مہارت سے ہوا ہے یہ کام کہ کوئی کچھ نہیں کر سکا۔ میں جب منیجر کے کمرے میں اے سی دوسری بینک میں ٹرانسفر کروا رہا تھا تو منیجر کافی ہراساں لگ رہا تھا مگر صوفے پر بیٹھا ہوا شخص ڈاکو تھا مجھے اس کا دور دور تک وہم و گمان نہیں تھا اچھا خاصا کھاتے پیتے گھرانے کا شخص لگ رہا تھا۔"

"ہم بھی نا ڈاکو اب پرانے گیٹ اپ پر نہیں چلتے اب ایسے ہی اچھے ہیں۔ نقش کے لوگ ڈاکو ہوتے ہیں۔" اس نے اسفندیار کی ناسمجھی پر مسکراہٹ [illegible] اچھالا۔

"تم دونوں بہت باتیں کر رہے ہو ابھی میں تمہاری ہنسی ختم کرتا ہوں۔"

ایک ڈاکو نے اسفندیار اور فرخ احمد کو چھوڑ کر سلمان پر دھاوا بولا۔

"پلیز مجھے مت ماریں۔ میں بیمار آدمی ہوں۔" وہ ایک ہی ہاتھ پر بلبلا اٹھا تھا۔

"تمہیں بھی بیماری ہے مارنے کی۔" دوسرے نے کمر پر ہاتھ چلا دیا اور فرخ احمد نے کوٹ کی جیب میں رکھے نمبر A پر SAVD نام کو مہارت سے کال ملا دی۔ یہ مہارت اسے رپورٹنگ کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی۔ کچھ لمحے پہلے اس کے اندر حب الوطنی کے جیسے کسی جذبے نے سر ابھارا تھا اس لیے اس نے اپنے چینل کے نیوز ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ کو کال ملا دی تھی۔

"کون ہے؟"

"اسفند! بینک XZ کی کون سی برانچ ہے۔" اسفند نے برانچ بتائی اور وہ بڑبڑایا۔ "پتا نہیں آخر کب تک ہمیں یہاں محصور رہنا پڑے گا۔"

"بریکنگ نیوز پر ڈالو XZ برانچ میں ڈکیتی 5 افراد ہیں یرغمال۔"

"میں نے پولیس کو فون کر دیا ہے پانچ منٹ میں وہاں نفری پہنچنے والی ہے۔" کسی اور شخص نے اطلاع دی اور ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ نے اسے شاباش دی۔

"ذرا جلدی سے نیوز الرٹ کرو خبر کو بریک تھرو ہم دیں گے کہ ابتدائی شام کے حصے میں کیسے ڈکیتی ہو رہی ہے؟"

"تھانے کے انچارج کا نام بھی ڈال دینا بہت ایمان داری کے راگ الاپتا ہے اپنے بارے میں۔" پورے نیوز روم میں افراتفری مچ گئی تھی۔

"آپ کو لگتا ہے سر! ہم کچھ غلط نہیں کرنے جا رہے۔" احمد ظفر کے جونیئر نے اس کی طرف سوال اچھالا۔

"کیونکہ تمہیں یہ غلط کیوں لگ رہا ہے؟" اس نے

ابرو ترچھے کر کے اسے دیکھا اور اس نے نرمی سے کہا۔
"ام بھی جو کچھ تھا عارضی طور پر تھا۔ فعال تھے وہ سب۔ لیکن میڈیا اور پولیس کی شمولیت سے معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔ سر اگر کسی کی جان چلی گئی تو۔"
"تو کیا حکومت ہے نا ایک 'دو لاکھ انعام' دے ہی دے گی 'چیک باؤنس' ہو جائے تب بھی حکومت بہت حد تک وائٹ کالر رہے گی، پھر اگر یہ کوئی اور خبر بریک کرتا تو کیا وہ یہ سب کچھ سوچتا، پھر میں کیوں سوچوں اپنے کیریئر کے لیے کوئی تہلکہ خیز خبر چاہیے۔"
خبر بریک ہو چکی تھی اور سب اپنے اپنے گھروں کے مختلف ماحول اور کلاس کے باوجود ایک ہی طرح کی سراسیمگی میں آ گئے تھے، ہاں مگر ان کرداروں سے جڑے لوگ سب سے زیادہ ہراساں ہو گئے تھے۔
عفت جہانگیر فون کر رہی تھی مگر فرخ احمد کا نمبر بزی جا رہا تھا۔
"تمہیں پتا ہے تمہاری بہن تم سے کتنی محبت کرتی ہے۔" آج ہی تو فرخ احمد نے اس کے دل کی اور ہاتھ کی [illegible] تمہیں اگر ایسی کوئی بہن ہوتی تو شاید میں ایسا نہیں ہوتا جیسا اب ہوں۔"
"تمہیں پتا ہے اماں! صرف اسی بچے کو بہت زیادہ اہمیت دیتی تھیں جو ان کے بعد گھر کے لیے بہت اچھا معاون و مددگار ثابت ہوتا تھا، پہلے میں نے ان باتوں کو اہمیت نہیں دی، مگر پھر جب یہ کلیہ سمجھ میں آیا، محبت کا تو میں نے بس پیسہ ہی کمانے کو ضروری سمجھا، پھر کبھی پلٹ کر محبت کے جذبے کو نہیں چکھا، سوائے صبا آپا کے میرے لیے محبت اور کہیں نہیں ہے۔ تمہیں پتا ہے صبا آپا کی منگنی کتنے عرصے رہی تھی؟"
"وہ منگنی بھی صبا آپا کی؟ کب؟ مجھے تو کسی نے کچھ نہیں بتایا۔" وہ حیران ہوئی تھی۔
"جب تم دوسری میں پڑھتی تھیں تب ہوئی تھی صبا آپا کی منگنی، مگر انکل کی گھر کی طرف سے بے توجہی اور خالہ جان کی ناگہانی موت نے انہیں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کیا۔ اظفر بھائی سات سال تک ان کا انتظار کر کے اپنا گھر بسانے پر مجبور ہوئے تھے۔ کوئی کرتا ہے ایسا عفت! اگر تم اپنی بہن کے جذبات میں ڈوبے ہوئے ایک پل میں جا کر سانس بھی لے لو تو تمہارا دم گھٹ جائے گا اور اپنے گھر، اپنے جیون ساتھی کے خیال سے مہکتے ایسے ہزاروں پل انہوں نے لاکھوں دنوں میں سمیٹ کر زندگی کو خالی لوٹائے ہیں۔"
"وہ آ جائیں گی تو میں ان سے معافی مانگ لوں گی۔"
"اور مجھ سے کیا مانگو گی؟ ابھی سے بتا دو، تاکہ ساتھ لیتا آؤں صبا آپا کو۔"
"پلیز اس مت کرو۔" اس نے غصہ دکھایا تھا اور اس نے کہا تھا۔
"آج کچھ مت پکانا، کیونکہ آج تم جو کھانا پکاؤ گی نمکین ہی ہو گا، تمہارے رونے دھونے کی وجہ سے۔" وہ رکا اور پھر بولا۔
"میں کھانا ریسٹورنٹ سے لے آؤں گا۔ اچھا اب بند کرتا ہوں، سگنل [illegible] گیا ہے۔"
یہ فون اس نے گھر کے راستے میں کیا تھا، کہا تھا اور اب وہ خود کتنا تنہا محسوس کر رہی تھی، صرف وہی باتیں تو تھیں جو اسے ماں باپ کی محبت سے، صبا آپا کے ہاتھ پکڑا کر رہ گئی تھیں ورنہ تو وہ بس ان کے لیے کھانے پینے اور سگریٹ کی فراہمی کے ایک ذریعے کے علاوہ کچھ نہیں تھیں۔ دونوں چھوٹی بہنیں رو رو کر پریشان ہو رہی تھیں۔ فرخ احمد کا پتا چلا تو خالہ کا پورا گھرانہ بھی ان کے گھر آ گیا تھا۔

☆☆☆

"مجھے آج سے پہلے پتا ہی نہیں تھا کہ حمید الدین کی اہمیت میرے لیے سر پر تنے سائے دار درخت کی طرح ہے۔ ایک عورت دنیا فتح کر لے، مگر وہ اپنے شوہر کے ہونے سے ہی ایک معتبر حوالہ بنتی ہے اور میں ہمیشہ اس بات سے بھاگتی اور اس خیال کو ٹھکراتی آ رہی تھی، وہ جوان بچوں کی ماں ہونے کی اتراہٹ مجھے پیر زمین پر رکھنے نہیں دیتی تھی کہ میں گھر اور بچے جس وجود کا انعکاس تھے میں نے اسے ہمیشہ گھر میں کسی اجنبی سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ دونوں بچوں کے اندر میں نے کبھی اپنے شوہر کی محبت کی مٹھاس نہیں ڈالی، یہی وجہ تھی کہ وہ دونوں بچے ہمیشہ اپنے باپ سے ایک مخصوص فاصلہ پر رہے۔ میں نے بیوی کی حیثیت سے انہیں زندگی میں لڑائی جھگڑے اور تنہائی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ لیکن کیا ایسا ممکن ہے، میں وقت کو واپس لوٹا سکوں اور اپنی ساری غلطیوں، اپنی ساری نادانیوں کو ایک محبت کے احساس سے مٹا سکوں، شریک کا ساتھ عمر کی آدھی دوپہر میں زیادہ ضروری اور زیادہ مٹھاس بھرا احساس بن جاتا ہے۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکی، مجھے پتا ہے کفران نعمت کرنے والے ہمیشہ ایسے ہی راندہ درگاہ رہتے ہیں۔ مگر اک خوش گمانی ہے کہ شاید شرف قبولیت اور توبہ کا در ابھی کھلا ہو۔"
صفیہ جائے نماز پر بیٹھی تھیں اور حمید الدین صاحب کا چھوٹا بیٹا خبر کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔
"مجھے آج سے پہلے پتا ہی نہیں چلا تھا کس پوائنٹ پر رکھی دوسری طرف کھڑے شخص کی جان کتنی ضروری ہے، میں نے تو صرف شارٹ کٹ مارا تھا۔ [illegible] اور اپنی پاکٹ منی کو اضافی طور پر سہارا دینے کے لیے [illegible] تھا۔ مگر آج کیا ہوا تھا۔" اس کا یہ عمل اسی کی طرف لوٹا دیا گیا تھا، نیک لوگوں کی طرح اس کے عمل بد کا پورا پورا حساب کھول دیا گیا تھا۔ وہ بے قرار پھر رہا تھا، پھر یک دم صفیہ بیگم کی گود میں سر رکھ کر رونے لگا تھا۔
"اللہ کہتا ہے جو گناہ جس نے کیا اس کا عذاب بھی اسے ملے گا، پھر پاپا کو کیوں محصور ہونا پڑا؟ اگر آج پاپا کو کچھ ہوا تو میں اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکوں گا۔"
صفیہ بیگم کچھ بھی نہیں بولیں اور وہ سراپائی انداز میں اپنی سرگرمیوں کی بابت بولتا چلا گیا۔
"صفیہ! تم نے اپنی راہ خود کھوئی کی، کسی نیکی کے راستے پر چلنے میں پہل کرنے کی عادت ڈالی ہوتی تو میرا یہ بچہ اس جرم کی دنیا میں قدم نہیں دھرتا۔"
"پاپا کو کچھ نہیں ہو گا۔ اللہ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ تم نے برائی کو برائی مان لیا ہے تو توبہ بھی کر لو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
"لیکن بھا! میں آپ کے سامنے قسم کھا کر کہتا ہوں، اللہ تعالیٰ کے کسی بندے کو ناحق نہیں ستاؤں گا، بس میرے پاپا کو واپس کر دیں۔"
"بس فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا، میں میڈیا اور پولیس سے رابطے میں ہوں، ابھی تک پولیس نے کارروائی نہیں شروع کی ہے۔ صرف بات چیت سے معاملہ حل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔"
وہ آنسو صاف کرنے لگا تھا، آج اسے لگا تھا ایک واقعہ کیسے زندگی بدل سکتا ہے، لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس ایک واقعہ نے کتنے لوگوں کی سوچ کا زاویہ بدل دیا تھا۔

☆☆☆

"مجھے نہیں معلوم آپ کس سے بات کریں، مجھے میرا اسفند یار چاہیے۔"
"اسے کچھ نہیں ہو گا، وہ اللہ کی راہ میں دی ہوئی روح ہے، اس کی حفاظت اللہ بہتر طور پر کرے گا۔"
"مجھے نہیں پتا، آپ کا ہو گا اتنا صبر، مگر مجھے میرا بیٹا چاہیے۔ بس ہو گیا فیصلہ، وہ فوج میں نہیں جائے گا۔"
"ام بھی جو کچھ ہوا، وہ فوج میں ہونے کی وجہ سے ہوا ہے؟ ایک عام شہری ہے، اس وقت [illegible] اللہ تعالیٰ تمہیں جتانا چاہتے ہیں کہ وہ جب چاہیں زندگی کو دائیں سے بائیں، اوپر سے نیچے کر سکتے ہیں، اس نقطے کو سمجھو۔"
ماں ایک دم کسی چابی کے کھلونے کی طرح رک گئی تھیں۔ "کیا واقعی یہ میرا امتحان ہے یا میرے صبر کو تقویت دینے کا ایک بہانہ، کیا چاہتا ہے اللہ مجھ سے۔"
"جو لوگ اپنی جان، اپنا مال سب اس اللہ کو سونپ دیتے ہیں وہ کبھی مایوس ہو کر نہیں مرتے، بیٹا! اللہ ان کی بہتر خبر گیری کرتا ہے، ان کے دکھ میں ان کو دلاسا دیتا ہے جیسے ایک ماں اپنے دکھی اور آزردہ بچے کو دلاسے سے سمیٹ لیتی ہے، تم بھی اس کا دامن تھامو، اس سے ناامید کبھی مایوس ہو کر نہیں پلٹو گی۔"
یہ ان کے ابا کے جملے تھے جو اچانک اس حالت جانکنی میں اندر سے نکل کر دل کے اندر مکالمہ کرنے لگے تھے۔

"میڈیا تک خبر کیسے پہنچی؟ یہ باوثوق ذرائع کون ہے؟" ان کے لیڈر نے پولیس کے سائرن سننے کے باوجود اطمینان سے پوچھا تھا۔ فرخ احمد نے بہت خاموشی سے اپنے آفس کارڈ کو ڈسٹ بن کی نذر کیا تھا۔ مگر اسی وقت اسی سوال کرتے شخص کا موبائل بجا تھا وہ سنتا رہا تھا اور بہت تفصیل سے سن کر غصے سے پھنکار کر بولا تھا۔

"تم میں سے فرخ احمد کون ہے؟ اس کے چینل نے یہ خبر سب سے پہلے بریک کی ہے اور اتنی مہارت کے بعد یہ کیسے ہوا ہم پہلے صرف ڈکیتی کے بعد چلے جاتے مگر اب اس فنکار کو سات سلام کرنا ہم پر فرض ہو چکا ہے۔" اس نے آفس کے سارے عملے کو اگلی دروازے کی سمت بنی ہوئی انتظار گاہ میں جمع کر دیا تھا۔

"سارے بلائنڈز ہٹا دو' تاکہ پولیس کو پتا چلے کہ اگر اس نے کوئی کارروائی کی تو یہاں کوئی نہیں بچے گا۔" فرخ احمد نے گنا ایک' دو' تین' چار' پانچ' چھ ہوئے۔ چھ افراد تھے۔ باہر کھڑا دربان کو بھی گرا کر اندر لے آیا تھا۔ سب کے ہاتھوں میں ریوالور تھے لوڈ۔

"ہم اگر کوئی کارروائی کریں تو ہم پندرہ افراد ہیں' پھر بھی فگر میں ان سے زیادہ ہیں۔" اسفندیار نے کان میں گھس کر کہا اور وہ موقعے کے باوجود گھور کے رہ گیا۔

"افراد پندرہ سہی' مگر ہر ریوالور میں چھ گولیاں ہیں اور بندے سات۔"

"گولیاں ختم نہیں ہوں گی۔ ہم ختم ہو جائیں گے۔"

"جو ڈر گیا وہ مر گیا۔"

"ہاں۔ میں نے بھی دیکھی تھی یہ فلم" ایک دم بکواس تھی تمہارے آئیڈیے کی طرح۔"

"میں نے پوچھا ہے۔ تم میں سے فرخ احمد کون ہے؟"

صبا آپا نے سر جھکا لیا تھا کہ ان کی نظر کا زاویہ اس کے لیے پرابلم نہ کھڑی کر دے۔ مگر انہیں حیرت ہوئی تھی جب فرخ احمد کے ساتھ کھڑا نوجوان ایک نہیں دو نہیں پورے سات قدم آگے کھڑا ہو گیا تھا۔

"میں ہوں فرخ احمد۔ بولو کیا کرو گے؟" اس نے اس کی طرف ریوالور تان لیا تھا۔

"ایک کو مارنے کی سزا بھی موت اور پندرہ کو مارنے کی سزا بھی موت۔ مگر میں تمہیں ماروں گا نہیں۔ تمہیں اپنے لیے استعمال کروں گا ہم تم سمیت یہاں سے زندہ جائیں گے۔"

"خوش خیالی ہے تمہاری۔" اسفندیار نے نڈر ہو کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور کہا۔ فرخ احمد کے دل کو اچانک کچھ ہوا تھا۔

"کیا زندگی صرف پیسہ ہے؟ صرف نام نمود اور شہرت؟ اگر آج میں ان لوگوں کے ساتھ مرتا ہوں تو میرا نیوز چینل مجھ پر سیاست ضرور کرے گا۔ ہو سکتا ہے کوئی بینیفٹ بھی دلوا دے حکومت سے' مگر کیا وہ میرے نامۂ اعمال میں ایک ناکام اور کرپٹ انسان کی شہرت کو آب زم زم سے دھو سکے گا؟ میں اپنے ساتھ کیا لے کر جا رہا ہوں؟ خالی ہاتھ' صرف خالی ہاتھ۔" وہ ایک دم ہراساں ہو گیا تھا۔

"یہ لڑکا اسے کوئی ڈر نہیں ہے اسے پتا نہیں کیا چیز ہے' جو اتنا نڈر بنا رہی ہے۔ اسے کس کا آسرا ہے؟ کس بات کا یقین ہے۔"

"تم نہیں جانتے ہو' مگر مجھے اپنی جان' کبھی بھی اپنے اصولوں سے زیادہ پیاری نہیں رہی ہے۔ میں وردی کے بغیر بھی ایک مجاہد ہوں اور وردی کے ساتھ تو میرے عزائم موت سے بھی شکست نہیں کھا سکتے' کیونکہ ہم جان کی بازی ہار بھی جائیں تو بہت سی آنکھیں ان خوابوں کو اپنے اندر جگہ دے کر ان کی تکمیل میں آگے بڑھ جاتی ہیں۔"

"خالی پیلی بھاشن۔" سامنے کھڑے شخص نے پوری قوت سے تھپڑ مارا تھا۔ وہ ہلا تھا مگر اسی مضبوطی سے ایستادہ تھا۔

اور کونے میں سمٹے بیٹھے سلمان احمد نے سوچا تھا۔ "ماہ نور نے ان کے اندر کتنی توجہ' کتنی چاہت سے' محبت کا کتنا اعتماد والا انقلاب زندگی ساتھ ساتھ گزارنے کے خواب پروئے تھے۔ مگر آج سے پہلے وہ لفظ اس طرح سے اثر انداز نہیں ہوئے تھے۔

زندگی کی قدر موت کے جانے پر پہنچنے سے پہلے واقعی کبھی نہیں ہوتی۔ بڑی سے بڑی بیماری سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر دل میں زندہ رہنے کی امنگ اور مقابلہ کرنے کی مزاحمت کرنے کی لگن ہو۔ ہر موت موت تو بہت اچانک کبھی بھی کسی بھی لمحے وارد ہو سکتی ہے جیسے کہ آج۔ کیا آج وہ اپنی بیماری سے مرنے والے تھے یا ایک حادثاتی لمحے کی وجہ سے۔

"کاش مجھے بہت سارا وقت ملتا اور میں اپنی ماہ نور' اپنے گھر والوں کے ساتھ گزار تک۔" انہوں نے دل سے دعا کی تھی۔

پولیس پوزیشن لے چکی تھی اور اعلان کر رہی تھی "سب یرغمالیوں کو باحفاظت چھوڑ دیا جائے تو ان کے ساتھ نرمی کا فیصلہ کیا جائے گا۔"

اس کے پاس نے تھانے کے انچارج کو فون کیا تھا [illegible]

"ہمیں ایک گاڑی فل پٹرول کے اور محفوظ راستہ دیا جائے ورنہ سارے عملے اور ان شہریوں کو مار دیا جائے گا۔"

"تم میڈیا کو بولو ہمارا ساتھ دیں۔" ڈاکوؤں کے لیڈر نے اسفندیار کو موبائل دیا تھا اور وہ نڈر انداز میں بولا تھا۔ "آپ کو جھکنے اور ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہماری فکر مت کریں' ان کو کاؤنٹر کریں سب کا۔"

کوتا جملہ باہر نشر ہوا تھا۔ کوتا بینک میں گونج کر رہ گیا تھا اور گینگ لیڈر نے اسفندیار کو تھپڑ جڑ دیا تھا۔

"ہمارا ان کاؤنٹر کرے گا' ہمارا؟" ریوالور کا رخ بالکل اس کی طرف تھا۔ باقی لوگ الگ الگ جگہ پوزیشن سنبھالے ہوئے تھے۔ بینک کے پچھلے دروازے سے لے کر ایسی ہر جگہ کو کور کر لیا گیا تھا کہ جہاں سے کارروائی کی امید کی جا سکتی تھی۔ مین بینک کی انتظار گاہ میں صرف تین افراد پوزیشن سنبھالے کھڑے تھے۔

فرخ احمد نے تیزی سے سوچا تھا' بنا سوچے سمجھے گلدان اٹھا کر اسفندیار کو لوٹ کے شخص کے سر پر مارا تھا۔ اسفندیار کے سامنے گن پوائنٹنگ کے گلاس پر ایکشن لیا اور فرخ احمد کا عکس دیکھ کر جوابی ہی چھلانگ اسے بچائی تھی۔ کیونکہ گلدان لگنے سے اس کے سر میں ٹریگر پر دباؤ پڑا تھا اور گولی بر آمد ہوئی تھی۔ گولی بینک کے فرش پر لگی تھی۔ اسفندیار نے مجرم کو موقع نہیں دیا تھا۔ اور اپنے کنگ فو کے جوہر دکھا کر چھاپنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہوا تھا۔

"آپ سب کاؤنٹر کے پیچھے جائیں۔" واچ مین اور فرخ احمد نے مورچہ سنبھال لیا تھا۔ باقی دونوں مجرموں نے فائرنگ کی تھی۔ مگر کیونکہ وہ یہ کارروائی گھبراہٹ میں کر رہے تھے۔ اس لیے وہ اس سچویشن کو سنبھال نہیں پا رہے تھے اور اس سے پہلے کہ اندرونی جگہوں پر مورچے سنبھالے افراد یہاں آ جاتے انہیں تیزی سے کچھ کرنا تھا۔ فرخ احمد اور اسفندیار نے ایک ساتھ گلدان کو اٹھا کر گلاس وال پر کھینچ کر مارا تھا۔ ان میں سے کسی کی بھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ مگر جب اسی مقام پر دوبارہ [illegible]

"تمہیں کیا لگتا ہے وہ تمہارے ہوتے ہوئے یہاں اسٹریٹ فائر کریں گے۔"

"نہیں' مگر وہ عقل مند ہوئے تو میری بات اچھی

طرح سمجھ جائیں گے۔"
وہ خود نہیں سمجھ پایا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ مگر جب اسموک بم اندر آنے لگے تو وہ مطمئن ہو گیا۔ پورا کمرہ دھوئیں سے بھر گیا تھا اور یہ چند منٹ بہت اہم تھے۔ گلاس ڈور توڑا جا چکا تھا اور دوسرے مورچوں پر فائرنگ کے خطر اور مزاحمت کرتے ہوئے سارے ڈاکو مقابلے کے بعد گرفتار کیے جا چکے تھے۔
"مسٹر فرخ احمد! یہ سب آپ کی کمال بہادری ہے ورنہ یہ معاملہ نمٹانا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ میں ان افراد کو "سیف وے" دینے کا آرڈر کرنے ہی والا تھا۔ مجھے حکم تھا انہیں راستے میں مار گرانے کی کوشش کی جائے۔ انہیں جو گاڑی دی جانی تھی اس میں ٹریکر سسٹم آن تھا مگر سر! آپ واقعی کمال ہیں۔"
"ہاں مگر یہ سب اس نوجوان کی وجہ سے ہے جس نے آج میری سمت درست کی۔ مجھے خالی ہاتھ مر جانے سے بچالیا۔"
"جی سر! میں سمجھا نہیں سر؟" افسر نے کم فہمی سے دیکھا اور وہ مسکرا دیا۔ "آپ سب کچھ مجھ سے لے لو ہمارا کام کیسے چلے گا سب۔"
"جی!" افسر جا چکا تھا۔
کسی نے اسفندیار کو گلے سے لگایا تھا۔ "تم فوج میں ہی جاؤ گے بس فیصلہ ہو گیا آج۔"
"سچ ماما!" اسفندیار نے ان کی طرف دیکھا تھا۔
"ہاں زندگی کو جیسا تم جینا چاہتے ہو جیو۔"
وہ ان کے ساتھ گاڑی کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ مسٹر حمید اللہ بن تھکے ہوئے قدموں سے چل رہے تھے، جب ان کے سیل پر صفیہ بیگم کی کال آئی تھی۔
"خدا کا شکر ہے، آپ ٹھیک ہیں حمید! مجھے آج احساس ہوا ہے۔ آپ میرے لیے کتنے اہم اور ضروری ہیں۔"
"ماما ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ پاپا آپ واقعی ہماری زندگی کا ڈائنمو ہیں، سب کچھ آپ کے دم سے ہے۔"

"پاپا آئی لو یو۔" کوئی بہت قریب سے پکارا تھا۔ انہوں نے دیکھا۔ یہ ان کا بڑا بیٹا تھا۔ انہوں نے لپک کر اپنے بیٹے سے لگایا تھا اور زندگی میں پہلی بار محبت کو اثر پذیر ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے۔
اور ایک سائیڈ پر سلمان تھے۔ ماہ نور سے کہہ رہے تھے۔ "زندگی کی قدر موت کی قربت کے احساس سے پہلے کبھی نہیں ہو پائی۔ مجھے تمہارے ساتھ بہت سارا جینا ہے ماہ۔"
"مجھے بھی آپ کے ساتھ بہت سارا جینا ہے سلمان۔" اور فرخ احمد گاڑی میں بیٹھا صبا آپا کی پروا کیے بغیر بولا تھا۔ "آ رہا ہوں تمہاری تمام تر بددعاؤں کے باوجود زندہ بچ کر اور ہاں تمہاری آپا بھی ساتھ ہیں۔ سنو! استقبال ذرا شاندار کرنا۔ آخر کو تمہارا ہونے والا مجازی خدا ہوں۔"
دوسری طرف کچھ نہیں کہا گیا۔ شرمگیں ہنسی کے سوا کچھ سنائی نہیں دیا تھا۔ فرخ احمد فون بند کر چکا تھا اور صبا آپا نے پوچھا تھا۔ "تمہارا پیغام کیسے آیا؟"
"بس آپ کا حکم تھا، سو ہوم ورک مکمل کر کے پلان کیا اور اس کے ساتھ شروع کیا تھا۔ مجھے پتا تھا یہ عشق کی آگ ہے۔ تھوڑا سنکی بھی اس لیے بلیک میلنگ سے شاید بات نہ بنے۔ سو میں نے شیطان کا کبھی ناکام نہ ہونے والا ہتھیار استعمال کیا۔ اس لڑکی کو نوکری کی تلاش تھی۔ اس کا تازہ تازہ بریک اپ ہوا تھا تو مجھے اسے CHIL کرنے کے لیے سچ عرفات کا پتا دینا پڑا تھا اور میرا پلان ہی کامیاب رہا۔ بہت جلدی سب کچھ ہمارے حق میں چلا گیا۔"
صبا آپا مسکرانے لگیں اور زندگی اسی مسکراہٹ کو محبت کے قالب میں ڈھالتی آگے بڑھ گئی تھی۔ آگے کا راستہ بالکل صاف، شفاف اور خوش گمانیوں سے بھرا تھا۔ خوش گمانیاں جو کبھی کبھی سچ بھی ثابت ہو جاتی ہیں۔

ہولناک خبر سے دماغ کو جھٹکا لگا تھا وہیں ان کے ہاتھ پاؤں کانپ کے رہ گئے تھے۔

"سردار بیگم ــــ!" رجائی ان کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

"کہاں ہے داد بخش؟" ان کی چپ ٹوٹی تھی۔

"ہسپتال لے گئے ہیں' بتارہے تھے بہت خون بہہ رہا تھا' پنڈی کی طرف آنے والی سڑک اس کے خون سے لال ہو چکی ہے۔"

"بس کر رجائی! ہمارا کلیجہ نہ کاٹ۔" سردار بیگم کا دل لرزنے لگا تھا انہوں نے ہاتھ اٹھا کر رجائی کو روک دیا۔

"معافی چاہتی ہوں سردار بیگم! پر میں نے جو سنا وہی آکر بتایا ہے۔" رجائی کھسک گئی اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ واقعی ان کے دل پر وار کیے جارہی تھی۔

"اکبر سے کہو گاڑی نکالے میں بھی ہسپتال جاؤں گی۔" انہوں نے تخت سے پاؤں نیچے اتارتے ہوئے کہا۔

"صہباء کہاں ہے؟" انہوں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"جی وہ تو شاید سو رہی ہیں۔"

"اتنی بے خبر سو رہی ہے؟" سردار بیگم کو صہباء کی گہری اور بے خبر نیند کا سن کر تعجب ہوا تھا۔

"ہمیں بھی بے خبر سوئی تھی۔" رجائی افسوس سے بولی۔

"اللہ خیر کرے' منحوس کیسی بدفالیں بک رہی ہے' جا دفع ہو۔" سردار بیگم کو غصہ آگیا تھا رجائی مسلسل ان کا دل دہلائے جارہی تھی۔

وہ وہاں سے ہٹ گئی تھی اور سردار بیگم اپنی چادر وغیرہ نکالنے لگیں' رجائی ان کو غصہ نہ دلاتی تو یہ کام اس نے ہی کرنا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنے کمرے سے باہر آئیں تو باہر سے سب ہی ان کے منتظر بیٹھے تھے۔ سب سے پہلے بانو اور نگار آگے بڑھی تھیں۔

"دادی بیگم! داد بخش ــــ؟" بانو کا لہجہ متفکر تھا۔

"کچھ نہیں ہو گا داد بخش کو' بس اللہ سے اس کی زندگی کی دعا مانگو' وہ دعائیں قبول کرنے والا ہے۔"

انہوں نے خود کو مضبوط ظاہر کرتے ہوئے اپنی پوتی کو تسلی دی تھی' حالانکہ داد بخش کی حالت کا سن کر ان کے حوصلے خود ریت کی مانند بکھر رہے تھے اگر داد بخش کو کچھ ہو جاتا تو وہ یقیناً "کچی مٹی سے بنی دیوار کی طرح ڈھے جاتیں۔ ان کی شخصیت کی بلند و بالا عمارت داد بخش کے سہارے ہی تو کھڑی تھی۔ داد بخش ان کی زندگی کا سرمایہ تھا ــــ ان کی عمر بھر کی کمائی اور کون شخص اپنی کمائی اور اپنا سرمایہ لٹتے دیکھ سکتا ہے؟

ان کے دل کے ایک کونے سے اگر داد بخش کی زندگی کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں تو دل کے دوسرے کونے سے غم و غصے کی آگ لپک رہی تھی۔

"اس پہ گولی کس نے چلائی؟" نگار کو تجسس ہو رہا تھا۔

"یہ تو پتہ نہیں چلا بی بی جی' سڑک کے قریب جھاڑیوں میں سے چھپ کر فائر کیے گئے تھے۔ ہم لوگ دور ہی کھیتوں میں کام کر رہے تھے فائر کی آواز سن کر سڑک کی طرف بھاگے تو پتہ چلا داد بخش کو گولی لگی ہے' وہ اپنی گاڑی کے قریب سڑک پہ گرا ہوا تھا۔"

ان کے گاؤں کے ایک کسان نے ساری بات بتائی۔ داد بخش کو گولی لگنے والی اطلاع اسی نے آکر دی تھی اور ابھی تک سردار بیگم کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔

"میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ گولی کس نے چلائی ہے' چلو رجائی!" انہوں نے کہتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے۔

"لیکن دادی بیگم! وہ صہباء ــــ؟" بانو بے ساختہ بولی تھی۔

"ہماری واپسی تک وہ اپنی بے خبری کا ماتم کرے گی' باقی کا ماتم آکر سنبھالیں گے۔" سردار بیگم صہباء کو سمجھا کر رجائی کے ساتھ باہر نکل گئیں اور رفتہ رفتہ سب

بھی لاؤنج سے ہٹ گئے تھے صرف صہباء اور مہر نگار ہی رہ گئی تھیں۔

"کیا بے داد بخش کا بچ گیا یا چلا گیا؟" ہاجرہ بیگم بھی آ گئیں۔ ان کے طنزیہ لہجے پہ ان دونوں کو بہت غصہ آیا تھا۔

"اللہ نے چاہا تو وہ ٹھیک ہی ہو گا۔" بانو چبا کر بولی تھی۔

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن اگر وقت ہی آگیا ہو تو کیا کیا جا سکتا ہے۔" ہاجرہ بیگم بے رحمی سے بولی تھیں۔

"آپ کو یہ سب کہتے ہوئے اللہ سے خوف نہیں آ رہا؟" نگار نے آنکھیں پھیلا کر دیکھا۔

"ارے کیوں بھئی؟ ایسا کیا غلط کہہ دیا میں نے؟" وہ انجان بن کر بولیں۔

"غلط تو آپ نے نہیں کہا لیکن اس وقت ہم یہاں بیٹھ کر کسی دوسرے کی موت و زندگی کی باتیں کر رہے ہیں ہم میں سے کسی کو نہیں پتا کہ ہمارے پاس کتنا وقت ہے۔" ہاجرہ بیگم پیچ و تاب کھا کر رہ گئیں۔

"کیسی بدفالیں منہ سے نکل رہی ہو' میں آج ہی سردار بیگم سے بات کروں گی۔"

"پھر تو مجھے بھی دادی بیگم کو بتانا پڑے گا کہ آپ داد بخش کے بارے میں کیسے سفاک خیالات رکھتی ہیں؟"

نگار آج جان بوجھ کر صہباء کا انداز اپنا کر بولی تھی اور واقعی ہاجرہ بیگم ایک سیکنڈ میں سیدھی ہو گئی۔

"میں بھلا داد بخش کے بارے میں ایسے خیالات کیوں رکھوں گی؟ اتنا اچھا' اتنا سعادت مند تو ہے وہ ــــ؟" ہاجرہ بیگم نے فوراً "پینترا بدلا ــــ

"یہی بات تو ہم آپ کو سمجھاتے ہیں' خیر آپ داد بخش کی زندگی کے لیے دعا کیجئے۔ لیکن "دل سے"" نگار کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ہسپتال میں گاؤں کا بہت سے لوگ جمع تھے اور

ابھی کی نوابیں پہ داد بخش کی زندگی کے لیے دعا تھی۔ جیسے ہی سردار بیگم ہسپتال پہنچیں وہ سب ان کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے تھے اور احترام سے سلام کیا تھا۔

"داد بخش کہاں ہے؟" انہوں نے ان سب کے چہروں کو بغور دیکھا' کسی انہونی کے ڈر سے ــــ!

"اندر آپریشن تھیٹر میں ہے' ڈاکٹر گولی نکال رہے ہیں۔" بشیر الوہار فکرمندی سے بولا۔

"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟"

"وہ تو جی ڈاکٹر تو تسلی ہی دیتے ہیں۔"

"گولی کہاں لگی تھی؟"

"سینے کے اوپر' کندھے کے قریب لگی تھی۔" بشیر الوہار داد بخش کے لیے حد سے زیادہ پریشان ہو رہا تھا۔

"اللہ خیر۔" وہ بے ساختہ کہتی قریب پڑی بینچ پہ بیٹھ گئی تھیں۔

"تائی بیگم! داد بخش کیسا ہے؟" قاسم علی راہداری عبور کر کے ان کے قریب آگیا تھا۔

"تمہیں بڑی جلدی پتا چل گیا ہے کہ داد بخش کیسا ہے؟" سردار بیگم نے کڑوے لہجے میں کہتے ہوئے اپنے نواسے کو دیکھا۔

"لیکن یہ سب کس نے کیا ہے؟ گولی مارنے والا کون تھا آخر؟" قاسم علی نے وہی سوال کیا جو باقی سب کے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔

"گولی مارنے والا ابھی ہم میں سے ہی تھا قاسم علی!" سردار بیگم کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ قاسم علی چونک گیا تھا۔

"کیا مطلب ہے تائی بیگم؟"

"مطلب میں تمہیں پولیس کے سامنے بتاؤں گی' پولیس کو فون کرو' ابھی تک پولیس پہنچی کیوں نہیں؟" سردار بیگم دل میں کچھ ٹھان چکی تھیں۔

"لیکن تائی بیگم!"

"تم سے جو کہا ہے وہ کرو۔" وہ اس وقت کسی بحث و تکرار کے موڈ میں نہیں تھیں۔

"میں ابھی فون کرتا ہوں۔" قاسم علی اپنی تائی بیگم

کے مزاج سے بخوبی واقف تھا۔ ذرا سی بھی دیر سویر ہو جاتی تو وہ برداشت نہیں کرتی تھیں اور اگر کسی کی بات یا کام میں دیر سویر برداشت کرتی تھیں تو وہ صرف ولو بخش ہی تھا۔

اس نے فون کیا تو پتہ چلا کہ پولیس کو پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے پولیس کو اطلاع دی تھی کیونکہ یہ سراسر پولیس کیس تھا۔ اور واقعی چند منٹوں بعد پولیس وہاں پہنچ گئی تھی۔

"آپ کی کسی سے کوئی دشمنی ہے کیا؟" ایس ایچ او نے قاسم علی سے پوچھ گچھ کی۔

"نہیں سر! ہماری کسی سے کوئی دشمنی۔"

"ہماری دشمنی ہے انسپکٹر صاحب اور دشمن کو میں اچھی طرح جانتی ہوں آپ نام لکھو۔ میں لکھواتی ہوں۔" سردار بیگم اٹھ کر پاس آگئیں۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" قاسم کو حیرت ہوئی تھی۔

"میں جو کہہ رہی ہوں وہ ٹھیک کہہ رہی ہوں انسپکٹر صاحب لکھو نام۔" انہوں نے اشارہ کیا اور پھر اپنے دشمن کا نام اور ولدیت درج کروائی تھی۔

قاسم علی صدمے سے دشمن کا نام سن کر دنگ رہ گیا تھا۔ اسے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آرہا تھا۔

"مجرم آج شام سے پہلے پہلے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہونا چاہیے ورنہ میں بہت اوپر تک جاؤں گی۔" انہوں نے وارننگ دی تھی اور مزید کچھ بھی کہے بغیر وہ پلٹ کر آپریشن تھیٹر کے باہر رکھے بینچ پہ جا کر بیٹھ گئی تھیں اور قاسم علی بس دیکھتا رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"دعا کرو اللہ میرے بیٹے کے سوئے ہوئے بھاگ جگا دے۔" سردار بیگم نے بڑی آس، بڑی حسرت سے کہا تھا اور وہ عورت ان کے چہرے کو دیکھنے لگی تھی۔

یہ عورت سردار بیگم کی حویلی کے باہر بھیک مانگنے آئی تھی۔ ملازمہ نے اسے پیسے دیے تو بولی۔

"اپنی بیگم صاحبہ سے کہو میں دو دن سے بھوکی ہوں۔ دو دن سے کھانا نصیب نہیں ہوا۔ مجھے کھانا کھلا دیں۔ میری بھوک سے تڑپتی آنتیں انہیں دعا دیں گی۔"

سردار بیگم اس وقت وہیں کھڑی پودوں کو دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے سنا تو اس بوڑھی عورت کو اندر بلا لیا اور ملازمہ کو کھانا لانے کے لیے کہا۔

"اللہ تیری حویلی آباد رکھے بیگم صاحبہ!" اس عورت نے کھانا کھانے کے بعد جھولی پھیلا کر دعا دی تھی لیکن سردار بیگم کے دل میں تو بس ایک ہی حسرت تھی کہ اللہ ان کے بیٹے کو صاحب اولاد کرے۔

"اللہ تیرے بیٹے کے بھاگ جگائے گا اور ضرور جگائے گا۔ یہ اک فقیرنی کی دعا ہے اللہ تیری حویلی کو ہرا بھرا رکھے تجھے پوتے پوتیوں کی خوشیاں دکھائے۔"

"مائی شام ہو رہی ہے تو حویلی میں رک جا۔" سردار بیگم نے اس عورت کو روکنا چاہا۔

"بیگم صاحبہ! فقیر مسافر ہوتا ہے اور مسافر کہیں رکتا نہیں ہے چلتا ہی جاتا ہے تو نے میرے پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کیا ہے اللہ تیرے دل کو ٹھنڈا کرے گا۔" فقیرنی سردار بیگم کو دعا دیتی ہوئی حویلی سے نکل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟" ولی محمد اندر زنان خانے میں چلا آیا۔

"اس بوڑھی عورت سے تیرے لیے دعا کروائی ہے "اللہ تجھے اولاد جیسی نعمت عطا کرے۔ اس حویلی کے سونے آنگن میں بچوں کی آوازیں گونجیں۔" سردار بیگم بیٹے کے لیے دعائیں کرتی نہیں تھکتی تھیں۔

"انشاء اللہ وہ آپ کی دعائیں ضرور سنے گا۔" ولی محمد اپنی ماں کے دلی جذبات سے بخوبی واقف تھے۔

"بیٹا چھ سال ہو گئے ہیں دعائیں کرتے کرتے اب تو دعائیں بھی تھکنے لگی ہیں۔" سردار بیگم اداس ہو گئیں۔

"ارے نہیں اماں بیگم! اداس اور مایوس نہیں ہوتے اللہ سے اچھے کی امید رکھنی چاہیے۔" ولی محمد نے ماں کو بازو کے گھیرے میں لے لیا تھا۔

"اس حویلی کا صرف تو ہی وارث ہے اور تیرا دامن اولاد سے خالی دیکھ کر کلیجے سے ہوک اٹھتی ہے ساجدہ اور راشدہ بھی تو ہیں نا؟ "وہ دو تین تین بچے ہیں ان کے قاسم چار سال کا اور منیر تین سال کا ہو رہا ہے۔"

سردار بیگم کو اپنی بیٹیاں اور ان کے بچے یاد آگئے۔

"مجھے احساس ہے اماں بیگم! لیکن اللہ کے ساتھ کوئی زور زبردستی تو نہیں کی جاسکتی نا؟ وہ اپنی مرضی کا مالک ہے جو اس کی رضا وہ ہمارا نصیب۔"

"اماں بیگم! آپ کی نظر میں، میں آپ کی مجرم ہوں نا؟ آپ کو خوشیوں کے رستے کی رکاوٹ۔" رابعہ بی بی ان کے سامنے آگئی۔ وہ ان کی باتیں سن چکی تھی۔

"اماں بیگم! آپ کو اگر کسی اور بطن سے اپنی آنے والی نسل کا وارث ملتا ہے تو ٹھیک ہے آپ لے آئیں۔"

رابعہ بی بی نے حوصلہ کر کے کہہ ہی دیا تھا اور ولی محمد کے ساتھ ساتھ سردار بیگم بھی حیران ہو گئیں۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"ہاں اماں بیگم! میں اپنی خوشی کے لیے آپ کی خوشیاں ملیا میٹ نہیں کر سکتی اور یہ صرف خوشی ہی نہیں پوری نسل کا معاملہ ہے۔ اپنا نام و نشان تو کوئی بھی مٹانا نہیں چاہتا؟"

رابعہ بی بی سچ کہہ رہی تھی اس کے سر پہ ہمہ وقت ولی محمد کی دوسری شادی کا خوف سوار رہتا تھا وہ بھلا کب تک یوں ڈر ڈر کے جی سکتی تھی۔

"لیکن ہم نے بھی تمہیں تو الزام نہیں دیا نہ ہی کبھی تمہیں رکاوٹ سمجھا ہے ہم نے تو اپنے اللہ ہی سے مانگا ہے۔ وہی رب ہے سب کی سننے والا اور سب کو دینے والا۔"

سردار بیگم سچ کہہ رہی تھیں انہوں نے کبھی بھی اس چیز کے لیے رابعہ بی بی کو مجرم نہیں سمجھا تھا۔

"عورتیں واقعی جذباتی اور جلد باز ہوتی ہیں" اتنی جلدی آپ لوگ مایوس ہو گئیں؟ ابھی تو زندگی پڑی ہے۔"

ولی محمد نے دونوں کو سمجھایا تھا اور وہ تھوڑی دیر کے لیے سمجھ بھی گئی تھیں۔ فقط تھوڑی دیر کے لیے۔

☼ ☼ ☼

سردار محمد اور نواز محمد صرف دو ہی بھائی تھے۔ ماں باپ نے زمینوں کا بٹوارہ کرنے کے ساتھ گاؤں کا اور حویلیوں کا بٹوارہ بھی اپنی زندگی میں ہی کر دیا تھا۔ بڑی حویلی سردار محمد کے نام اور چھوٹی حویلی نواز محمد کے نام کی گئی۔ بڑی حویلی گاؤں میں داخل ہوتے ہی بڑی شان سے سربلند کیے کھڑی نظر آتی اور چھوٹی حویلی گاؤں کے دوسرے کونے میں واقع تھی۔

اسی طرح گاؤں کی دائیں طرف کی زمینیں سردار محمد کی ملکیت تھی اور بائیں طرف کی زمینیں نواز محمد کی۔

ماں باپ نے بٹوارہ کچھ اس انصاف سے کیا تھا کہ دونوں بھائیوں کو کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی اور وہ اپنے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اپنی اپنی حویلیوں میں خوشحال اور پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ سردار محمد بڑے تھے اس لیے گھر میں، گھر سے باہر اپنے گاؤں اور آس پاس کے علاقے میں بھی انہی کی زیادہ عزت کی جاتی تھی زیادہ واقفیت اور جان پہچان بھی لوگوں کے ساتھ انہی کی تھی۔

سردار محمد بہت اصول پرست اور انصاف پسند آدمی تھے۔ حق اور سچ بات کا ساتھ دیتے تھے۔ کبھی کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کی تھی انہوں نے کبھی اپنے بیٹے کو بھی بیٹیوں پہ ترجیح نہیں دی تھی۔ بیٹے اور بیٹیوں میں کوئی فرق نہیں رکھا تھا یہی وجہ تھی کہ ان کے اکلوتے بیٹے ولی محمد نے کبھی ضد نہیں کی تھی جو کہتے مان لیتا اور ہاں تو ساجدہ بھی لگتی تھی بس راشدہ کی فطرت میں تھوڑی ضد اور ہٹ دھرمی تھی۔ لیکن اسے بھی ہینڈل کر لیتے تھے۔ لیکن کسے خبر تھی کہ وہ اپنے بچوں کو بچپن میں ہی چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو

جائیں گے۔

سردار محمد کی ہارٹ اٹیک سے ہونے والی اچانک اور ناگہانی موت نے ان کی بیوی سعادت النساء کو گم صم کر کے رکھ دیا تھا۔ تین بچوں کا ساتھ بھری جوانی اور لمبا سفر؟ تینوں ذمہ داریاں ہی بڑی کڑی اور بڑی کٹھن تھیں۔ انہیں حوصلہ چاہیے تھا اور حوصلہ انسان کو وقت اور حالات خود بخود سونپ دیتے ہیں۔

سو وہ بھری جوانی میں بیوگی کی چادر اوڑھ کر اس طویل سفر پہ اپنے بچوں کے ہمراہ چل پڑیں۔ اپنے دیور نواز محمد کا سہارا لیتیں تو کل کو ہزاروں افسانے رقم ہو جاتے جبکہ وہ اپنے آپ کو لوگوں کی زبانوں کی زینت نہیں بنا سکتی تھیں۔ انہیں اپنی ہی نہیں اپنے مرحوم شوہر کی عزت بھی بہت عزیز تھی اور اسی عزت اور وقار کے لیے انہوں نے جوانی کی مسافت اکیلے طے کی تھی اور ہمیشہ اپنے آپ کو سردار بیگم کہلوایا تھا۔ رشتہ داروں، جاننے والوں اور گاؤں والوں کے لیے جتنے سردار محمد خود اہم تھے اتنی ہی ان کی بیگم "سردار بیگم" اہم تھیں۔ لوگ ان کا اصل نام تقریباً بھول گئے تھے تب ہی ان کے بچے بھی انہیں سردار بیگم ہی کہتے تھے۔ اولاد جوان ہوئی تو ان کی شادیوں کی فکر نے آن گھیرا۔

ساجدہ کی شادی نواز محمد کے بیٹے کے ساتھ طے تھی۔

سردار بیگم کا ارمان تھا کہ وہ پہلے بیٹے کی شادی کریں لہٰذا انہوں نے بیٹیوں کے فرض سے فارغ ہونے سے پہلے ولی محمد کے لیے رابعہ کا انتخاب کیا تھا۔ رابعہ ساتھ والے گاؤں کے چوہدری کریم اللہ کی بیٹی تھی اور ولی محمد کو پسند بھی تھی سو انہوں نے ذرا دیر نہ کی اور رابعہ کو بیاہ لائیں۔

ولی محمد اور رابعہ کی شادی کے بعد اب بیٹیوں کی باری تھی لیکن راشدہ شادی کے لیے نہیں مان رہی تھی ہزاروں جتن کے بعد پتہ چلا کہ راشدہ کسی کو پسند کرتی ہے۔ وہ کسی مل اونر کا بیٹا تھا اور راشدہ کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ اس مقام پہ آکر سردار بیگم کو دھچکا تو لگا لیکن انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ وہ مخالفت کرتیں تو یقیناً بیٹی ہاتھوں سے نکل جاتی اور سارا الزام ان کی پرورش پہ آتا اور ہمیشہ کے لیے داغ لگ جاتا۔ لہٰذا انہوں نے سمجھداری سے کام لیا اور راشدہ کو اپنی مرضی سے اس کی پسند کے ساتھ رخصت کر دیا۔

ولی محمد کو اعتراض تو ہوا لیکن ماں کے سامنے وہ کچھ بول نہ سکے۔

دونوں بیٹیاں اپنے اپنے گھر کی ہو چکی تھیں دونوں کے بچے تھے اپنے گھروں میں خوش و خرم زندگی جی رہی تھیں انہیں راشدہ کے شوہر اور سسرال والوں کی طرف سے جو خدشے تھے وہ ان پانچ چھ سالوں میں ختم ہو چکے تھے۔ لیکن ولی محمد کی طرف اولاد کی کمی دیکھ دیکھ کر ان کا دل کڑھتا ہی رہتا تھا۔

☆ ☆ ☆

گاؤں میں میلہ لگا ہوا تھا ہر طرف طرح طرح کے لوگ نظر آ رہے تھے۔

"آپ کو کچھ لینا ہے سردار بیگم؟" ان کی ملازمہ رحمی نے پوچھا تو سردار بیگم چونک گئیں۔

"نہیں مجھے بھلا کیا لینا ہے؟ تم کچھ لینا چاہتی ہو تو لے لو۔" سردار بیگم کہہ کر آگے بڑھ گئیں اور رحمی وہیں کھڑی چیزیں دیکھنے لگی بچے جھولے لے رہے تھے اور ساتھ ڈر کے مارے چیخیں بھی مار رہے تھے رحمی اپنی بیٹی رجائی کے لیے چوڑیاں اور پراندے دیکھنے لگی۔

"چپ ہو جا بدنصیب اب روتا کیوں ہے؟" وہ دونوں اس قدر کرخت آواز پہ ٹھٹکنے پہ مجبور ہو گئی تھیں۔ وہ شاید دربار کا مجاور تھا جو اس بچے کو بری طرح جھڑک رہا تھا جبکہ وہ بچہ زار و قطار رو رہا تھا۔

"تم اسے کیوں مار رہے ہو؟" سردار بیگم رہ نہ سکیں اور مزار کے برآمدے کے اس کونے میں چلی آئیں جہاں وہ بچہ رو رہا تھا۔

"یہ اس کا نصیب ہے بیگم صاحبہ!" مجاور ان کو دیکھ کر فرش سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"نصیب؟" وہ کچھ نہ سمجھیں۔

"بیگم صاحبہ یہ لاوارث ہے۔" مجاور [illegible] بولا لیکن اس کا جملہ سردار بیگم کے دل میں نیزے کی انی کی مانند پیوست ہو گیا تھا۔

"کل میلے میں ایک آدمی اسے لے کر آیا تھا کچھ دیر اسے لے کر میلے میں پھرتا رہا پھر اسے دربار کے اندر بٹھا کر خود کوئی چیز لینے کے بہانے باہر گیا اور پلٹ کر دوبارہ واپس نہیں آیا۔ آس پاس کے سارے گاؤں میں اعلان کروائے ہیں کہ اگر کسی کا بچہ گم ہوا ہے تو آ کر نشانی بتا کے لے جائیں لیکن تب بھی کوئی نہیں آیا۔ ایک گاؤں کا کوئی بتا رہا تھا کہ اس بچے کے ماں باپ مر چکے ہیں پچھلے دو سال سے اپنے ماموں اور مامی کے پاس تھا مامی کافی بدمزاج عورت ہے اور اس کی نفرت اور ظلم و تشدد سے تنگ آ کر اس کا ماموں اسے یہاں چھوڑ گیا ہے اور خود بیوی بچوں کو لے کر گاؤں سے ہی چلا گیا ہے۔ شاید اس بچے کے نام کوئی گھر اور زمین بھی تھے جسے ہڑپ کر وہ بھاگ گئے تھے اور یہ... یہ بدنصیب کل سے رو رو کر ہلکان ہو گیا ہے نہ کچھ کھایا ہے نہ سویا ہے ساری رات اسے پیار سے بیٹھ کر سمجھاتے ہوئے گزار دی لیکن یہ بچہ کچھ سمجھتا ہی نہیں بس روئے جا رہا ہے۔"

"تم اسے بدنصیب نہ کہو کس کی قسمت میں کیا لکھا ہے یہ ہمیں کیسے پتہ ہو سکتا ہے؟" سردار بیگم نے اس بچے کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے اپنے قریب کر لیا تھا۔

"اس کی قسمت ہی تو اسے یہاں لے کر آئی ہے بیگم صاحبہ!" مجاور کا لہجہ عجیب سا تھا۔

"اور اس کی قسمت ہی اسے کہیں اور لے جائے گی۔" وہ آہستگی سے بولیں۔

"یہ میرے ساتھ جائے گا میرے گھر، میری حویلی میں۔" سردار بیگم کا لہجہ اٹل تھا۔

"مبارک بیگم صاحبہ! مبارک تیرے بھاگ جاگ گئے ہیں۔ آج "آج اللہ نے تیری جھولی بھر دی" تیری مراد پوری ہو گئی ہے "تو نے اک یتیم اور لاوارث کے سر پہ ہاتھ رکھا ہے اللہ تجھے وارث دے گا" جا [illegible]

[illegible] کی باتیں [illegible] وہ بوڑھی عورت اتنی خوشی سے [illegible] ڈالنے لگی تھی۔ سردار بیگم نے چونک کر دیکھا یہ وہی فقیرنی تھی جو چند دن پہلے ان کی حویلی میں کھانا کھانے آئی تھی۔

"جا اسے اپنے ساتھ لے جا۔" وہ فقیرنی خوشی خوشی کہہ رہی تھی۔

"آپ خوش قسمت ہیں بیگم صاحبہ 'آپ کو یہ فقیرنی دعا دے رہی ہے ورنہ اس کے منہ سے سالوں کوئی دعا نہیں نکلتی۔" اس مجاور نے حیرانی اور خوشی سے کہا تھا۔

"چلو میرے بچے میرے ساتھ چلو۔" سردار بیگم نے اس بچے کا ہاتھ تھام لیا۔ سردار بیگم کے انداز میں اتنی محبت اور اپنائیت کا احساس تھا کہ وہ خاموش ہو گیا تھا۔ وہ اسے بہلاتی ہوئی گاڑی تک لے آئی تھیں اور گاڑی میں بیٹھ کر ان کی نظریں بھی حلوائی کے کھوکھے کی سمت اٹھی تھیں۔

"رحمی [illegible] اور جلیبیاں لے کر آ۔" انہوں نے [illegible]

"دس گھولے آ تو۔" انہوں نے کہا اور سیٹ پہ اپنے قریب بیٹھے بچے کو اپنے قریب کر لیا تھا۔

"چپ ہو جاؤ شاباش! تمہیں رونے کی اور ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم اب میرے بیٹے ہو۔" سردار بیگم نے اس کا سر تھپکا پھر کچھ خیال آنے پہ ٹھٹک گئیں۔

"بیٹا! تمہارا نام کیا ہے؟" انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

"داد... داد بخش!" سسکیوں کی وجہ سے اس نے اٹک اٹک کر بتایا تھا۔ "ماشاء اللہ نام تو بہت ہی پیارا ہے۔"

"اپنے ابا کا نام یاد ہے؟"

"جی ان کا نام خدا بخش تھا۔"

"اور ماں کا نام؟"

اور اسے چوٹ لگے گی۔" داد بخش نے اپنے گریز کی وجہ بتائی۔

"تم احتیاط سے اٹھاؤ گے تو نہیں گرے گی۔" سردار بیگم نے اسے تسلی دی تھی۔ "نہیں سردار بیگم! مجھ سے گر جائے گی۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی تو ولی محمد ہنس دیا تھا۔

٭ ٭ ٭

بالآخر بیٹے کی کمی نے انہیں اس دوراہے پہ لا کھڑا کیا تھا جہاں ایک آخری فیصلہ کرنا ہر جاگیردار کی مجبوری بن جاتی تھی رابعہ بی بی بھی ان کی مجبوری سمجھتی تھیں سو انہوں نے دل بڑا کرتے ہوئے ولی محمد کو شادی کی اجازت دے دی تھی۔ سردار بیگم خود ایک عورت تھیں عورت کے جذبات خوب سمجھتی تھیں انہوں نے رابعہ بی بی کی دل آزاری کے خیال سے کبھی بھی ولی محمد پہ دوسری شادی کے لیے دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ ان کی اجازت۔ سردار بیگم کو بڑی حیرانی ہوئی تھی۔

"یہ کیا کیا رابعہ بی بی؟" آج انہوں نے حیرت کے مارے ان کو نام سے پکارا تھا۔

"اس حویلی کے وارث کی خواہش تو مجھے بھی ہے اماں بیگم!" رابعہ بی بی نے اپنی نم آنکھوں کو پونچھتے ہوئے کہا تھا اور سردار بیگم کو رابعہ بی بی کے حوصلے اور صبر پہ بیک وقت پیار اور ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔

"ان شاء اللہ اس حویلی میں تمہاری حیثیت اور مرتبے میں کوئی کمی نہیں آئے گی جو مقام آج ہے وہی ہمیشہ رہے گا اللہ تمہیں خوش رکھے آباد رکھے۔" انہوں نے رابعہ بی بی کو ساتھ لگا کر ڈھارس بندھائی تھی اور پھر رابعہ بی بی کی رضامندی سے چند دن بعد ہی سردار بیگم اپنی بیٹی راشدہ کی نند ماجرہ کو بیاہ لائی تھیں۔

ماجرہ شہری پڑھی لکھی لڑکی تھی اس ماحول میں ذرا مشکل سے ہی ایڈجسٹ ہو پائی تھی اسے حویلی کی بہت سی چیزوں اور بہت سے لوگوں پہ اعتراض ہوا تھا لیکن مقابل سردار بیگم تھیں جن کے سامنے کوئی اعتراض نہیں چل سکتا تھا آگے پیچھے وہ کافی ناک بھوں چڑھاتی رہتی تھیں لیکن سردار بیگم سامنے آ جاتیں تو وہ تیر کی طرح سیدھی ہو جاتی تھیں البتہ جب وہ امید سے ہوئیں تو ان کے ناز نخرے سب اٹھانے والے تھے۔

٭ ٭ ٭

ولی محمد کی ایکسیڈنٹ سے ہونے والی موت سردار بیگم کو ساکت و صامت کر گئی تھی۔ اپنی جوانی میں اپنے شوہر کی موت کا صدمہ اور بڑھاپے میں جوان بیٹے کی موت کا صدمہ۔ ان کو جیتے جی مار گیا تھا۔ رابعہ بی بی اور ماجرہ بیگم کا بھی برا حال تھا ولی محمد جو بیٹے کے لیے عرصے سے خواہش مند تھا اس بیٹے کی شکل بھی نہ دیکھ سکا۔

ولی محمد کی وفات کے دس دن بعد ماجرہ کے ہاں بیٹے نے جنم لیا تھا اور سردار بیگم ولی محمد کے وارث کو دیکھ کر دھاڑیں مار مار کے روئی تھیں۔ اتنا کہ دیکھنے اور سننے والوں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔ ان کے دکھ پہ ہر آنکھ اشک بار تھی اور ہر دل میں افسوس تھا۔ سردار بیگم کے ارمان دل میں ہی رہ گئے تھے۔ وہ اتنی منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہونے والے پوتے کی کوئی خوشی کوئی جشن نہیں منا سکی تھیں ہر دل کا ایک حصہ غم سے بھرا تھا تو دوسرا پوتے کی صورت دیکھ کر خوشی سے معمور ہو رہا تھا۔

غم بھی ادھورا اور خوشی بھی ادھوری۔۔۔ کون سا احساس کس پہ حاوی تھا کچھ احساس ہی نہیں تھا کچھ خبر ہی نہیں تھی۔۔۔ لیکن یہ زندگی تھی یہاں ہر غم اور ہر خوشی ساتھ لے کر جینا تھا ان کا بیٹا انہیں کچھ اور ذمہ داریاں سونپ گیا تھا اور ان ذمہ داریوں کو نبھاتے نبھاتے کتنا وقت گزر گیا؟ کوئی پلٹ کر دیکھتا تو پتا چلتا۔

٭ ٭ ٭

سحر سے فجر کی اذان کی آواز بلند ہوئی تو اس کی نیند خود بخود کہیں بیچ راستے میں ہی رہ گئی تھی وہ خوابوں کے سفر سے واپس لوٹ آیا تھا۔ چہرے سے کمبل ہٹا کر دیکھا تو کمرے میں وہی نیلے رنگ کی ملگجی سی روشنی دکھائی دی تھی جو روزانہ آنکھ کھلنے پہ نظر آتی تھی۔ یہ روشنی اس کے پسندیدہ زیرو بلب کی روشنی تھی وہ دن بھر کی تھکن کے بعد جب اپنے بستر پہ لیٹتا تھا اس مدھم سی ٹھنڈی میٹھی روشنی میں اسے فوراً ہی نیند آ جاتی تھی۔ وہ ہاتھ سے لیمپ کا بٹن دبا کر لیمپ آن کرتا ہوا اٹھ بیٹھا تھا۔

چند منٹوں بعد وضو کر کے گرم چادر کندھوں پہ اوڑھتا ہوا کمرے سے نکل آیا تھا اپنے کمرے کی طرف آنے والی طویل راہداری عبور کر کے وہ لوہے کی جالی سے بنے دروازے تک پہنچا اور دروازہ کھول کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اس کے کمرے کی طرف جانے والی راہداری کا دروازہ ڈرائنگ روم میں کھلتا تھا اور اس طرف باقی سب کی آمد و رفت بہت کم ہوتی تھی یہ الگ تھلگ سا کمرہ اس نے خود اپنے لیے انتخاب کیا تھا حالانکہ سردار بیگم کو خاصا اعتراض ہوا تھا لیکن اس نے وجہ بتا کر انہیں مطمئن کر دیا تھا کہ وہ دن بھر کا تھکا ہوا ہوتا ہے اور حویلی کے تمام مرکزی کمروں میں ہونے والے شور ہنگامے کی آواز آ جاتی ہے اور وہ ٹھیک سے سو نہیں پاتا۔

حویلی سے نکلی کی مسجد تک وہ روزانہ پیدل ہی جاتا تھا اور اس کے قدموں میں تیزی ہوتی تھی کہ کہیں جماعت نہ نکل جائے۔

"السلام علیکم چاچا!" اس نے سب سے پہلے نکڑ والے شیرے لوہار کو اخراماً سلام کیا۔

"وعلیکم السلام پتر! تم وضو کر کے آئے ہو؟"

"ہاں چاچا! میں وضو حویلی سے ہی کر آیا ہوں۔"

"اچھا کیا ہے یہاں پانی ہی کب آتی ہے؟" وہ مسکرا کر بولے۔

"چاچی کیسی ہے؟ طبیعت ٹھیک ہوئی ان کی؟" داد بخش اپنی جیب سے سفید کروشیے سے بنی ٹوپی نکال کر پہنتے ہوئے بولا۔

"اللہ کا شکر ہے پتر! کافی بھلی چنگی ہو گئی ہے اب۔" وہ اس کے ساتھ اندر آ گئے۔

نماز کے بعد وہ تقریباً ایک گھنٹہ مسجد میں بیٹھ کر قرآن پاک کی تلاوت کرتا تھا واپس حویلی آتا تو وہاں کتنی ہی ہلچل اس کی منتظر ہوتی۔

"داد بخش!" وہ حویلی کے گیٹ سے اندر داخل ہوا ہی تھا کہ اسے مہپارہ کی آواز سنائی دی۔

"جی مہپارہ بی بی!" وہ سراپا سماعت بن گیا تھا۔

"کل مہپارہ کے کپڑے ٹیلر سے لے آئے تھے؟" مہپارہ لان میں کھڑی تھی جب گیٹ سے اندر داخل ہوتے داد بخش کو دیکھ کر اسے مہپارہ کا ہنگامہ یاد آ گیا۔

"جی لے آیا تھا۔"

"ٹھیک ہے جاؤ جا کر دے آؤ اسے" اس نے اندر بنگلے میں ہنگامہ مچا رکھا ہے۔" مہپارہ نے شکر کا سانس لیتے ہوئے کہا داد بخش کے گیراج میں کھڑی گاڑی کی سمت آ گیا تھا اور گاڑی کا بیک ڈور کھول کر پچھلی سیٹ پہ رکھا کپڑوں سے بھرا ہوا شاپر نکال کر اندر چلا گیا۔

"ارے داد بخش! شکر ہے تم آ گئے" اس لڑکی نے ناک میں دم کر رکھا تھا" جاؤ بات سنو اس کی۔" رابعہ بی بی خفگی سے کہتی وہاں سے اٹھ گئیں۔ داد بخش خاموشی سے سر جھکا کر اوپر آ گیا اس کے بیڈ روم کا دروازہ بند تھا اس نے آہستہ سے دستک دی۔

"آ جائیے" اس نے جھٹکے سے دروازہ کھولا۔

"آپ کے کپڑے!" اس نے شاپر سامنے کیا۔

"ویسے کہاں تھے یہ کپڑے؟"

"کل میں رات کو لیٹ واپس آیا تھا" آپ سو گئی تھیں اس لیے کپڑے گاڑی میں ہی رکھے رہ گئے۔" داد بخش کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"تمہیں کیسے پتہ کہ میں سو گئی تھی؟"

"رات کے دو بجے کا وقت تھا مہپارہ بی بی!"

"دو بجے اگر تم جاگ سکتے ہو تو کیا میں نہیں جاگ سکتی؟"

"لیکن رات کے دو بجے میں آپ کے کمرے میں نہیں آ سکتا تھا۔" اس نے زور دے کر کہا۔

"رات کے دو بجے تم میرے کمرے میں نہیں آ سکتے تو کیا میرے کمرے کے دروازے پہ بھی نہیں آ سکتے؟" وہ گھور کے بولی اسے داد بخش کی جھکی نظر پہ غصہ آ رہا تھا۔

"نہیں بی بی! نہیں آ سکتا۔" اس نے دو ٹوک جواب دیا۔

اس کا صرف "بی بی" کہنا اس کی خفگی کا اظہار تھا —

"میں جاؤں؟" وہ واپسی کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

"ہوں! جاؤ۔" اس نے سر ہلا کر کہا۔

"شکریہ۔" وہ فوراً پلٹ گیا۔

"سنو دادو!" اس نے بے ساختہ آواز دی تو اس کے قدم تھم گئے تھے۔

"جی؟" وہ اس کی سمت پلٹتے ہوئے مختصر بولا۔

مہرماہ اسے سراپا گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ سرمئی رنگ کے شلوار سوٹ میں ملبوس کندھوں پہ اسکن کلر کی گرم چادر اوڑھے وہ اس وقت کہاں سے آیا تھا مہرماہ بخوبی جانتی تھی۔

"اچھے لگ رہے ہو۔" اس نے دل کا کہا زبان کی نذر کر ہی دیا تھا۔

[illegible]

"تم جاؤ میں [illegible] جا رہی ہوں۔" [illegible]

مہرماہ نے لاتعلقی ظاہر کرتے ہوئے اسے جانے کا کہا اور خود کمرے کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ داد بخش لب بھینچ کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"آ جاؤ داد بخش!" وہ دستک سے ہی پہچان جاتی تھیں! انہوں نے نرمی سے کہا۔

"ادھر آؤ بیٹھو یہاں۔" انہوں نے اپنے جہازی سائز نواڑی پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" سردار بیگم کو دو دن سے بخار تھا۔

"طبیعت تو پہلے سے بہتر ہے لیکن کچھ تھکن اور کمزوری ہو گئی ہے اٹھنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی۔" انہوں نے نقاہت سے کہا۔

"میں آپ کی ٹانگیں اور پاؤں دبا دیتا ہوں۔" اس نے ان کے پاؤں پہ ہاتھ رکھے اور آہستگی سے دبانے لگا۔

"ارے نہیں میرے بچے، یہ تیرا کام نہیں ہے۔" انہوں نے اپنے پاؤں پیچھے ہٹانے کی کوشش کی۔

"بیٹے ماؤں کے پیر دباتے اچھے نہیں لگتے۔" انہوں نے داد بخش کی گرفت سے اپنے پاؤں نکالنے چاہے۔

"بیٹے ہی تو ماؤں کے پیر دباتے ہوئے اچھے لگتے ہیں سردار بیگم! وہ عقیدت وہ محبت رجائی کے ہاتھ میں نہیں ہو گی جو میرے ہاتھ میں ہو گی۔"

"تم بیٹے ہو لیکن مجھے سردار بیگم کہہ کر پل میں غیر بھی کر دیتے ہو۔"

سردار بیگم بارہا کہہ چکی تھیں کہ مجھے اماں بیگم یا دادی بیگم کہا کرو لیکن وہ بچپن سے اب تک ان کو اماں یا دادی کہنے کی ہمت نہیں کر سکا۔

"میں آپ کو سردار بیگم اس لیے کہتا ہوں تاکہ آپ کا مجھ پہ رعب رہے۔" وہ ان کو بہلانے کے لیے ذرا شرارت سے بولا تھا۔

"میں سب جانتی ہوں۔" وہ مصنوعی خفگی سے بولیں۔

"میں نے ڈاکٹر سے ٹائم لے لیا ہے کل آپ میرے ساتھ شہر چلیں گی اور چیک اپ کروائیں گی۔"

"لیکن اب کس لیے چیک اپ کروانا ہے؟ بخار تو اتر گیا ہے۔"

"بخار اتر گیا ہے لیکن کمزوری اور نقاہت تو چھوڑ گیا ہے ناں؟ ڈاکٹر کوئی طاقت کی دوا لکھ دے گا تو آپ کی انرجی بحال ہو جائے گی۔" اس نے حتمی انداز میں کہا اور سردار بیگم اس کی اتنی فکرمندی پہ مسکرا دیں۔

"جیسے تمہاری خوشی۔" وہ اس کی بات سے انکار نہیں کر سکتی تھیں۔

"اماں بیگم!" اچانک دروازہ کھول کر راشدہ بیگم اندر داخل ہوئی تھیں۔

"کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" راشدہ بیگم ان کے پلنگ پہ سرہانے کی طرف آ بیٹھی تھیں۔

"مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں کہ آپ کی طبیعت خراب ہے، وہ تو آج ناجرہ بھابھی نے ذکر کیا کہ اماں بیگم بیمار ہیں۔" راشدہ بیگم خاصی تشویش اور پریشانی ظاہر کر رہی تھیں۔

"اکیلی آئی ہو؟" انہوں نے اس کی فکرمندی نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، رمیز بھی ساتھ آیا ہے۔ گھر پہ کوئی ڈرائیور نہیں تھا اس لیے اسے ساتھ لے آئی۔" انہوں نے اپنی روانی اور بے دھیانی میں بتایا۔

"ڈرائیور گھر پہ ہوتا تو پھر نہ لے کر آتیں؟" سردار بیگم نے مطلب اخذ کیا۔

"ارے نہیں نہیں اماں بیگم! ایسی کوئی بات نہیں ہے دراصل وہ اپنی پڑھائی میں بزی ہوتا ہے اس لیے کہیں آنا جانا کم ہی ہوتا ہے۔" راشدہ بیگم نے ذرا سنبھل کر جواب دیا تھا۔

"پڑھائی میں تو سبھی بچے مصروف ہوتے ہیں، پڑھائی پہ تو [illegible] کہ اپنے بڑے بزرگوں کو بھول ہی جاؤ [illegible]" سردار بیگم خفا ہو رہی تھیں۔

"میں جاؤں سردار بیگم؟" داد بخش ان کے پاؤں دبانے کے بعد کھڑا ہو گیا تھا۔

"جاؤ بیٹے جیتے رہو اللہ لمبی عمر عطا کرے۔" ان کے منہ سے دعا نکلی تھی۔

"آپ صبح تیار رہیے گا ناشتا کرنے کے فوراً بعد نکلنا ہو گا۔" وہ ان کو یاد دہانی کروا کر باہر نکل گیا تھا۔

"کہاں جانا ہے اماں بیگم؟" راشدہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"ڈاکٹر کے پاس۔"

"تو اس کے ساتھ جانے کی کیا ضرورت ہے؟ میں لے جاؤں گی رمیز ہے ناں ہمارے ساتھ۔"

"تم اور رمیز آج ہو لیکن کل نہیں ہو گے پھر کس کے ساتھ جاؤں گی؟"

"کیا مطلب ہے اماں بیگم؟"

"مطلب یہ ہے کہ تم لوگ مہمان ہو، چلے جاؤ گے تو پھر میں کیا کروں گی؟" سردار بیگم کے لہجے میں استہزا تھا۔

راشدہ بیگم کا موڈ بگڑ گیا تھا لیکن وہ خاموش ہو گئیں۔

"السلام علیکم نانی بیگم!" اتنے میں رمیز اندر داخل ہوا۔

"وعلیکم السلام کیسے ہو بچے؟" سردار بیگم نے کہا۔

"میں ایک دم فٹ ہوں، آپ سنائیں بخار کم ہوا؟" وہ کرسی کھینچ کر ان کے قریب بیٹھ گیا تھا۔

"بخار اتر چکا ہے، خوامخواہ تمہاری ماں نے تمہیں زحمت دی۔"

"ارے نہیں نانی بیگم! زحمت کیسی؟ جب بھی یہاں آتا ہوں بڑا اچھا فیل ہوتا ہے۔" رمیز نے کافی خوشگوار لہجے میں کہا تھا جس پہ راشدہ بیگم نے حیرت سے بیٹے کو دیکھا شہر سے یہاں آتے ہوئے تو وہ خاصا بیزار اور خفا ہو رہا تھا لیکن اب اچانک موڈ کی تبدیلی حیرانی کا باعث تھی۔

"اچھی بات ہے بچے! آ جایا کرو۔" انہوں نے نرمی سے کہا۔

"ان شاء اللہ اب آیا کروں گا۔"

اس نے وعدہ کیا تھا۔ سردار بیگم مسکرا دیں اور راشدہ بیگم کا موڈ بھی خوشگوار ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے دوسری حویلی فون کر کے ساجدہ بیگم کو بھی بلا لیا تھا۔ آج رات ان کا یہیں گاؤں میں رکنے کا ارادہ تھا اور اس کے لیے انہیں کمپنی کی ضرورت تھی...!

☼ ☼ ☼

رکھی، حویلی کے لان میں لوہے کی بڑی سی انگیٹھی رکھے اس میں خشک تنکے اور خشک لکڑیاں دہکا رہی تھی اور آگ کے شعلے بہت بلند اٹھ رہے تھے۔ داد بخش، عشاء کی نماز پڑھ کر آیا تھا اس کے ہاتھ پاؤں خنک ہوا کے جھونکوں سے ٹھنڈے ہو رہے تھے وہ اندر جانے کی بجائے وہیں آگ کے قریب لان میں چلا آیا تھا۔

"انگیٹھی کیوں دہکا رہی ہو مائی؟" اس نے دونوں

ہاتھ آگ کے قریب کر کے سینکتے ہوئے کہا۔
"پتر! ساجدہ بی بی آئی ہوئی ہیں نا، ان کو ہیٹر کی گرمی اچھی نہیں لگتی اس لیے ان کے واسطے کوئلے جلا رہی تھی۔"
"او ہاں! ان کو ہیٹر کی گرمائش سے الرجی ہو جاتی ہے۔" داد بخش کو یاد آگیا۔
"پتر یہ موئی الرجی کیا ہوتی ہے؟" مائی رکھی نے پوچھا۔ داد بخش ان کی بات پہ آہستگی سے مسکرایا اور کچھ دور پڑی کرسیوں میں سے ایک کرسی اٹھا کر آگ کے قریب رکھ کر بیٹھ گیا تھا۔
"مائی الرجی وہی ہوتی ہے جو داد بخش کو مہلو سے ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے نفرت، بیزاری اور اکتاہٹ بھی کہا جا سکتا ہے۔" ان کے قریب سے ہی مہلو کی آواز سنائی دی تھی۔ داد بخش چونک گیا تھا۔ وہ بھی لان میں ہی تھی لیکن وہ اندھیرے میں اسے دیکھ نہیں سکا تھا۔
"داد بخش کو کیا ہوتی ہے بی بی؟" مائی رکھی کو کچھ نہ آیا۔
"الرجی!" مہلو داد بخش کو دیکھتے ہوئے زور دے کر بولی۔
"ماہی بی بی! آپ کو بھی کرسی لا دوں؟" مائی رکھی نے اسے کھڑے دیکھ کر پوچھا۔
"میں چلتا ہوں اب؟" وہ اٹھنے کے لیے پر تولنے لگا۔
"میرے دل سے بھی چلے جاؤ۔"
وہ جل کر بولی تھی اور پھر پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ داد بخش وہیں بیٹھا رہ گیا۔ ایک تو اس لڑکی نے اسے سولی پہ لٹکا رکھا تھا۔ وہ اس کی خودسری سے ڈرتا تھا وہ سردار بیگم کی عمر بھر کی ریاضت مٹی میں نہیں ملانا چاہتا تھا اور وہ تھی کہ ہر بار آڑے آجاتی تھی وہ داد بخش کی قربت اور تنہائیوں سے بھی نہیں ڈرتی تھی لیکن داد بخش کا خون خشک ہو جاتا تھا۔
رمیز حویلی کے مرکزی دروازے سے نکل کر لان کی سیڑھیاں طے کرتا داد بخش کے قریب آگیا۔ داد بخش اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
"السلام علیکم بیٹھیے۔" اس نے اپنی کرسی رمیز کو پیش کی۔
"وعلیکم السلام لیکن تم کہاں بیٹھو گے؟" رمیز نے اسے کھڑے دیکھ کر پوچھا۔
"میں دوسری کرسی لے آتا ہوں۔" داد بخش پلٹ کر گیا اور دوسری اٹھا لایا۔
"داد بخش! کتنا عرصہ ہو گیا ہے تمہیں اس حویلی میں رہتے ہوئے؟" رمیز آگ پہ نظریں جماتے ہوئے بولا۔
"بچپن سے اب تک یہیں تو رہ رہا ہوں رمیز صاحب۔"
"پھر تو تم یہاں سب لوگوں کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہو گے؟"
"تقریباً۔" اس نے آہستگی سے کہا۔
"تقریباً کیوں؟"
"اس لیے کہ کبھی کبھی ہم کسی انسان کے ساتھ پوری زندگی بھی گزار لیں تو اسے جان نہیں پاتے، اسے سمجھ نہیں پاتے اور کبھی کبھی ایک لمحہ بھی اک عمر پہ حاوی ہو جاتا ہے۔"
"اچھا یہ تم مجھے ایک بات بتاؤ، تمہاری یہ مہلو بی بی کیسی ہے؟" رمیز کے اس سوال پہ داد بخش نے چونک کر دیکھا تھا۔
"کیا بات ہے داد بخش! میرا سوال سمجھ میں نہیں آیا؟" اس نے ہنستے ہوئے استفسار کیا۔
"میں کیا بتا سکتا ہوں جی!"
"یہی کہ اس کو کیا پسند ہے؟ اس کے شوق مشاغل کیا ہیں؟"
رمیز نے معنی خیزی سے کہا تھا۔ داد بخش کا دل چاہا کہہ دے۔
"میں اس کا شوق ہوں اور میں ہی اس کی پسند اور مجھے تنگ کیے رکھنا اس کا مشغلہ ہے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ نہیں کرتی۔"
"دیکھیے رمیز صاحب! میرا کام زیادہ تر حویلی سے باہر ہوتا ہے۔ میرا ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تو ہے نہیں کہ میں ان کے مزاج کو سمجھ سکوں ہاں اتنا میں جانتا ہوں وہ بہت اچھی نیچر کی ہیں البتہ تھوڑی ضدی ہیں اکثر ضد پہ اڑ جاتی ہیں۔" داد بخش نے سرسری سے انداز میں بتایا۔
"او! یہ تو بہت ہی بری بات ہے۔"
"کیا مطلب ہے آپ کا؟"
"یار لڑکیاں ضدی ہوں تو بڑی پرابلم ہو جاتی ہے۔ لڑکیوں میں سب کچھ ہونا چاہیے ناز نخرہ ادائیں لاڈ پیار لیکن ضد نہیں ہونی چاہیے۔ میں اس چیز سے سخت الرجک ہوں۔" رمیز نے بڑے دھڑلے سے اپنے واہیات خیالات کا اظہار کیا تھا۔ داد بخش اپنے اشتعال کو ضبط کر گیا۔
"کتنا ہے کافی تجربہ ہے آپ کو؟" اور جواباً وہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔
"تجربے تو بہت ہیں داد بخش! بس اب کسی نئے تجربے کو دل کرتا ہے۔" اس نے داد بخش کے کندھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ [illegible]
"کافی ٹائم ہو چکا ہے اب سونا چاہیے۔"
"اتنی جلدی یار؟" رمیز ابھی بیٹھنا چاہ رہا تھا۔
"صبح فجر کی نماز کے لیے بھی اٹھنا ہوتا ہے، جلدی سوؤں گا تو جلدی اٹھوں گا ناں؟" اس نے رسان سے جواب دیا۔
"اوکے گڈ نائٹ۔" رمیز بھی کھڑا ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ہائے گڈ مارننگ!" وہ سب اس وقت ڈائننگ روم میں بیٹھے ناشتا کر رہے تھے کہ رمیز بھی وہیں چلا آیا۔
"گڈ مارننگ بیٹھیے بھائی۔" وارث نے اپنے ساتھ والی کرسی پیش کی۔
"تھینک یو برادر۔" رمیز مسکراتے ہوئے اس کا گال کھینچ کے بولا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔
"پھپھو بیگم! کیسی طبیعت ہے اب؟" اس نے سب پہ اک نظر ڈال کر سردار بیگم کو مخاطب کیا تھا۔
"اللہ کا شکر ہے بیٹے۔" وہ چائے پیتے ہوئے بولیں۔
"اور باقی سب کیسے ہیں؟" رمیز کی نظر اڑتے اڑتے مہلو کے چہرے پہ ٹک گئی۔ وہ سر جھکائے ناشتا کر رہی تھی۔
"پھپھو! آپ آج یہیں رکیں گی ناں؟" مہلو نے راشدہ بیگم کو دیکھا۔
"نہیں بیٹا! آج واپس جانا ہو گا ان شاء اللہ دوبارہ چکر لگاؤں گی تم آج اپنی ساس صاحبہ کو روک لو۔" راشدہ بیگم نے اپنی بہن ساجدہ بیگم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مہلو کو چھیڑا۔ مہلو بچپن سے ہی اپنی پھپھو ساجدہ کے بیٹے قاسم علی سے منسوب تھی۔
"میں اپنی بچی کے لیے خود ہی رک جاؤں گی۔" ساجدہ بیگم نے پاس بیٹھی مہلو کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا تھا۔
"دیکھا ماما! ساس بہو کا پیار؟ اب آپ بھی اپنے لیے ایک عدد بہو کا انتظام کر لیں۔" رمیز شرارت سے بولا تھا اور راحیلہ نے چونک کر سردار بیگم کی سمت دیکھا [illegible] اس سے پہلے کہ رمیز کچھ پوچھتا داد بخش اندر داخل ہوا تھا۔
"آپ ناشتا کر چکی ہیں؟" وہ سردار بیگم سے پوچھ رہا تھا۔
"ہوں!" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ داد بخش نے آگے بڑھ کے ان کو بازو سے تھام لیا۔
"اچھا بیٹا! میں چلتی ہوں، میری واپسی تک تو شاید تم لوگ چلی جاؤ گی۔" انہوں نے راشدہ اور ساجدہ کے کندھے پہ ہاتھ پھیر کر پیار کیا اور داد بخش کے ساتھ باہر نکل گئیں۔ وہ ان کو گاڑی میں بٹھا رہا تھا کہ پیچھے مہلو بھی تقریباً بھاگتی ہوئی آن پہنچی تھی۔
"میں بھی چلوں گی۔" وہ اپنا پرس سیٹ پہ پھینکتی ہوئی دروازہ کھول کر فٹافٹ اندر بیٹھ گئی۔
"تم کو کہاں جانا ہے بیٹا؟" سردار بیگم نے حیرانی سے استفسار کیا تھا۔

"مجھے آپ کے ساتھ جانا ہے دادی بیگم! میں صرف آپ کے لیے آئی ہوں۔" وہ سردار بیگم سے لپٹ گئی تھی اور وہ اس کے لاڈ پہ شفقت سے ہنس دیں۔

"ٹھیک ہے میرا بچہ۔ چلو داد بخش۔" انہوں نے یونہی ہنستے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے داد بخش کو اشارہ کیا تھا۔

"دادی بیگم! ایک بات تو بتائیں یہ داد بخش اتنا کم کیوں بولتا ہے؟" اس نے سردار بیگم کے کندھے پہ سر رکھتے ہوئے پوچھا۔ نظریں داد بخش پہ تھیں اس کے سوال پہ داد بخش کی نظریں بے ساختہ بیک ویو مرر کی طرف اٹھی تھی۔

"داد بخش! مہاو کو کیا جواب دوں۔ یہ تو مجھے بھی نہیں پتا۔" سردار بیگم ہنس دیں۔ وہ خاموش رہا۔

"دادا!" مہاو نے پکارا۔

"جی مہاو بی بی!" اس کے جواب میں وہی نپا تلا سا احترام تھا۔

"میں تم سے چھوٹی ہوں مجھے بی بی مت کہا کرو۔" وہ چڑ کر بولی۔

"میں آپ سے بڑا ہوں مجھے داد بخش کہا کریں۔" اس نے کہا۔

"مجھے جو اچھا لگتا ہے میں وہی کہوں گی۔" وہ نخوت سے بولی۔

"اور جو مجھے مناسب لگتا ہے میں وہی کہوں گا۔" وہ بھی اپنے کہے پہ قائم تھا۔ "دادی بیگم۔" اس نے جھنجلا کر سردار بیگم کو دیکھا۔

"داد بخش! میری یہ پوتی بڑی بیوقوف ہے۔" انہوں نے مہاو کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے پیار سے کہا۔

"جی ان کی اس خوبی کے ثبوت ملتے رہتے ہیں مجھے۔" وہ ذرا آہستگی سے بولا تھا۔

"گاڑی روکو اور مجھے یہیں راستے میں اتار دو میں واپس حویلی چلی جاتی ہوں۔ مجھے آپ لوگوں کے ساتھ نہیں جانا۔" اس نے ناراضی کا اظہار کیا تھا۔

"شہر آ گیا ہے مہاو بی بی! آپ کو [illegible] سیدھی گھوں جاتی ہے۔" سردار بیگم مسکرا دیں۔ ہسپتال آ چکا تھا۔

داد بخش نے نیچے اتر کر پچھلی سائیڈ کا دروازہ کھولا اور پھر انہیں سہارا دے کر اترنے میں مدد دی تھی۔ وہ اپنے مقررہ وقت پہ پہنچے تھے۔ ڈاکٹر اپنے روم میں تھا اس لیے ہسپتال پہنچتے ہی نرس سردار بیگم کو اندر ایکسرے کے لیے لے گئی اور وہ دونوں ویٹنگ روم میں ہی رہ گئے۔ مہاو صوفے میں دھنس کر بیٹھ گئی تھی لیکن داد بخش بیٹھنے کے بجائے گلاس وال کے پاس جا کھڑا ہوا تھا جہاں سے باہر ریسپشن کا منظر نظر آ رہا تھا ریسپشن پہ دو لڑکیاں کھڑی تھیں کافی خوب صورت اور اسٹائلش۔۔۔ وہ ہسپتال میں نئے آنے والوں کو گائیڈ کر رہی تھیں۔ انتہائی پروفیشنل سا انداز تھا ان کا۔

داد بخش نجانے کیا سوچتے ہوئے بے دھیانی میں ہی ان کی طرف دیکھے گیا تھا۔

"وہ جو کھڑی ہے وہ والی زیادہ خوب صورت ہے نا؟" اچانک اس کے قریب سے مہاو کی آواز ابھری تھی۔ داد بخش نے چونک کر دیکھا تھا وہ اس کی نظروں کے تعاقب میں ریسپشن پہ کھڑی لڑکیوں کو دیکھ رہی تھی۔

"پتا نہیں۔"

"تمہیں کچھ پتا بھی ہے؟" وہ جل کر بولی۔

اتنے میں سردار بیگم بھی چیک اپ کروا کے ایکسرے روم سے نکل آئی تھیں۔

"کچھ کھانے پینے کے لیے بھی ملے گا یا نہیں؟" مہاو نے داد بخش پر نظر ڈال کر کہا لیکن وہ بے نیاز سردار بیگم کو سیڑھیاں اترنے میں مدد دے رہا تھا۔

"تھوڑی دیر پہلے تم ناشتا کر کے ہی آئی ہو ناں؟"

"میں ناشتا ادھورا چھوڑ کے آئی تھی دادی بیگم!" وہ ناراضی سے بولی۔

"ابھی داد بخش سے کہتی ہوں کسی اچھے سے ہوٹل میں لے چلتا ہے۔" انہوں نے اسے تسلی دی اور مہاو

اندر ہی اندر خوشی سے ناچ اٹھی۔

"داد بخش! گاڑی کسی اچھے سے ہوٹل کے لیے روکنا۔ مہاو کو بھوک لگی ہے۔" انہوں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے تاکید کی تھی۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا اور مہاو آہستگی سے مسکرا دی اسے پتہ تھا داد بخش کی جان جا رہی تھی اس حکم کی تعمیل پہ۔

☆ ☆ ☆

"بانو بی بی! بانو بی بی! دروازہ کھولیے۔" رجائی نے مہانو کے بیڈ روم کا دروازہ بجایا۔

"کون پیچھے لگ گیا ہے؟ اتنی آوازیں کیوں ہو رہی ہو؟" مہانو نے سستی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

"وہ نیچے قاسم صاحب آئے بیٹھے ہیں۔" اس کی اطلاع پہ مہانو ٹھٹک گئی۔

"قاسم صاحب؟ باقی سب کہاں ہیں؟"

"نگار بی بی اور ماہی بی بی کالج گئی ہیں، وارث بچہ اسکول پڑھنے گیا ہوا ہے، سردار بیگم اور راحیل بی بی [illegible] رہی ہیں۔" رجائی نے باری باری سب بتایا تھا۔

"اور داد بخش! وہ کہاں ہے؟ اسے بلاؤ۔" بانو خود قاسم کے سامنے جاتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

"وہ زمینوں کی طرف گیا ہے اس نے کماد فیکٹری بھیجنا تھا۔" رجائی کے پاس سب کی خبر تھی۔

"اچھا تم چائے بناؤ میں آتی ہوں۔" مہانو واپس پلٹی اور اپنا دوپٹہ اٹھا کر اچھی طرح اوڑھتی ہوئی باہر نکل آئی۔

"السلام علیکم!" مہانو آہستگی سے بولی۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ کیسی ہیں آپ؟" قاسم علی چونک کر اپنی جگہ سے کھڑا ہوا تھا۔

"جی ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے میں بھی ٹھیک ہوں۔" اس نے خوشگوار لہجے میں کہا اس کی پر اشتیاق نظریں مہانو پہ ہی تھیں۔

"آپ اس وقت۔۔۔؟" وہ کچھ پوچھتے پوچھتے رک گئی کہیں قاسم برا نہ مان جائے۔

"میں تو شاید نہ ہی آتا مگر قسمت لے آئی۔" قاسم علی اسے دلچسپی سے دیکھتے ہوئے بول رہا تھا۔

"مطلب؟" مہانو انجان بنی۔

"مطلب کہ میں تین چار روز سے شہر گیا ہوا تھا آج ہی واپسی ہوئی ہے راستے سے گزرتے ہوئے سوچا کہ چلو سب سے ملتے ہوئے جاتا ہوں مگر یہاں آ کر پتہ چلا کہ یہاں تو کوئی ہے ہی نہیں سوائے میری قسمت کے۔" قاسم علی کا لہجہ شوخ ہو رہا تھا۔

"یہاں صرف میں ہی نہیں ہوں چھوٹی امی بھی ہیں۔"

"وہ سو رہی ہیں محترمہ۔" رجائی اسے بتا چکی تھی تب ہی وہ اتنا کھل کے بات کر رہا تھا۔

"وہ سوتے میں بھی آنکھ کھلی رکھتی ہیں۔"

"واہ کیا کوالٹی ہے ان کی۔" قاسم علی ہنسا تھا۔

تب ہی داد بخش ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور مہانو کو قاسم علی کے مقابل والے صوفے پہ بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ [illegible] اچانک مداخلت پہ شرمندہ بھی ہو گیا تھا۔

"آئی ایم سوری مجھے پتا نہیں تھا کہ آپ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔" وہ شرمندہ سے لہجے میں کہتا واپسی کے لیے پلٹا۔

"داد بخش! تم بیٹھو گھر پہ اور کوئی بھی نہیں تھا اس لیے مجھے ہی یہاں آنا پڑا۔" مہانو نے جیسے صفائی دی تھی۔

"چائے وغیرہ لی آپ نے؟" داد بخش کو ٹیبل خالی دیکھ کر خیال آیا۔

"تمہاری بانو بی بی اتنی اچھی میزبان نہیں ہے داد بخش! وہ تو مجھے یہاں سے جانے کا کہہ رہی تھی۔" مہانو نے باہر نکلتے ہوئے اس کا جملہ سنا تھا اور مسکراتی ہوئی کچن کی طرف آ گئی۔

"رجائی! ذرا جلدی ہاتھ چلایا کرو، کام کے وقت تمہاری ساری پھرتی نجانے کدھر جاتی ہے؟" مہانو

رجائی پہ خفا ہوئی تھی۔

"بس بانو بی بی اب تیار ہو گیا ہے۔" رجائی برتن اٹھاتے ہوئے بولی۔

"کماد بھجوا دیا تم نے؟" قاسم علی رجائی سے چائے کا کپ لیتے ہوئے داد بخش سے مخاطب ہوا تھا۔

"کچھ کل بھجوایا ہے اور کچھ آج۔" داد بخش نے بھی کپ تھام لیا۔

"اس بار جس شوگر مل کو کماد بھجوانے کا ہمارا ارادہ تھا وہاں پہلا ہاتھ تم نے مار لیا۔" قاسم علی نے کہا۔

"پہلا ہاتھ نہیں قاسم صاحب! دوسرا ہاتھ، میں پچھلے سال بھی اس شوگر مل میں کماد بھیج چکا ہوں، پچھلے سال ہمارا نقصان بھی ہوا تھا ایک ٹرالی کسی کھڈ میں گر گئی تھی۔"

"تم نے وہ پچھلی بار کی کسر اب پوری کر لی ہے۔"

"ظاہر ہے کاروبار میں ہونے والا نقصان کاروبار سے ہی پورا کرنا ہوتا ہے۔ قاسم صاحب! یہ سارا کاروبار، لین دین، کھاد اور خرچہ وغیرہ سردار بیگم کا یعنی میرے پاس ایک امانت ہے اس لیے مجھے اس امانت کی پائی پائی کا حساب کتاب رکھنا ہوتا ہے۔" اس نے رسانیت سے کہا تو قاسم علی چپ ہو گیا۔ "اور رہی بات آپ کے ارادے کی تو اگر مجھے پتہ ہوتا تو شاید میں کہیں اور فروخت کر دیتا۔" داد بخش نے معذرت کی تھی۔

"ارے کوئی بات نہیں یار! مال تم بھجواؤ یا ہم، بات تو ایک ہی ہے ناں؟ اس حویلی میں اور اس حویلی میں کوئی فرق تو نہیں۔" قاسم علی نے سر جھٹکتے ہوئے اطمینان سے کہا اور پھر چائے پینے کے فوراً بعد جانے کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔ داد بخش اسے گاڑی تک چھوڑنے گیا تھا۔

"تمہارے لیے کھانا لگاؤں؟" رجائی کو پتہ تھا کہ وہ صبح سے زمینوں کی طرف نکلا ہوا ہے اور اس نے ابھی تک کچھ بھی نہیں کھایا۔

"میں پہلے نہا لوں پھر کھانا کھاتا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے ڈرائنگ روم میں کھلنے والے لوہے کی جالی کے دروازے کو کھول کر اپنے کمرے کی طرف آ گیا۔

اسے واقعی بھوک لگی ہوئی تھی اس لیے وہ نہا کر سیدھا ڈائننگ روم میں آیا تھا۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا تو چند ہی منٹوں میں رجائی نے کھانا ٹیبل پہ سجا دیا۔

"میرا کھانا۔۔۔!" اچانک مہپارہ کی بلند آواز میں صدا ابھری تھی۔ وہ کالج سے لوٹی تھی اور سیدھی ڈائننگ روم میں آ گئی تھی۔ داد بخش اس کی آواز پہ ٹھٹک گیا۔

"ابھی لگاتی ہوں مہپارہ بی بی!" رجائی تیزی سے پلٹ گئی۔ وہ عین اس کے سامنے والی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ نظریں اسی پہ مرکوز تھیں۔۔۔ لیکن وہ اپنے دھیان میں مگن کھانا کھانے میں مصروف رہا اس کی کوشش جلد از جلد یہاں سے اٹھنے کی تھی۔

کھانا کوئی چرا نہیں لے گا، کھاتے ہوئے دیکھ تو لیا کرو۔"

"نظر ہی تو ساری تباہی کی جڑ ہوتی ہے۔" وہ سکون سے بولا تھا۔

"مجھے دیکھنے سے کون سی تباہی ہو جائے گی؟" مہپارہ چڑ کر بولی تھی۔

"یہی ایک نظر کی بدولت ہی تو انسان کے اندر خواہش جاگتی ہے۔" داد بخش کا ہر جواب ہی عجیب تھا۔

"اور تم خواہشوں کے جاگنے سے ڈرتے ہو؟"

"ہاں! ڈرتا ہوں، کیونکہ جب انسان کے اندر خواہشیں جاگتی ہیں تو پھر ہر چیز کا اور ہر رشتے کا ڈر اور خوف ختم ہو جاتا ہے۔ انسان اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے سب کچھ کر گزرتا ہے۔"

"اتنی پرہیزگاری بھی اچھی نہیں ہوتی داد بخش!"

"اور اتنی بے خوفی بھی اچھی نہیں ہوتی مہپارہ بی بی!"

وہ گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے بولا۔

"تم بزدل ہو اپنی بزدلی چھپانے کے لیے پارسائی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ بزدل مرد کچھ نہیں کر سکتا۔"

"اور بے خوف عورت سب کچھ کر سکتی ہے۔" وہ سخت اور کھردرے لہجے میں کہتا کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"واٹ۔۔۔!" مہپارہ اس کی چوٹ پہ بلبلا اٹھی تھی۔

"میں داد بخش ہوں مہپارہ بی بی! اپنے داد بخش ابھی رہنے دیں، زمین کی خاک کو عرش پہ مت چڑھائیں۔ سر پڑی خاک بربادی کی علامت کہلاتی ہے۔ سردار بیگم نے داد بخش کو فرش سے اٹھا کر عرش پہ بٹھایا، پلیز آپ کچھ مت کیجیے کہ سردار بیگم کو اسی داد بخش کو عرش سے اٹھا کر فرش پہ پھینکنا پڑے، داد بخش نہیں سہہ پائے گا۔" وہ کہتے کہتے جیسے کمزور پڑ گیا تھا اور پھر وہاں سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔

مہپارہ ششدر سی بیٹھی رہ گئی تھی۔ داد بخش اپنے آپ کو اپنی ذات کو کس خول، کس دائرے میں رکھتا تھا یہ تو اسے آج پتہ چلا تھا۔

☼ ☼ ☼

سنہری دھوپ سونا اگل رہی تھی اور لوگ سردی سے بچنے کے لیے سنہری دھوپ کا زیور اپنے تن پہ سجانے کے لیے سورج کے سائے تلے بیٹھے تھے سو آج سردار بیگم کا تخت بھی حویلی کے لان میں سجا دیا گیا تھا اور [illegible] دھوپ ان کے گرد حصار باندھے [illegible] بیٹھے گاؤں کی دو عورتیں بھی ان سے ملنے چلی آئی تھیں۔

"رکھی! آج دھوپ نکلی ہے تو چاول ہی صاف کروا کے رکھوا لو۔" سردار بیگم تکیے کے سہارے ذرا سا اٹھتے ہوئے بولیں۔

"جی سردار بیگم! میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔" رکھی گھٹنوں پہ زور ڈالتے ہوئے بولی۔

"رجائی! اجو اور رفیق سے کہو چاولوں کی بوری نکال کر یہاں رکھ جائیں، میں یہاں کپڑا بچھاتی ہوں۔" رکھی نے ہدایت دی۔ رکھی نے بڑا سا موٹا کپڑا بچھایا اور رجائی، اجو اور رفیق وغیرہ سے کہہ کر گودام سے چاولوں کی بوری نکلوا کر لے آئی تھی۔

"میں بھی ہاتھ بٹاؤں؟" گاؤں کی ایک عورت نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں نہیں رقیہ! بیٹھو تم، تم مہمان ہو یہاں۔" سردار بیگم نے اس عورت کو روک دیا تھا۔

"یہ تو آپ کا بڑا پن ہے سردار بیگم۔" وہ عورت اتنی عزت پہ بڑی خوش ہوئی تھی۔

"ہم دونوں آپ کے پاس کسی کام سے آئے تھے۔" اس عورت نے ذرا ٹھہر کر تمہید باندھی تھی۔

"ہاں ہاں بولو کیا کام ہے؟"

"وہ جی دراصل میرا بیٹا گاؤں کے اسکول سے دس جماعتیں پڑھ چکا ہے اب شہر کے کالج میں پڑھنا چاہتا ہے لیکن ہمیں شہر کے کالج میں داخلے وغیرہ کا کچھ بھی نہیں پتا اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس کا داخلہ کروا دیں۔"

انہوں نے ذرا جھجک کے کہا تھا وہ لوگ اتنی چھوٹی سی بات کے لیے اتنا زیادہ پریشان ہو رہی تھیں۔ سردار بیگم مسکرا دیں۔

"تم پریشان نہ ہو میں داد بخش سے کہوں گی وہ تمہارے بیٹے کا داخلہ کروا دے گا بس دسویں جماعت میں اس کے نمبر اچھے ہونے چاہئیں۔"

"یہ لیں چائے!" رجائی نے ٹرے میں چائے اور بسکٹ سجائے [illegible] کوئی فقیر ہو یا چاہے گاؤں کا کوئی کمین، چاہے اپنا کوئی قریبی عزیز!

"بہت مہربانی سردار بیگم بہت مہربانی۔" وہ مشکور ہونے لگی تھیں۔

سردار بیگم ان کے ساتھ باتوں میں مصروف تھیں جب حویلی کا گیٹ کھلا اور ایک پھنکارتی ہوئی پجارو اندر داخل ہوئی پھر اس میں سے رمیز کا چہرہ نمودار ہوا تھا۔

"رمیز؟" سردار بیگم اسے دیکھ کر چونک گئیں۔

وہ پودوں کی باڑھ پھلانگ کر لان کی طرف ہی آ رہا تھا۔

"السلام علیکم!" اس نے قریب آتے ہوئے اونچی آواز میں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام آؤ میرا بچہ بیٹھو۔" وہ کہنی پہ زور دیتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"کیسی ہیں آپ؟" وہ ان کے پاس تخت پہ ہی بیٹھ گیا تھا۔

بیٹھی۔ اس کے بیٹھتے ہی داد بخش نے دروازہ بند کیا اور ڈرائیونگ سیٹ پہ آ گیا۔ حویلی کا تمام راستہ وہ بالکل خاموش رہی تھی اور اس کی خاموشی اس کے غصے کا اظہار تھی۔ داد بخش نے سکون کا سانس لیا تھا لیکن جیسے ہی اس کی گاڑی حویلی میں داخل ہوئی وہ ٹھٹک گیا سامنے ہی روش پہ بلیک پجارو کھڑی تھی۔

"رمیز صاحب آئے ہیں؟" اس نے حیرانی سے سوچا اور اس کی پجارو کے پیچھے ہی گاڑی پارک کر دی۔

✡ ✡ ✡

"کیا بات ہے جناب ' یہاں مہمانوں کو کمپنی دینے کا کوئی رواج نہیں ہے کیا؟" مہوا شال اوڑھے بالکنی میں کھڑی تھی اور اس کے پیچھے رمیز بھی وہیں چلا آیا تھا۔

"مجھے سب لوگوں کی کمپنی کم پڑ گئی تھی کیا کہ آپ کو میری کمپنی کا خیال آ گیا؟"

"بس یونہی۔" رمیز معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"چھوڑیں بھی آپ تو۔"

"کیوں جناب؟"

"میرا موڈ خراب ہے اس لیے بہتر ہے کہ آپ بھی چپ رہیں اور مجھے بھی چپ رہنے دیں ' دوسرا مجھے یہ جناب شناب کہنا اچھا نہیں لگتا احتیاط کیجئے گا۔" اس نے کرارا سا جواب دیا تھا۔

"تو پھر کیا کہوں؟"

"مہوا۔" وہ دو ٹوک بولی۔

"نہیں میں تمہیں ماہی کہوں گا جیسے باقی سب کہتے ہیں۔"

"ہوں! ٹھیک ہے۔"

"ویسے تمہارا موڈ کیوں آف ہے؟" رمیز نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں زیادہ پرسنل سوال پسند نہیں کرتی۔" مہوا ناگواری سے بولی تھی۔ رمیز نے ذرا سا چونک کر اسے دیکھا وہ صرف ضدی اور ہٹ دھرم ہی نہیں خاصی منہ پھٹ بھی لگ رہی تھی اور کسی منہ پھٹ سے مروت کی توقع رکھنا انتہائی عبث تھا۔ رمیز کو خاصا مشکل پراجیکٹ لگی تھی وہ!

"آج تو خاصی روڈ بھی ہو رہی ہو؟"

"پلیز رمیز بھائی!" وہ جھنجلا کے بولی۔

"صرف رمیز بھی کہہ سکتی ہو۔"

"اوکے اوکے رمیز صاحب پلیز آپ کو برا لگے گا لیکن میں مجبور ہوں آپ سے ٹھیک طرح سے بات نہیں کر پاؤں گی آپ نیچے چلے جائیں۔ بانو اور نگار وغیرہ آپ کو کمپنی دیں گی۔"

رمیز کو تاؤ تو آیا تھا لیکن پھر نظر انداز کر گیا۔

"اوکے میں چلتا ہوں لیکن اس امید کے ساتھ کہ صبح تم سے فریش موڈ کے ساتھ ملاقات ہو گی۔"

رمیز وہاں سے چلا گیا تھا لیکن مہوا وہیں بالکنی میں کھڑی رہی اور اسے کھڑے کھڑے کافی دیر گزر گئی تھی جب مہرو اندر داخل ہوئی۔

"کیا بات ہے؟ کیا آج پھر داد بخش کے ساتھ کوئی جھگڑا ہوا ہے؟" مہرو نے اس سے استفسار کیا تھا۔

"تمہیں کیسے پتہ؟" مہوا نے مہرو کو حیرانی سے دیکھا۔

"پوری حویلی میں ایک وہی تو ہے جو تمہاری بات سے اختلاف کرتا ہے یقیناً" آج بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہو گا؟ کیا آج تم کالج سے اکیلی ہی اس کے ساتھ آئی ہو۔" مہرو نے کافی گہرائی سے مشاہدہ کیا تھا اور درست اندازہ لگایا تھا۔

"مہوا تم جس راستے پر چل رہی ہو انجام سوچا ہے تم نے؟" مہرو کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

"انجام کوئی بھی نہیں سوچتا اور جو انجام سوچتا ہے وہ آغاز بھی نہیں کرتا۔" وہ بھی مہرو کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔

"وہ زمانے اور تھے ماہی جہاں لوگ دل کے کہے پر چل پڑتے تھے ' یہ زمانہ اور ہے یہاں ہر کام باقاعدہ پلاننگ سے اور سوچ سمجھ کر کیا جاتا ہے کیونکہ یہ زمانہ بہت فاسٹ ہے۔ انتہائی تیز رفتار اور تیز دھار۔ یہاں منہ کے بل گرنے کا اور کٹ کے جانے کا اندیشہ زیادہ ہوتا ہے۔" مہرو نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"یہی کہ تم اپنی نادانی اور بیوقوفی سے باز آ جاؤ۔"

"جسے تم بیوقوفی اور نادانی کا نام دے رہی ہو۔ وہ میرے دل کی خوشی ہے بانو!" مہوا تڑپ کر بولی تھی۔

"تمہارے دل کی خوشی دادی بیگم کے دل کا آزار بن جائے گی مہوا اور وہ مفت میں مارا جائے گا' یہ اونچی حویلیوں والے اپنی خود سریوں پہ الزام نہیں ڈالتے ان کے عتاب کا نشانہ غریبوں کے فرزند بنتے ہیں' دادی بیگم ہم سب کے لیے کتنی ہی نرم خو سہی لیکن اس معاملے میں ان کا جلال بھی دیکھنے والا ہو گا اور نشانہ داد بخش ہی بنے گا۔" مہرو نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے اسے سب صاف صاف بتایا تھا۔ مہوا کتنی ہی دیر کچھ کہہ نہ سکی۔

✡ ✡ ✡

"رجالی! داد بخش کہاں ہے؟ دو دن سے کہیں نظر نہیں آیا؟" مہوا کالج سے ابھی لوٹی تھی تو بے ساختہ ہی پوچھ لیا۔ دو دن سے ان دونوں کا کوئی آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔

"اس بے چارے کی تو طبیعت ہی بہت خراب ہے۔" ہاجرہ بیگم ڈائننگ روم میں داخل ہوتے ہوئے اس کی بات سن چکی تھیں لیکن مہوا ان کے جواب پہ بری طرح چونکی تھی۔

"کیا ہوا داد بخش کو؟" اس نے دوسری بار بھی رجالی کو ہی مخاطب کیا تھا۔

"وہ دن مزدوروں کے پیچھے بھاگ دوڑ کرتا رہا' زمینوں پہ ہل چلاتا تھا۔ آدھا کام مزدوروں نے کیا آدھا اس نے خود کیا شام گئے واپس آ کر نہانے گھس گیا۔ اتنی مشقت کرنے کے بعد جسم گرم تھا اس لیے ٹھنڈے پانی سے نہانے کی وجہ سے بخار ہو گیا ہے ابھی اسے چائے دے کر آئی ہوں اس کا گلا بھی خراب ہو رہا تھا۔"

رجالی نے کافی تفصیلی جواب دیا تھا مہوا کی پریشانی دو چند ہو گئی تھی لیکن ہاجرہ بیگم کی موجودگی کے باعث اظہار نہیں کیا۔

"بہت ہی محنتی اور اچھا بندہ ہے داد بخش! سردار بیگم کو ایسا ملازم آنے والی کئی نسلوں میں بھی نہیں ملے گا۔" ہاجرہ بیگم نے طنزیہ سراہا۔

"داد بخش ملازم نہیں ہے اماں بیگم!" مہوا ان کی طرف رخ موڑتے ہوئے چبا کر بولی تھی۔

"تو پھر کیا ہے؟" انہوں نے تمسخر اڑایا۔

"یہ سوال آپ دادی بیگم سے جا کر کریں۔"

"داد بخش میرا بیٹا ہے ' میرا پوتا ہے ' میرا نواسا ہے ' اور کتنے رشتے جتاؤں۔" سردار بیگم کی سماعتوں سے بھی ہاجرہ بیگم کی آواز دور نہیں رہ سکی تھی ' وہ داد بخش کے لیے رجالی کو یخنی بنانے کا کہنے آئی تھیں اور یہ کام ان کے لیے اتنا اہم تھا کہ وہ خود اپنے کمرے سے اٹھ کر یہاں تک آ گئی تھیں۔

"یعنی داد بخش اس حویلی میں وارث کا حصے دار ہے ' جاگیر، جائیداد کا وارث ہو گا تو دونوں کو برابر کا حصہ ملے گا؟" ہاجرہ بیگم اپنے بیٹے کے [illegible] کی طرح انکا سوال آج بے ساختہ ہی زبان تک آ گیا تھا۔

"اس حویلی کی وارث اور حق دار میں خود ابھی زندہ ہوں اور اس حویلی کے وارث اور حق دار کا فیصلہ میں خود کروں گی اور ایک بات کان کھول کے سن لو ہاجرہ بیگم! اس حویلی اور جائیداد سے سب کو برابر کا حصہ ملے گا میں چار گاؤں کے لوگوں میں بیٹھ کر حصہ کروں گی۔"

سردار بیگم سختی سے کہہ کر رجالی کو لے کر وہاں سے چلی گئی تھیں۔ ہاجرہ بیگم ناگن کی طرح بل کھا رہی تھیں' بھری جوانی میں بیوگی کے بعد ان کی آنکھوں نے اگر کوئی خواب دیکھا ہی تھا تو وہ اس حویلی اور جاگیر پہ راج کرنے کا خواب ہی تھا وہ یہ حویلی چھوڑ کر بھی جا سکتی تھیں لیکن اپنے بیٹے کو اور اس حویلی کو چھوڑنے کا حوصلہ نہیں ہوا تھا ان کے تصور میں یہ حویلی اور جائیداد ساری سردار بیگم کے بعد ان کی ملکیت تھی لیکن سردار بیگم تو نجانے کیا کیا سوچے بیٹھی تھیں۔

✲ ✲ ✲

وہ عجیب سی کشمکش کا شکار تھی، دل بے چینی اور اضطراب کے گھیرے میں تھا، دل جس پہ آمادہ تھا دماغ اس پہ انکاری ہو رہا تھا۔ سوچیں بھی مضطرب سی محسوس ہو رہی تھیں۔ کافی دیر وہ بستر پہ لیٹی یونہی کروٹیں بدلتی رہی اور بالآخر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اپنے دھیان کو اس کی سوچ سے ہٹانے کے لیے اس نے ایک جتن کیا اور ٹیلی ویژن آن کر کے بیٹھ گئی۔ تقریباً پانچ منٹ وہ چینل سرچ کرتی رہی پھر ریموٹ بیڈ پہ اچھال کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی الماری کے پاس گئی اور اپنی گرم شال نکال کر اوڑھتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

باہر ہر طرف ملگجا سا اندھیرا اچھل رہا تھا وہ آہستگی سے سیڑھیاں اترتی ڈرائنگ روم میں کھلنے والے دروازے کے پاس آ گئی یہ دروازہ کھلتے اور بند ہوتے ہوئے اچھی خاصی آواز پیدا کرتا تھا اس کی چرچراہٹ دور تک سنائی دیتی تھی۔ مہواہ نے ہینڈل تھام کر جیسے ہی دروازے کو اپنی طرف کھینچ کر کھولا اس کی سماعتوں میں ابھرنے والی چرچراہٹ پورے ڈرائنگ روم میں گونجی تھی وہ اس دروازے کو کوستی ہوئی داد بخش کے کمرے کی راہداری میں داخل ہوئی لیکن جیسے ہی ہینڈل کو چھوڑا دروازے نے بند ہوتے ہوئے بھی وہی احتجاج بلند کیا تھا۔

"منحوس!" وہ بڑبڑاتی ہوئی داد بخش کے بیڈ روم کے سامنے آ رکی۔ ایک لمحے کے لیے ٹھہر کر اپنا موڈ درست کیا اور پھر دروازے پہ ہاتھ سے ہلکا سا دباؤ ڈالا تھا۔

دروازہ کھلتا چلا گیا تھا، داد بخش کبھی بھی اپنے بیڈ روم کا دروازہ اندر سے بند کر کے نہیں سوتا تھا۔ گویا اس کا کچھ بھی پرسنل نہیں تھا۔ مہواہ بنا آہٹ کے اندر آ گئی تھی اندر کمرے میں نیلے رنگ کے زیرو بلب کی مدھم سی فسوں خیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے کا ماحول خاصا خواب ناک لگ رہا تھا مہواہ کے دل کی لے بدل گئی تھی۔

وہ بے آواز قدموں چلتی ہوئی اس کے بیڈ کے قریب آ گئی۔ داد بخش دائیں کروٹ سویا ہوا تھا۔

"داد!" اس نے مدھم سی آواز میں پکارا۔

"داد!" دوبارہ آواز دی گئی لیکن وہ شاید دوائیوں کے زیر اثر گہری نیند سویا ہوا تھا۔ مہواہ بیڈ کے قریب ہی دو زانو قالین پہ بیٹھ گئی۔ اس کے عین سامنے داد بخش کا چہرہ تھا۔ اس کے سیاہ بال اس کی کشادہ پیشانی پہ گرے ہوئے تھے ہر وقت ان کی عزت اور احترام میں جھکی رہنے والی آنکھیں نیند سے ہمکنار تھیں سیاہ گھنی مونچھوں تلے دبے کناوار ہونٹ نرمی سے بھینچے ہوئے تھے اور دو تین دن کی بڑھی ہوئی شیو بھی مہواہ کی عمیق نگاہ سے مخفی نہیں رہ سکی تھی۔

"داد بخش! انجانے کس ماں کے لعل ہو تم؟ تمہاری جوانی تو اس نے دیکھی ہی نہیں، دیکھ لیتی تو فخر کرتی تمہیں پیدا کر کے یہ اترائی۔"

آہستگی سے اپنا ہاتھ شال سے نکالا اور۔۔۔ اس کی پیشانی سے بال ہٹا کر اس کی پیشانی پہ رکھ دیا تھا۔ اس کی پیشانی [illegible] کی طرح تپ رہی تھی۔ داد بخش جیسے ہاتھ کے لمس سے کرنٹ کھا کے بیدار ہوا تھا وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا تھا۔

"مہواہ بی بی؟" اس نے ملگجے سے اندھیرے میں بھی اسے پہچان لیا تھا۔

"کیسی طبیعت ہے تمہاری؟ میں تمہاری طبیعت پوچھنے آئی تھی۔" مہواہ نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل پہ رکھا چھوٹا سا لیمپ جلا دیا تھا۔

"میری طبیعت؟ مگر اس وقت؟" اس نے وال کلاک کی سمت دیکھا رات کا ایک بجا تھا۔

"جب فرصت ملے گی تب ہی پوچھوں گی نا؟" اس نے بے نیازی ظاہر کی۔

"لیکن مہواہ بی بی! اس وقت آپ کا میرے بیڈ روم میں آنا مناسب نہیں پلیز آپ خود سمجھنے کی کوشش کریں۔" داد بخش کی بخار سے سرخ آنکھوں میں لال لال ڈورے تیر رہے تھے اور گہری نیند ہلکورے لے رہی تھی سو داد بخش بمشکل اپنے اعصاب قابو میں لا پایا تھا۔

"ہر وقت مناسب اور غیر مناسب کے چکروں میں مت رہا کرو، کبھی کسی کے احساسات اور جذبات بھی سمجھ لیا کرو۔" مہواہ کو اس کی پریشانی اور فکر پہ غصہ آیا تھا۔

داد بخش نے کمبل ہٹا کر پاؤں بیڈ سے نیچے اتارے تھے۔

"اب تم اٹھ کیوں رہے ہو؟"

"میرے سر پہ بدنامی کھڑی ہے اور میں سویا رہوں؟"

"واٹ؟ اب میں تمہارے لیے بدنامی ہو گئی ہوں؟" وہ تلملا کر بولی۔

"جہاں کوئی مضبوط رشتہ نہ ہو وہاں بدنامی ہی ہوتی ہے، میرے اور آپ کے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے۔" اس نے سلیپر پہنے اور کھڑا ہو گیا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" مہواہ چبا کر بولی اسے غصہ آ رہا تھا۔

"کمرے سے باہر۔"

"[illegible] باہر بہت ٹھنڈ ہے۔"

"میں آپ کو بھی تو اپنے کمرے سے نہیں نکال سکتا۔" داد بخش نے کرسی پہ رکھی اپنی گرم چادر اٹھائی بخار سے تپتے ہوئے وجود پہ ماحول کی خنکی تیزاب کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔

"تم خود بھی کہیں نہیں جا سکتے، بیٹھو یہاں۔" مہواہ نے داد بخش کے سینے پہ ہاتھ رکھ کے اسے پیچھے بیڈ کی طرف دھکیلا تھا۔

"بیٹھو۔" مہواہ نے اسے بٹھا کر چھوڑا۔

"کمبل اوڑھو اور پاؤں اندر کرو۔" اس نے داد بخش کے پاؤں سے سلیپر بھی نکال دیے تھے لیکن وہ اپنی جگہ پہ دم بخود سا رہ گیا تھا۔

ایک عرش پہ اسے سردار بیگم نے بٹھایا تھا اور ایک عرش پہ مہواہ بی بی محمد بٹھا رہی تھی۔ داد بخش کی نظریں مہواہ پہ گڑی تھیں۔ وہ جو اسے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا آج آنکھیں پھیلائے اسے دیکھ رہا تھا اس نے نظر اٹھا کر داد بخش کو دیکھا لیکن اسے اپنی طرف ہی دیکھتے پا کر اس کی پلکیں بے ساختہ جھک گئی تھیں وہ سراپا اس کے سامنے تھی اس کی محبت اور ایک عنایت کی منتظر اس کے روم روم سے داد بخش کی محبت کی مہک اٹھ رہی تھی۔ وہ سراپا سندل ہی ہوئی تھی۔ داد بخش چاہتا تو اپنے گھٹنوں پہ رکھے اس کے ہاتھوں پہ اپنے ہاتھ رکھ کر اس کی منتظر محبت کو قبولیت کی سند دے سکتا تھا۔ لیکن اگر وہ یہ چاہتا تو اور بہت کچھ کھو دیتا اور اس بہت کچھ میں سرفہرست سردار بیگم کا اعتبار اور اپنے کردار کا فخر تھا اور وہ دونوں چیزیں ہی نہیں کھو سکتا تھا بس اسے اس وقت اس لمحے کو کھونا تھا سو اس نے کھو دیا۔

وہ مہواہ بی بی محمد کے ہاتھ بے مروتی سے جھٹک کر کھڑا ہو گیا اور دوسرے ہی لمحے کمرے سے باہر نکل گیا تھا اور مہواہ اپنی جگہ پہ پتھرائی ہوئی بیٹھی رہ گئی تھی۔

✲ ✲ ✲

وہ لان کے بیچوں بیچ کھڑا انتہائی گہری گہری سانسیں لے رہا تھا، ماحول میں شامل دھند کے باعث زمین سے عجیب سی مہک اٹھ رہی تھی اور اس مہک میں گیلی مٹی کی آمیزش محسوس ہو رہی تھی۔ لان کی گھاس بھیگی بھیگی لگ رہی تھی اور اس دھند کے باعث رات کی سیاہی سرخ دھندلی روشنی میں بدل رہی تھی اسے لان میں ٹہلتے ہوئے اور ایک فیصلے پہ پہنچتے ہوئے کافی دیر لگ گئی تھی۔

فجر کی اذان میں آدھا گھنٹہ رہ گیا تھا۔ اس نے نماز پڑھنے کے لیے بھی جانا تھا اس لیے بہتر تھا کہ یہ کام ابھی ختم کر لیتا۔ اس نے سردار بیگم کے کمرے کے باہر ٹھہرتے ہوئے ایک پل کے لیے سوچا اور پھر دستک دے ڈالی تھی۔ سردار بیگم تہجد کے وقت اٹھتی تھیں اور صبح سورج کی پو پھٹنے تک جاگتی رہتی تھیں اس دوران وہ قرآن پاک، نماز اور وظیفہ پڑھتی رہتی تھیں اور اگر اس عبادت سے فارغ ہو جاتیں تو تسبیح لے کر اپنے بستر میں بیٹھ جاتی تھیں۔

وہ شاید کچھ پڑھ رہی تھیں اسی لیے داد بخش کی دوسری دستک پہ بھی جواب موصول نہیں ہوا تھا۔ اور بالآخر تیسری دستک دینے کے بعد وہ دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا تھا۔ سردار بیگم سامنے ہی جائے نماز پہ بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔

انہوں نے آنکھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کا کہا تھا ان کی اجازت پہ کافی بوجھل قدموں سے آگے بڑھ کر کرسی پہ بیٹھ گیا تھا۔

اللہ کے حضور دعا مانگ کر داد بخش کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" انہوں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"جی ٹھیک ہوں۔"

"کہاں سے آرہے ہو؟"

"باہر لان سے۔"

"کیوں خیریت؟ تمہاری تو طبیعت خراب تھی پھر اتنے سرد موسم میں باہر کیوں چلے گئے؟"

داد بخش چند ثانیے یونہی خاموش بیٹھا رہا پھر کرسی اٹھا کر جائے نماز کے قریب آکے بیٹھ گیا اور ہاتھ بڑھا کر سردار بیگم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ حیرانی سے اس کی حرکات نوٹ کر رہی تھیں۔

"آپ کے سامنے کوئی بات کروں تو کیا اس کے لیے قسم کھا کر یقین دلانا ضروری ہے؟" وہ کافی سنجیدگی سے ٹھہر ٹھہر کر بات کر رہا تھا۔ سردار بیگم کے تجسس میں اضافے کے ساتھ ساتھ پیشانی کی شکنوں میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم؟" انہیں حیرت ہوئی تھی۔

"جو میں پوچھ رہا ہوں آپ وہ بتائیں۔" داد بخش کا لہجہ اور انداز دو ٹوک ہو رہے تھے۔

"تم خود جانتے ہو کہ تمہاری بات میرے لیے کیا اہمیت رکھتی ہے اور مجھے کتنا یقین ہے تم پہ؟"

"لیکن یہ بات ہی کچھ ایسی ہے کہ آپ کا اعتماد ڈول سکتا ہے۔"

"بات جو بھی ہو داد بخش! تم پہ میرا یقین اتنا کمزور بھی نہیں کہ ڈانواں ڈول ہو جائے۔"

سردار بیگم کا لب و لہجہ مضبوط تھا جس پہ داد بخش نے اطمینان سے گہری سانس خارج کی تھی۔

"میں بہت دنوں سے بلکہ بہت عرصے سے یہ بات آپ کے علم میں لانا چاہ رہا تھا لیکن خود میں اتنی ہمت اور حوصلہ نہیں پا رہا تھا کہ آپ کے سامنے یہ سب کہہ پاتا' میں سوچتا تھا کہ سب خود بخود ہی ٹھیک ہو جائے گا' وقت کے ساتھ ساتھ اسے عقل آجائے گی وہ سمجھ جائے گی لیکن وہ بہت نادان ہے۔ آپ نے مجھے [illegible] کیا' مجھ پہ بھروسہ کیا' اپنی عزتیں' اپنی امانتیں مجھ پہ یقین رکھتے ہوئے مجھے سونپ دیں' میں سب کچھ ہو سکتا ہوں مگر بے غیرت اور بے ضمیر نہیں ہو سکتا کہ آپ کی عزت یا امانت میں کوئی خیانت کروں' میں آپ کی عزتوں کا امین ہوں اور ہمیشہ ہی رہنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ میں اس حویلی سے دور ہو جاؤں' میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔ اس وقت سے پہلے جب اس حویلی کے مکین خود مجھے دھکے دے کر نکالیں۔"

داد بخش کہتے کہتے جیسے تھک گیا تھا اور سردار بیگم ساکت و صامت سی بیٹھی اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ حیرت سے گنگ ہوئی لگ رہی تھیں۔ "کس کی بات کر رہے ہو تم؟" کچھ دیر بعد وہ سرگوشی میں بولیں۔

"مہرو بی بی کی!" ان کے اندیشوں کی تصدیق ہو گئی تھی سردار بیگم جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئی تھیں۔

"پہلے کبھی کیوں نہیں بتایا؟" ان کی آواز کسی کنوئیں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

"پہلے بات بھی اس نوبت تک نہیں پہنچی تھی۔"

"نوبت؟" انہوں نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"آج رات وہ میرے کمرے میں آئی تھیں میری عیادت کے لیے مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کب آئیں؟ میں دوائیوں کی وجہ سے نیند میں تھا' پتہ تو تب چلا جب مہرو بی بی نے میری پیشانی پہ ہاتھ رکھا۔"

داد بخش نے آج سارے راز عیاں کر دیے تھے اور اپنے ضمیر پہ رکھا بوجھ بھی اتار پھینکا تھا اب سردار بیگم چاہے جو بھی فیصلہ سنائیں مگر وہ ہلکا پھلکا اور آزاد ہو چکا تھا اب اس کے ضمیر پہ کوئی بوجھ نہیں تھا کہ وہ سردار بیگم سے کچھ چھپا رہا ہے۔

"آپ پلیز مجھے یہاں سے دور بھیج دیں۔" اس نے پھر کہا تھا انہیں اکسایا تھا۔

"تمہیں کیوں بھیجوں؟ اسے ہی نہ بھیج دوں؟" انہوں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا تھا اور داد بخش ٹھٹک گیا تھا۔

"کیسے؟"

"جیسے ہر بیٹی ماں باپ کا گھر چھوڑ کے جاتی ہے۔" سردار بیگم کا لہجہ مضبوط اور فیصلہ کن تھا۔ داد بخش حیرت سے دیکھتا رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

پچھلے چار پانچ دنوں سے سردار بیگم گہری سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھیں انہیں سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنی عزت کے ... کیسے بچائیں؟ لیکن اوپر والا اسباب بنانے والا ہے تو سب ممکن ہو جاتا ہے۔ دو ہی دن ہوئے تھے رمیز کو واپس شہر گئے ہوئے اور آج دو دن بعد راشدہ بیگم اپنے شوہر قدیر ہمدانی کے ہمراہ حویلی چلی آئی تھیں ہاجرہ بیگم اپنے بھائی کو دیکھ کر خوب آؤ بھگت کر رہی تھیں جبکہ راشدہ بیگم آج رابعہ بی بی (بڑی بھابھی) پہ فدا نظر آرہی تھیں انہیں باقاعدہ پیغام بھیج کر کمرے سے ڈرائنگ روم میں بلایا تھا اور انہی سے باتیں کیے جا رہی تھیں اور اس چیز پہ سردار بیگم کو بھی حیرت ہوئی تھی لیکن ایک گھنٹے بعد جب راشدہ بیگم نے اپنا مدعا بیان کیا تو سب کو سب سمجھ آگیا تھا یہاں تک کہ ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے داد بخش کے قدم بھی تھم گئے تھے۔

"اماں بیگم! آپ جانتی تو ہیں ناں کہ مہرو کے لیے دیا ہوا رمیز کا پرپوزل ولی بھائی نے خود قبول کیا تھا جب ساجدہ نے قاسم علی کے لیے مہرو کو مانگا تھا تو میں نے بھی مہرو کی پیدائش کے بعد یہی سوال کیا تھا اور وہ بھی خوشی خوشی مان گئے تھے۔"

راشدہ بیگم کی آمد کا جواز داد بخش کے سامنے کھل چکا تھا وہ وہاں سے الٹے قدموں واپس پلٹا تھا۔

"مہرو بڑی ہوئی تو ساجدہ نے اس رشتے کا باقاعدہ اعلان کیا تھا' منگنی کی تھی پھر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟" سردار بیگم کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔

"میں ایسا کیسے کرتی اماں بیگم؟ آج کل کے بچوں کو آپ جانتی تو ہیں ذرا سی ان کے مزاج کے خلاف بات کرو تو اتنے اتنے دن ان کے موڈ ہی آف رہتے ہیں۔ میں ڈرتی تھی کہ نجانے بچوں کی پسند اور ناپسند کیا ہو گی لیکن شکر ہے کہ رمیز کو خود بخود ہی مہرو کا خیال آگیا ہے' وہ اسے پسند کرنے لگا ہے شادی پہ آمادہ ہے اور اسی لیے میں آج بھاگی بھاگی چلی آئی ہوں۔" راشدہ نے چہک کر کہا تھا۔

"تم اور تمہارا بیٹا تو آمادہ ہو لیکن یہ بھی دیکھنا ہے کہ مہرو اور مہرو کی والدہ کیا کہتی ہیں۔" انہوں نے بیٹی کو یقین رکھنے کا کہا تھا۔

"ارے اماں بیگم! اس میں کچھ نہ کہنے کی بات کہاں سے آگئی ہے بھئی رشتہ تو پہلے ہی طے ہو چکا ہے' رابعہ بھابھی بھی جانتی ہیں یہ اس روز یہاں ہی تو تھیں۔" راشدہ بیگم نے حیرت اور تعجب کا اظہار کیا تھا۔

"اس روز اور آج کے روز میں بڑا فرق ہے میری بچی!"

"لیکن اماں بیگم! زبان تو وہی ہے ناں؟" راشدہ نے زور دے کر کہا تھا۔

"زبان دینے والا مر چکا ہے۔" وہ بے تاثر انداز میں بولیں' راشدہ بیگم اپنے شوہر قدیر ہمدانی اور پھر رابعہ بی بی کو دیکھ کر رہ گئیں۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں میں' تم یہ رشتہ تقریباً بھلا چکی تھیں اب اچانک کیسے یاد آگیا؟" اس بار راشدہ تھوڑا سا کھسیا گئیں لیکن پھر سنبھلنے میں بھی چند سیکنڈ ہی لگے تھے۔

"اماں بیگم! وجہ آپ کو بتائی تو ہے۔ میں صرف بچوں کی وجہ سے چپ تھی۔"
"اور اب ہم بھی بچوں کی وجہ سے ہی چپ ہیں۔"
"کیا مطلب ہے آپ کا؟"
"مطلب تمہیں سوچ سمجھ کر بتائیں گے۔"
"مگر اماں بیگم!" راشدہ نے کچھ کہنا چاہا۔
"کچھ وقت دو ہمیں۔" وہ وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" مہاوہ کا دماغ گھوم گیا تھا۔ وہ اک جھٹکے سے صوفے سے کھڑی ہو گئی تھی۔
"یہ ہو چکا ہے۔" مہانو نے رسانیت سے کہا۔
"میں رمیز بھائی کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی۔"
"وجہ؟" مہانو یوں پوچھ رہی تھی جیسے انجان ہو۔
"وجہ تم جانتی ہو مہانو!"
"میں جانتی ہوں ناں؟ دادی بیگم نہیں جانتیں۔" مہاوہ نے ذرا جھجکتے کہا۔
"تو تم بتا دو ناں انہیں۔"
"میں کسی پہ ظلم نہیں کر سکتی۔"
"ظلم مگر کس پہ؟" مہاوہ کو حیرانی ہوئی۔
"داد بخش پہ۔"
"اس میں داد بخش کہاں سے آگیا؟"
"اس میں داد بخش کو تم ہی تو لے کر آئی ہو ماہی! تمہارے کیے دھرے کی سزا داد بخش کو ملے گی۔ اس کا اس حویلی کے سوا اور کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ ماہی! اسے ذلیل مت کرو' یہاں سے نکالا گیا تو کہاں جائے گا؟" مہانو نے اسے سمجھانے کے لیے ایک بار پھر ناکام کوشش کی تھی۔
"یہاں سے کیوں نکالا جائے گا؟ اگر دادی بیگم کو واقعی اس سے محبت ہے تو وہ اسے کبھی نہیں نکالیں گی۔"
"یہ تو بعد کی بات ہے ناں کہ کیا ہو گا؟ ابھی تو صرف یہ سوچنا ہے کہ۔۔۔"
"مہانو! میں کچھ بھی سوچنا اور سمجھنا نہیں چاہتی' میں نے جو کہہ دیا ہے بس کہہ دیا ہے میں رمیز بھائی سے شادی نہیں کروں گی' میری طرف سے انکار ہے' میرا انکار دادی بیگم تک پہنچا دینا۔"
وہ کہہ کے وہاں سے چلی گئی تھی اور مجبوراً مہانو نے اس کا انکار دادی بیگم کے حضور پیش کر دیا تھا جس پہ انہوں نے مہاوہ کو اپنے کمرے میں طلب کیا تھا اور مہاوہ دل میں بہت سے ارادے باندھ کے ان کے حضور حاضر ہوئی تھی۔
"جی دادی بیگم! آپ نے بلایا تھا مجھے؟" اس نے ان کے روبرو بیٹھتے ہوئے سر جھکا کر دھیمے لہجے میں پوچھا تھا لیکن اس کی سرکشی کی خوشبو اس کے اک اک انداز سے محسوس ہو رہی تھی۔
"تم نے رمیز کے لیے انکار کیا ہے؟"
"جی۔" اس نے اعتراف کیا۔
"میں تم سے انکار کی وجہ نہیں پوچھوں گی بلکہ یہ پوچھوں گی کہ کیا وہ بھی اس انکار میں شامل ہے جو اس انکار کی وجہ ہے؟" سردار بیگم کا سوال مہاوہ کو پریشان کرنے کے لیے کافی تھا۔
"دیکھو میری جان! میں ایک اصول پرست اور انصاف پسند جاگیردار کی بیوی ہوں۔ آج سے بہت سال پہلے راشدہ نے قدیر کو پسند کیا تھا اور مجھ سے چھپایا تھا لیکن جب بات شادی پہ آگئی تو اسے اپنا راز کھولنا پڑا۔ اس نے چوہدری امتیاز کے رشتے سے انکار کیا تھا لیکن میں نے انکار کی وجہ نہیں پوچھی تھی بلکہ صرف اتنا کہا تھا کہ جس کے ساتھ رخصت ہونا چاہتی ہو اسے اپنے ساتھ لے آؤ' وہ آکر تمہارا ہاتھ مجھ سے مانگ لے۔ اس نے قدیر سے رابطہ کیا وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ حاضر ہو گیا انہوں نے ہاتھ مانگا میں نے بچی کو دھوم دھام سے اس کے ساتھ رخصت کر دیا۔ کیونکہ مجھے پتا تھا کہ میں اگر انکار یا اختلاف کروں گی تو بھی کوئی فائدہ نہیں ہو گا بلکہ الٹا مجھے ساری زندگی اس کی طرف سے دھڑکا لگا رہے گا اس لیے میں نے وہ دھڑکا ہی ختم کر دیا عزت اور شرافت کے ساتھ۔"
وہ بات کرتے کرتے لمحہ بھر کو گویا سانس لینے کو رکیں۔
"اور آج اتنے سالوں بعد میری پوتی نے بھی وہی انکار کیا ہے۔ اس لیے میں آج بھی انکار کی وجہ نہیں پوچھوں گی' بلکہ یہی کہوں گی کہ جس کے ساتھ رخصت ہونا چاہتی ہو اسے اپنے ساتھ لے آؤ' وہ آکر تمہارا ہاتھ مجھ سے مانگ لے۔"
سردار بیگم نے سپاٹ سے انداز میں کہہ کر بات ہی ختم کر ڈالی تھی اور مہاوہ کاکا سی دیکھتی رہ گئی۔
"لیکن دادی بیگم ایسے کیسے؟"
"میں نے کہا ناں تم میرے سامنے اس گاؤں کے کسی کمی کو بھی لے آؤ گی تو میں تمہاری شادی اس کے ساتھ کر دوں گی' کیونکہ اس حویلی نے کبھی کسی کے قدموں میں قید کی زنجیریں نہیں ڈالیں۔" انہوں نے فیصلہ سنا دیا تھا مہاوہ ششدر سی بیٹھی تھی۔

☆ ☆ ☆

"رجائی! اے رجائی۔۔۔ رجائی!" مہاوہ خود پہ ضبط کرتی رجائی کو پکارتے جا رہی تھی۔
"جی ماہی بی بی!" وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتی سامنے آئی تھی۔
"داد بخش کہاں ہے؟" اس کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ رجائی چونک گئی تھی۔
"میں تم سے پوچھ رہی ہوں رجائی؟" وہ چیخ کر بولی۔
"جی وہ تو کل سے ڈیرے پہ ہے۔"
"کب آئے گا؟"
"جی آج تو نہیں آئے گا۔ زمینوں پہ کام ہو رہا ہے۔"
"تو پھر اجو سے کہو گاڑی نکالے۔"
رجائی اجو کو گاڑی نکالنے کا پیغام پہنچانے چلی گئی۔
"ماہی! یہ کیا کر رہی ہو؟" مہانو اس کے پیچھے آئی تھی۔
"ڈوبنے سے پہلے بچاؤ کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہوں۔" وہ آنکھوں کے گوشے رگڑتے ہوئے بولی۔
"اسے آزمائش میں مت ڈالو ماہی۔"
"اسے آزمائش میں نہ ڈالا تو میں نہ ادھر لگوں گی نہ پار۔" اس نے تلخی سے جواب دیا۔
"جی ماہی بی بی! گاڑی تیار ہے۔" رجائی واپس آتے ہوئے بولی۔
"چلو میرے ساتھ۔" وہ رجائی کو اشارہ کرتی آگے بڑھ گئی تھی۔
"گاڑی کی اسپیڈ تیز رکھو۔" اس نے اجو کو ہدایت دی۔ اجو نے فوراً حکم کی تعمیل کی تھی گاڑی کا رخ ڈیرے کی طرف تھا۔

☆ ☆ ☆

اوائل مارچ کے دن تھے' موسم بہت خوب صورت ہو رہا تھا لیکن وہ بہت بے چین تھا' دل میں کہیں ایک دھڑکا سا تھا کہ وہ پتا نہیں کیا کرے گی' اتنی آسانی سے تو ہار ماننے والی نہیں ہے۔
لیکن اس نے ایک بار بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ مہاوہ اس کے پیچھے ڈیرے تک بھی پہنچ جائے گی۔۔۔ ان کے بڑے سے وسیع و عریض ڈیرے کے احاطے میں برگد کا بڑا سا درخت لگا ہوا تھا جس کی چھاؤں ڈیرے کے پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی اور اسی چھاؤں کے نیچے داد بخش چارپائی پہ اوندھا لیٹا نجانے کن سوچوں میں گم تھا کہ ڈیرے کے اندر آکر رکنے والی گاڑی کے انجن بند ہونے کی آواز پہ یکدم سر اٹھا کر دیکھا تھا۔
"سردار بیگم کی گاڑی؟" اسے اچنبھا ہوا۔ وہ اک جھٹکے سے سیدھا ہو کر اٹھ بیٹھا تھا۔ گاڑی سے رجائی کی شکل نمودار ہوئی تھی اور اس کے بعد مہاوہ نیچے اتری۔
"مہاوہ بی بی۔۔۔؟" داد بخش کی آنکھیں پھیل گئیں اس کے کانوں میں خطرے کا الارم بجا تھا۔
"تم لوگ جاؤ مجھے داد بخش سے کچھ بات کرنی ہے۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے اجو اور رجائی سمیت وہاں موجود تمام ملازموں کو ڈیرے کے احاطے

سے چلے جانے کا اشارہ کیا تھا۔

"آئی بی بی!" وہ لوگ سر جھکا کر باہر نکل گئے۔ مہواہ مضبوط قدم اٹھاتی اس کے سامنے آ رکی۔

"میں تمہیں لینے آئی ہوں' میرے ساتھ حویلی چلو۔" وہ داد بخش کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی لیکن داد بخش نظر چرا گیا تھا۔

"کیوں؟"

"میرا ہاتھ مانگنے۔"

"میری آپ کے ساتھ شادی نہیں ہو سکتی۔"

"کیوں نہیں ہو سکتی داد بخش؟"

"کیونکہ میں کرنا ہی نہیں چاہتا۔" اس نے صاف صاف کہہ دیا۔

"داد بخش تم کس کو دھوکا دے رہے ہو؟ مجھ کو یا پھر اپنے آپ کو؟" مہواہ نے اسے گریبان سے پکڑ لیا تھا۔

"مہواہ بی بی دھوکا تو آپ دے رہی ہیں' وہ بھی صرف اپنے آپ کو۔" اس نے تلخی سے کہا تھا۔

"تم مجھ سے نظر ملا کر بات کیوں نہیں کرتے۔" وہ اس کا گریبان [illegible]

"میں خود غرض ہونے سے ڈرتا ہوں۔"

"تم بزدل ہو حقیقت کے سامنے آنے سے ڈرتے ہو۔"

"آپ چلی جائیں بی بی! یکطرفہ سلسلے پائیدار نہیں ہوتے۔" اس نے ضبط کرتے ہوئے رخ موڑا۔ "یک طرفہ؟ میری طرف دیکھ کر کہو داد بخش کہ مہواہ ولی محمد کے تمام سلسلے یک طرفہ ہیں؟" اس نے اس کے گریبان کو جھٹکا دیا تھا۔ چند ثانیے داد بخش چپ رہا پھر اس نے جھکی نظر اٹھائی نمی پیالے چھلکنے کو بے تاب تھے۔

"ہاں مہواہ بی بی! آپ کے سارے سلسلے یکطرفہ ہیں "آپ اس سفر میں تنہا ہیں اور تنہائی کا سفر بہت جلد تھکا دیتا ہے۔"

"داد بخش! کیا تمہارے دل میں میرے لیے کچھ بھی نہیں ہے؟" وہ بے بسی سے بولی۔

"نہیں۔" اس نے مہواہ کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا اور مہواہ ساکت ہو گئی تھی۔

"داد!" وہ زیر لب پکار کے رہ گئی۔

"معافی چاہتا ہوں مہواہ بی بی!" داد بخش نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے اور مہواہ اسے اور اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو دیکھتی پیچھے بیٹھتی چلی گئی تھی۔ داد بخش مزید دیکھ نہ سکا اور پلٹ کر دوسری طرف چلا گیا۔

برگد کے درخت پہ بیٹھی کوئل بڑی سریلی آواز میں روئی تھی اس کی کوک بہت دور تک جا رہی تھی لیکن مہواہ کے دل کی کوک اس کے دل کی دیواروں تک ہی ٹکرا کر رہ گئی تھی۔

وہ نین تیرے' وہ نین میرے
جدوں پیار ہویا بن چار گئے
اے آنو اپنی قسمت سی!
وہ جت گئے' وہ ہار گئے

مہواہ نے اپنی ہچکیوں کو دباتے ہوئے سر سیٹ کی بیک سے ٹکا دیا تھا لیکن رخساروں پہ بہنے والے آنسو نہیں رکے تھے!

✲ ✲ ✲

رمیز اور مہواہ کی منگنی کے فوراً بعد ہی راشدہ بیگم نے شادی کے لیے بھی جلدی مچا دی تھی لیکن سردار بیگم پہلے مہروز کی شادی کرنا چاہتی تھیں' اس لیے انہوں نے کوئی ہاں نہیں بھری تھی لیکن دوسرے ہی روز ساجدہ بیگم بھی ایک جھجک حویلی آن پہنچی تھیں۔ وہ بھی اپنی بہو کو رخصت کرانے کی خواہش مند تھیں اور سردار بیگم کو بھلا کیا چاہیے تھا ایک ساتھ دو شادیوں کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ بھاگ دوڑ زیادہ داد بخش ہی کر رہا تھا۔ ہر کام اس کے ذمے تھا فرنیچر والوں کو آرڈر دینے کے بعد انویٹیشن کارڈز کا ڈیزائن پسند کرنے کے لیے حویلی آیا تھا اور اس کے بعد جیولر کے پاس بھی جانا تھا کپڑوں جوتوں کی خریداری کا کام تو عورتوں کو خود ہی کرنا تھا اس لیے بڑے بڑے اور

بھاری کام داد بخش پہ ڈال دیے تھے اور وہ سب نپٹاتا پھر رہا تھا۔

اس وقت بھی وہ "وی شادی کارڈ" سے لے کر نکل رہا تھا جب اپنے دھیان میں کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔

"داد بخش۔؟" وہ اپنے نام پہ ٹھٹکا۔

"شاہ میر۔؟" داد بخش بھی اسے پہچان چکا تھا اور پھر دونوں یکدم ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے تھے۔

"تم کب آئے آسٹریلیا سے؟" داد بخش خوشگوار حیرت سے پوچھ رہا تھا۔

"مجھے یہاں آئے ہوئے تقریباً" مہینہ ہو گیا ہے تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن تم نے شاید نمبر ہی چینج کر لیا تھا؟"

"تم ملک چینج کر سکتے ہو تو کیا ہم نمبر چینج نہیں کر سکتے؟" داد بخش کو آج اپنے بھولے بچھڑے دوست سے مل کر بہت خوشی ہو رہی تھی۔

"کر سکتے ہو جب کر سکتے ہو لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دو کہ اور کیا کچھ چینج کیا ہے ان چار سالوں میں۔" شاہ میر [illegible]

"تمہارے سوا کچھ بھی چینج نہیں کیا یار! اتنی اوقات ہی نہیں تھی۔" داد بخش استہزائیہ ہنسا تھا۔

"بس بس رہنے دے اپنی اوقات مجھ سے پوچھ یا پھر سردار بیگم سے پوچھ۔"

"پوچھنے کی کیا ضرورت ہے میں خود ہی جانتا ہوں۔"

"لیکن تم شادی کارڈ شاپ میں کیا کر رہے تھے؟ کہیں تم شادی تو نہیں کر رہے؟" شاہ میر نے اندازہ لگایا۔ داد بخش بے ساختہ ہنس دیا تھا۔

"وہ دراصل سردار بیگم کی بڑی دونوں پوتیوں کی شادی ہے' اسی لیے سب کام مجھے ہی کرنا پڑ رہے ہیں۔"

"چلو یار! کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

"اس وقت جلدی میں ہوں پھر ملیں گے۔" پھر وہ ایک دوسرے سے نمبروں کا تبادلہ کرتے ہوئے رخصت ہوئے تھے۔ دونوں نے ایک ساتھ ایم بی اے کیا تھا' وہ یونیورسٹی میں اس کا کلاس فیلو تھا۔

✲ ✲ ✲

وہ گہری نیند سو رہی تھی جب اس کے موبائل پہ رنگ ہونے لگی چند سیکنڈ تو اسے سمجھ میں ہی نہیں آیا پھر موبائل کی طرف دھیان گیا۔

"ہیلو؟"

"ہائے! میری جان کیسی ہو؟" دوسری طرف رمیز کی آواز تھی خمار آلود اور بوجھل سی۔

"آپ؟" مہواہ کے سوئے ہوئے احساسات بیدار ہو گئے تھے۔

"ہاں میں ہی ہوں رمیز' تمہارے انتظار اور تمہاری طلب میں پاگل' اک اک لمحہ گن گن کے گزارنے والا۔" رمیز کے اک اک لفظ سے بے تابی اور بے قراری چھلک رہی تھی۔

"یہ آپ کس لہجے میں بات کر رہے ہیں؟" اس کی طرز گفتگو پہ اس کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔

"تمہیں جب تصور [illegible] میں سوچتا ہوں میرا لہجہ میری آواز ایسے ہی ہو جاتے ہیں۔"

"پلیز رمیز بھائی! کنٹرول یور سیلف — اینڈ مائنڈ یور لینگویج۔" اس نے جواباً تلخی سے کہا تھا۔

"یار اب کنٹرول ہی تو نہیں ہو رہا' پتہ نہیں یہ بائیس دن کیسے گزریں گے؟" رمیز پھر بھی باز نہیں آیا تھا۔

"بائیس دن کیسے گزریں گے میں یہ تو نہیں جانتی لیکن میں اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ آپ نے اگر مجھ سے بات کرنی ہے تو بائیس دن بعد فون کیجئے گا۔"

اس نے کہہ کر فون آف کر دیا تھا اور پھر تکیہ چہرے پہ رکھ کے سونے کے لیے لیٹ گئی لیکن دوسری طرف رمیز بھڑک رہا تھا۔ اس نے جب کچھ بھی ذہن میں نہ آیا تو داد بخش کا نمبر ڈائل کر لیا تھا۔

وہ دن بھر کا تھکا ہوا تھا اس لیے آج عشاء کی نماز پڑھنے کے فوراً بعد ہی سو گیا تھا۔ موبائل کے متواتر

...گہری نیند سے بیدار ہوا تھا لیکن اسکرین پہ رمیز کا نمبر دیکھ کر چونک گیا۔

"رمیز صاحب کا فون اس وقت؟" اسے اپنے حواس ٹھکانے پہ لاتے ہوئے چند سیکنڈ لگے تھے اور پھر کال اٹینڈ کرلی تھی۔

"داد بخش! کہاں ہو تم؟"

"اپنے کمرے میں ہوں رمیز صاحب۔"

"یعنی حویلی میں ہی ہو؟"

"جی ہاں۔"

"میرا ایک کام کرو۔"

"حکم کیجیے رمیز صاحب!" اس نے مؤدب سے لہجے میں کہا۔

"اس فون کو آن رکھو اور اپنی مہلو بی بی کو دے کر آؤ... میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" رمیز کا حکم داد بخش کے چودہ طبق روشن کر گیا تھا اس نے حیرت سے وال کلاک کی سمت دیکھا رات کے اڑھائی بجے کا وقت ہو رہا تھا۔

"اس وقت؟" داد بخش نے بے ساختہ کہا۔

"میری منگیتر اور ہونے والی بیوی ہے میں اس سے کسی بھی وقت بات کر سکتا ہوں انڈر اسٹینڈ؟" رمیز کا لہجہ تحکم آمیز تھا۔ وہ چپ ہو گیا۔

"تو تم فون لے کر اس کے پاس جاؤ' اس کا اپنا فون آف جا رہا ہے۔" رمیز کے کہنے پہ داد بخش کو اضطراراً وہ سلیپر پہن کر باہر نکل آیا اس کا رخ مہلو کے بیڈ روم کی طرف تھا سیڑھیاں طے کرتا وہ اس کے کمرے کے سامنے آرکا اور آہستگی سے دستک دی پہلی دستک پہ کوئی ریسپانس نہیں ملا تھا لیکن دوسری دستک پہ دروازہ چوپٹ کھل گیا تھا وہ ننگے پیر اور ننگے سر روئی روئی متورم آنکھوں سمیت اس کے سامنے تھی۔

اسے دیکھ کر وہ حیران کھڑی رہ گئی۔

"رمیز صاحب کا فون ہے آپ کے لیے۔" داد بخش نے فون آگے بڑھایا اور رمیز کا نام سنتے ہی مہلو کے تن بدن کو آگ چھو گئی تھی۔

"اپنے رمیز صاحب سے کہو کہ ابھی آرام کریں اور اطمینان رکھیں' مہلو ولی محمد آپ کی بیچ ہی مر جائے گی۔" وہ داد بخش کو براہ راست دیکھتے ہوئے اتنی اونچی آواز میں بولی کہ رمیز نے بھی بآسانی سنا تھا۔

"اسے کہو ایک بار میرا فون سنے۔" اس نے داد بخش سے کہا۔

"وہ ایک بار آپ سے بات کرنا..." ابھی الفاظ داد بخش کے منہ میں ہی تھے کہ مہلو نے اس کے ہاتھ سے موبائل چھینا اور پوری قوت سے زمین پہ دے مارا تھا موبائل ٹکڑوں میں بدل گیا تھا اس کے کئی ٹکڑے سیڑھیوں سے نیچے بھی گرے تھے۔

"چلے جاؤ یہاں سے ورنہ تمہارا سر بھی پھاڑ دوں گی۔" وہ یکدم چلائی اور روتے ہوئے دھڑام سے دروازہ بند کرلیا تھا جبکہ داد بخش رات کے اس پہر ایسا ہنگامہ دیکھ کر خاموش رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مہر نگار...!"

"جی دادی بیگم؟" مہر نگار شادی کے لیے تیار کروائے جانے والے کپڑے بیڈ پہ پھیلا کر دیکھ رہی تھی جب سردار بیگم نے اسے پکار لیا۔

"مہلو کہاں ہے؟"

"اپنے کمرے میں ہے۔"

"راشدہ چار پانچ مرتبہ فون کر چکی ہے کہ مہلو کو شہر بھیجیں وہ اپنی پسند سے لہنگا خرید لے مگر وہ یہ لڑکی ہر بار ٹال دیتی ہے اس سے کہو میری نرمی کا فائدہ نہ اٹھائے نہ جانے کون سے خود ساختہ روگ لگائے پڑی ہے۔ راشدہ اور قدیر کیا سوچتے ہوں گے اس کے بار بار انکار پہ۔"

"آپ پریشان نہ ہوں' میں اسے کہتی ہوں چلی جائے گی وہ۔" مہرو نے انہیں تسلی دی اور وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

سردار بیگم اندر ہی اندر مہلو کی طرف سے خاصی پریشان بھی تھیں۔ اس لڑکی نے انہیں الجھا کے رکھ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج شاہ میر نے اسے اپنے گھر بلایا تھا اور اس کے سامنے ایک پرکشش آفر رکھی تھی۔ داد بخش کتنے ہی لمحے حیرانی کے عالم میں شاہ میر کو تکتا رہ گیا تھا۔

"کیا بات ہے ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟" شاہ میر نے تعجب سے پوچھا۔

"تم یہ آفر کس بنیاد پر دے رہے ہو؟ ہمیں ملے ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں؟"

"کیا مطلب داد بخش! ایک دوست ہونے کے ناتے اگر میں تمہیں بزنس میں شمولیت کی آفر کر رہا ہوں تو اس میں کیا بری بات ہے؟ پیسہ میں لگاؤں گا کام تم کرو گے بس اتنی سی بات ہے۔" شاہ میر نے کندھے اچکائے۔

"لیکن میرے پاس تو اتنا پیسا نہیں کہ میں کسی بزنس میں شراکت اختیار کروں....؟" داد بخش نے حقیقت بتائی۔

"یار میں کب کہہ رہا ہوں کہ تم پیسہ لگاؤ' میں تو بس [illegible] کا کچھ سوچو شادی ہو گئی تو کیا دو گے انہیں' کیا سردار بیگم ہی بوجھ اٹھائیں گی؟" شاہ میر نے اسے فیصلے پہ اکسایا تھا۔

"نہیں شاہ میر! یہ تو میرا ابھی اپنے آپ سے عہد ہے کہ جب تک خود کچھ نہ کرلوں شادی نہیں کروں گا۔" داد بخش کا لہجہ مضبوط تھا۔

"تو پھر کرو' دیر کس بات کی ہے؟" اور داد بخش سوچنے کا وقت لے کر وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

وہ سردار بیگم کو نہیں چھوڑ سکتا تھا' لیکن ساری زندگی ان پر انحصار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں اگر دونوں کام ایک ساتھ ایڈجسٹ ہو جاتے تو پھر اچھا تھا وہ اپنے کام کرنے کی خواہش بھی پوری کر لیتا اور سردار بیگم کی ذمہ داریاں بھی۔ اس وقت اس کے ذہن میں یہی کچھ چل رہا تھا وہ حویلی پہنچا تب بھی سوچ میں گم تھا

"داد بخش! ادھر آؤ۔" ہاجرہ بیگم نے اونچی آواز میں پکارا۔

"جی بیگم صاحبہ؟" وہ فوراً قریب آیا تھا۔

"اجو سے کہو گاڑی نکالے میں نے اور مہلو نے شہر جانا ہے۔"

"اجو تو نہیں ہے اس کو لانڈری والوں کی طرف بھیجا ہے۔"

"اوہ ہم نے تو راشدہ بھابھی کو ٹائم دے رکھا ہے۔" ہاجرہ بیگم پریشان ہو گئیں۔

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ داد بخش کے ساتھ چلی جاؤ تم دونوں۔" سردار بیگم اندر داخل ہوئیں۔ مہلو صوفے پہ چپ بیٹھی تھی۔

"جاؤ داد بخش! گاڑی نکالو۔" انہوں نے پوتی کا سر تھپکتے ہوئے داد بخش کو حکم دیا تھا۔

گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے داد بخش کی نظر بے ساختہ بیک ویو مرر کی طرف گئی تھی۔ مہلو کی نظریں [illegible] بیک ویو مرر پہ ہی فوکس کیے رکھتی تھی لیکن آج اس کی نظروں کی بے رخی بہت بڑی تبدیلی کا ثبوت تھی۔

☼ ☼ ☼

راشدہ بیگم انہی لوگوں کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ راشدہ بیگم کے صرف دو ہی بیٹے تھے رمیز بڑا تھا اور سمیر چھوٹا تھا سمیر اسٹڈی کی غرض سے دوستوں کے ساتھ ہاسٹل میں رہتا تھا جبکہ رمیز اتنے سالوں سے ابھی تک یونیورسٹی سے ہی چپکا ہوا تھا دراصل وہ کافی رنگین مزاج لڑکا تھا رنگوں اور خوشبوؤں میں رہنے والا یونیورسٹی سے نکلنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا اور آئندہ اس کے بزنس وغیرہ کے بھی کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے کیونکہ اسے کام کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اسے بس "پکی پکائی" چاہیے تھی اور راشدہ بیگم اس

کے کرتوتوں سے بہت ہاجرہ بھی واقف تھیں اور فکر مند بھی تھیں لیکن اس نے مہوہ کو پسندیدگی کی سند بخش کر راشدہ بیگم کی سوچوں کو اک نیا رخ دے دیا تھا۔

مہوہ بیاہ کر دوسری حویلی جانے والی تھی۔ مہر نگار اور وارث کافی چھوٹے تھے اور رہی مہوہ تو وہ اس کی بیوی بن کے ہمیشہ کے لیے اس کی دسترس میں آجاتی۔ اس طرح وہ حویلی کا سرپرست بھی بن سکتا تھا کیونکہ حویلی میں ایک اس کی تائی بیگم تھیں اور ایک پھوپھی بیگم وہ کون سا اس پہ کوئی روک ٹوک کر سکتی تھیں؟ دونوں اس کی اپنی اور سگی تھیں انہیں رمیز سے زیادہ عزیز بھلا کون ہو سکتا تھا؟ رمیز بیٹھے بٹھائے جاگیر کا مالک بن جاتا۔

آج مہوہ ہونے والی بہو کے ناتے ان کے گھر پہلی بار آئی تھی۔ راشدہ بیگم اس کے واری صدقے جا رہی تھیں۔

"قدیر بھائی کہاں ہیں؟" ہاجرہ بیگم صوفے پہ بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"وہ اسلام آباد گئے ہیں کسی کام سے۔ کل آجائیں گے۔"

"تم سناؤ میری جان کیسی ہو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟ اتنی ست کیوں ہو رہی ہو؟" راشدہ بیگم نے مہوہ کو بازو کے حلقے میں لے کر اپنے کندھے سے لگایا تھا۔

"شادی کے دنوں میں ہر لڑکی ایسی ہی ہو جاتی ہے۔" ہاجرہ بیگم نے مسکرا کر مہوہ کو دیکھا تھا۔ آج کل وہ بھی بڑی خوش نظر آتی تھیں کہ چلو اس حویلی اور جاگیروں میں میرے بھتیجے کا تو کوئی حصہ ہو ہی گیا ناں!

"مارکیٹ کب چلنا ہے؟" ہاجرہ بیگم نے ٹائم دیکھا تین بج رہے تھے۔

"وہ میں نے جس بوتیک سے مہوہ کا لہنگا تیار کروانا ہے اس کی ڈیزائنر چار بجے آتی ہے۔"

"ارے وہ داد بخش کہاں ہے؟" راشدہ بیگم نے یاد آنے پہ پوچھا۔

"باہر گاڑی میں ہو گا۔"

"ارے نہیں وہ باہر کیوں ہے؟ بلائیں اس کو۔ اماں بیگم کو پتہ چلا تو مجھے عاق نامہ بھیج دیں گی۔" راشدہ بیگم خود ہی اسے بلانے کے لیے کھڑی ہو گئی تھیں۔

"رہنے دو 'اب' ہمارے درمیان کہاں گھس کے بیٹھے گا؟ اماں بیگم نے تو اپنے ہر ملازم کو سر پہ چڑھا رکھا ہے اور یہ تو ان کا چہیتا ہے آخر۔" ہاجرہ بیگم ناگواری سے بولیں۔ مہوہ نے اتنے عرصے میں پہلی بار آنکھیں اٹھا کر ہاجرہ بیگم کو دیکھا تھا اس کی نظروں میں کاٹ تھی لیکن اپنی بیزاری اور کوفت کے اظہار میں مگن ہاجرہ بیگم اس کی نظروں کی کاٹ محسوس نہیں کر سکی تھیں۔

"یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن اماں بیگم کی وجہ سے ہر وقت نبھانا پڑتی ہے۔"

راشدہ بیگم کہہ کر باہر چلی گئیں لیکن وہاں جا کر پتہ چلا کہ داد بخش ان کے چوکیدار کے کوارٹر میں نماز پڑھنے گیا ہے۔ وہ چپ چاپ واپس لوٹ آئیں۔

"وہ عصر کی نماز ادا کر رہا ہے شاید سفر کے دوران قضا ہو گئی تھی۔" ان کا لہجہ دھیما تھا۔ جبکہ ہاجرہ بیگم پہلو بدل کر رہ گئیں۔ "ہونہہ! ایک ڈرائیور اور [illegible] بنتا ہے۔" انہوں نے اس کی [illegible] پہ طنز کرنے سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔

راشدہ بیگم مہوہ کے لیے کچھ کھانے کو منگوا رہی تھیں کہ بوتیک سے کال آ گئی۔ اور پھر ان لوگوں کو جلدی گھر سے نکلنا پڑ گیا تھا۔ وہ بھی نماز پڑھ کے آ چکا تھا فوراً ہی وہ لوگ بوتیک کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔

وہ لوگ بوتیک کے سامنے اتریں تو مہوہ داد بخش کے پاس ٹھہر گئی۔

"تم بھی ساتھ آجاؤ 'میرے دل کا بوجھ' تو نہیں اٹھا سکے 'دل کی تباہی کا بوجھ ہی اٹھا لینا' میرا مطلب ہے کہ شاپنگ بیگ ہی اٹھا لینا' ہیلپ ہو جائے گی۔" اس نے اک اک لفظ جل کر منہ سے ادا کیا تھا اور داد بخش اس کے ایسے زہر میں بجھے لفظوں پہ سن سا کھڑا رہ گیا تھا۔

وہ وہیں کھڑا سوچ رہا تھا جب شاہ میر کی کال آ گئی شاہ میر اپنا کاروبار سیٹ کرنے میں لگا ہوا تھا اور داد بخش کے شادیوں سے فارغ ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ شاہ میر سے بات کرتے ہوئے بوتیک سے باہر سیڑھیوں پہ آ کھڑا ہوا تھا لیکن شاہ میر اس کی غائب دماغی فوراً نوٹ کر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات کے گیارہ بجے کا وقت تھا جب وہ لوگ شاپنگ سے فارغ ہوئے تھے اور واپس راشدہ بیگم کے گھر آتے ہوئے انہیں بارہ بج گئے تھے سردار بیگم شام سے اب تک انہیں کئی بار فون کر چکی تھیں۔

"اماں بیگم! کیا بات ہے؟ آپ اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہیں کیا ہاجرہ بھابھی اور مہوہ کسی غیر کے گھر آئی ہوئی ہیں؟" راشدہ بیگم نے تھک کر صوفے پہ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"غیر کی بات نہیں ہے راشدہ! دراصل مہوہ مایوں کی دلہن ہے کل شام اس نے مایوں بیٹھنا ہے اور وہ گھر سے باہر گھوم رہی ہے ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا جب شادی کی تاریخ طے ہو جاتی ہے تو دلہن گھر سے باہر نہیں [illegible] بد شگونی ہوتی ہے [illegible] قدیر کی ضرورت [illegible]۔"

"ارے نہیں اماں بیگم! اب کوئی بد شگونی نہیں ہوتی وہ زمانے اور تھے ایسے وہم پالنے والے۔ آپ بے فکر رہیں مہوہ اپنے گھر میں ہے چند دن بعد بھی تو اس نے اسی گھر میں آنا ہے؟"

"خیر چھوڑو وہ واپس کب آ رہی ہیں؟"

"آج وہ واپس نہیں آئیں گی بارہ بجے کا ٹائم ہو رہا ہے اور ابھی مہوہ کے لہنگے سے میچنگ زیور بھی لینا ہے۔ یہ اپنی جیولری پسند کر کے ہی جائے گی۔"

راشدہ بیگم کی بات پہ سردار بیگم کو پریشانی لاحق ہوئی۔ لیکن راشدہ نے...

"اماں بیگم! کیا آپ کو ہم پہ اتنا بھی اعتبار نہیں؟" راشدہ بیگم نے افسوس کا اظہار کیا تو سردار بیگم چپ ہو گئیں۔

"داد بخش کو واپس بھیج دوں؟"

"نہیں نہیں داد بخش بھی وہیں رہے گا اس کے لیے بیڈ روم کھلوا دو کافی تھک چکا ہو گا۔" انہوں نے فوراً روک دیا تھا۔

"او کے میں اس کے سونے کا انتظام کرواتی ہوں اب آپ بھی سو جائیے۔" راشدہ بیگم نے فون بند کر دیا تھا۔

پھر ملازمہ سے کہہ کر انہوں نے ہاجرہ بیگم اور مہوہ کے لیے بیڈ روم کھلوائے تھے۔ داد بخش کے لیے تو گیسٹ روم کھولا تھا۔ مہوہ کافی تھکی ہوئی اور بیزار ہو رہی تھی وہ فوراً ہی سونے کے لیے چلی گئی۔ وہ دونوں خواتین باتیں کرتی رہیں۔

رات کے ایک بجے قدیر ہمدانی کی اسلام آباد سے واپسی ہوئی تو ان کو اٹھنے کا خیال آیا تھا۔ قدیر ہمدانی اپنی بہن کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے لیکن باتیں کرنے کا ارادہ کل صبح پہ ٹال کے بیڈ روم میں چلے گئے لیکن راشدہ بیگم پھر بھی بیڈ روم میں نہ گئیں وہ اکیلی لاؤنج میں بیٹھی ہوئی تھیں۔

انہیں رمیز کا انتظار تھا کہ اس کا کسی سے سامنا نہ ہو [illegible] لیکن [illegible] اس وقت گھر واپس [illegible] حواسوں میں [illegible] راشدہ بیگم کے خدشے کے عین مطابق وہ جب گھر میں داخل ہوا تو اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اس کے دوست اسے گیٹ تک چھوڑ کے گئے تھے۔

"آپ... جاگ رہی ہیں؟" رمیز کو انہیں اکیلے بیٹھے دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔

"ہاں تمہارے انتظار میں...!"

"واؤ میرے 'میرے انتظار میں مگر کیوں؟" رمیز سیڑھیوں کی ریلنگ تھام کے بمشکل کھڑا تھا۔

"کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ تمہیں اس حالت میں شادی سے پہلے حویلی کا کوئی بھی فرد دیکھے۔" وہ غصہ دباتے ہوئے بولیں۔

"حویلی... کا فرد؟ یہاں کیسے؟" اسے حیرانی ہوئی۔

"ہاجرہ بھابھی' مہوہ اور داد بخش یہاں ہی ہیں' شاپنگ کرتے ہوئے لیٹ ہو گئے تھے اس لیے میں نے

انہیں یہیں روک لیا ہے کب سے جگے ہوئے ہو؟ اپنے بیڈ روم میں جاؤ اور صبح اپنا حلیہ درست کر کے سامنے آنا۔"

وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں لیکن رمیز کانٹے میں ڈوبا ہوا ذہن ایک ہی لفظ پہ اٹک کر رہ گیا تھا — مہاوہ!

"اب کھڑے کیوں ہو؟ جاؤ اپنے بیڈ روم میں۔" وہ پلٹ کر دبے لہجے میں دوبارہ اس سے مخاطب ہوئی تھیں۔

"جا رہا ہوں ڈیئر ماما۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں کہتا اوپر آ گیا اور اپنے بیڈ روم میں آ کر اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ اپنی شرٹ اتار کر پھینکی اور صوفے پہ گر کر سگریٹ پینے لگا لیکن لگاتار دو تین سگریٹ پینے کے باوجود اس کا ذہن اس نام کی گرفت سے آزاد نہیں ہوا تھا۔ وہ بالآخر اٹھ کر بیٹھ گیا اور جارحانہ تیوروں سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اس نے باری باری بیڈ روم چیک کیے۔ ماجرہ بیگم جس بیڈ روم میں تھیں اس کا لاک اوپن تھا لیکن جس بیڈ روم میں مہاوہ سو رہی تھی وہ اندر سے لاک تھا۔

"ابھی کھول لیتا ہوں۔" اس پر شیطانیت سوار ہو چکی تھی۔ وہ سیڑھیاں اترتا ہوا کچن میں آیا تھا اور کچن کا وہ کیبنٹ کھولا جہاں راشدہ بیگم گھر کے کمروں کی چابیاں رکھتی تھیں۔ چابیوں کا گچھا اٹھا کر اسے مہاوہ کے بیڈ روم میں آنے میں بس پانچ منٹ لگے تھے۔ اس نے بغیر کوئی آہٹ پیدا کیے دروازے کا لاک کھولا اور ہینڈل گھما کر اندر آ گیا اور اندر داخل ہو کر دروازہ لاک کر دیا مگر وہ اپنی فتح کے عالم میں یہ بھول گیا کہ وہ چابیوں کا گچھا باہر دروازے کے لاک میں ہی جھولتا ہوا چھوڑ آیا ہے۔

مہاوہ جس بیڈ روم میں سو رہی تھی اس کا لیمپ خراب تھا اس لیے اسے ایک انرجی سیور جلا کر سونا پڑا تھا اور اس انرجی سیور کی روشنی میں رمیز کی گہری نظریں اس پہ جم گئی تھیں اس کی ہونے والی بیوی اس کو دھتکار کر بات کرنے والی حسینہ آج اس کے سامنے تھی۔

❋ ❋ ❋

یہ اس کے لیے نئی جگہ تھی اس لیے اسے کوشش کے باوجود نیند نہیں آ رہی تھی وہ نجانے کتنی بار کروٹیں بدل چکا تھا اس گیسٹ روم میں کوئی ایسی چیز بھی نہیں تھی کہ وہ اپنا ٹائم ہی پاس کر لیتا اور نہ ہی وہ اٹھ کر باہر جا سکتا تھا کیونکہ وہ یہاں مہمان تھا اور کسی کے گھر میں یوں رات کے وقت اٹھ کر گشت کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔ حویلی میں ہوتا تو اور بات تھی اسی لیے وہ زبردستی آنکھیں بند کیے لیٹا رہا لیکن جیسے ہی اس کے موبائل پہ رنگ ہوئی وہ چونک گیا تھا کیونکہ کال سردار بیگم کی تھی۔

"السلام علیکم!" اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کال ریسیو کی۔

"کیا بات ہے تم جاگ رہے تھے؟" انہیں اتنی جلدی کال ریسیو ہونے پہ حیرت ہوئی تھی۔

"جی وہ دراصل نئی اور اجنبی جگہ ہے اس لیے نیند نہیں آ رہی۔" اس نے وضاحت کی۔

"تم رمیز کے پاس بیٹھ جاتے تھوڑی دیر کے لیے؟"

"رمیز صاحب گھر پہ نہیں تھے ابھی تھوڑی دیر پہلے آئے ہیں اور اس وقت میں ان کے پاس کیا بیٹھتا؟" اس نے سر جھٹک کر کہا۔

"کیوں رمیز کہاں گیا ہوا تھا؟"

"شاید اپنے دوستوں کے ساتھ گئے تھے۔"

"مہاوہ اور ماجرہ سو گئی ہیں؟"

"جی وہ تو سو گئی ہیں لیکن آپ کیوں جاگ رہی ہیں اس وقت؟"

"بس میرا بچہ میرا دل یونہی لیٹے لیٹے گھبرانے لگا تو میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آج علی محمد اور اس کے باپ کی بہت یاد آ رہی تھی۔ آج وارث کی ماں گھر پہ نہیں تھی اسی لیے وہ میرے پاس سونے کے لیے آ گیا اور اس کی صورت دیکھ دیکھ کر علی محمد کی شکل آنکھوں میں گھومنے لگی ہے۔ دل پہ اداسی چھا گئی ہے۔" سردار بیگم کی

آواز میں بھی اتر آئی تھی۔

"سردار بیگم! اتنی اداسی اور مایوسی وہ بھی آپ کے لہجے میں؟" داد بخش نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔

"داد! میرے بچے میں بھی انسان ہوں بوڑھی ہو چکی ہوں مگر اپنے بچوں کے لیے خود کو جوان رکھتی ہوں لیکن کب تک ایسا کروں گی؟ اب تو یہی دعا ہے کہ اللہ میری پوتیوں کو آباد کرے اور مجھے جیتے جی تمہاری خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔" انہوں نے بھیگے لہجے میں کہتے ہوئے دعا دی تھی۔

"انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا اور اللہ آپ کا سایہ ہمارے سروں پہ سلامت رکھے۔" وہ بھی دل کی گہرائیوں سے بولا تھا۔

"داد! تم مجھے بتاؤ مہاوہ نے اب تو تم سے کوئی بات نہیں کی؟" سردار بیگم کی سوئی مہاوہ پہ آن رکی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ انہیں جواب دیتا کسی کی چیخوں کی آواز پہ داد بخش بری طرح چونک گیا تھا۔

"داد بخش! تم چپ کیوں ہو گئے؟"

"وہ باہر کسی کے چیخنے کی آواز آ رہی ہے، باہر شور سا ہے۔" وہ عجلت سے کہتے ہوئے لپک کر باہر نکلا تھا۔

"کیسا شور ہے؟" سردار بیگم کے دل پہ ہاتھ پڑا۔

"مہاوہ بی بی کی آواز ہے میں دیکھتا ہوں۔"

داد بخش موبائل بند کر کے جیب میں ڈالتا سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔

مہاوہ دروازہ پیٹ رہی تھی اور ساتھ ہی چیخ رہی تھی۔

"بچاؤ۔" وہ بلند آواز سے پکاری۔

"تمہیں کوئی بھی نہیں بچائے گا اس وقت سب نیند میں ڈوبے ہوئے ہیں۔" رمیز کی خباثت زدہ آواز پہ داد بخش کے قدم تیز ہو گئے تھے اس نے جاتے ہی دروازے کو ٹھوکر ماری تھی لیکن دروازہ لاک تھا۔

"مہاوہ بی بی!" داد بخش نے اونچی آواز میں پکارتے ہوئے اپنی طرف سے اسے تسلی دی تھی۔

"داد دروازہ کھولو داد!" وہ ماہی بے آب کی مانند تڑپی اور داد کی نظر چابیوں کے گچھے کی طرف گئی

تھی اللہ نے خود ہی داد کی سبیل نکال دی تھی۔ اس نے تالے سے چابی گھمائی اور دروازہ بڑے عزم سے کھول دیا تھا۔ سامنے مہاوہ کے منہ پہ رمیز کا ہاتھ جما ہوا تھا وہ اس کی آواز کا گلا گھونٹنا چاہتا تھا اور داد بخش کا مہاوہ کو بغیر دوپٹے کے اس حال میں دیکھ کر خون کھول اٹھا تھا اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پہنچتے ہی اپنے فولادی ہاتھ کا مکا رمیز کے منہ پہ رسید کیا تھا۔ رمیز کو داد بخش سے اس حرکت کی توقع نہیں تھی جبھی اچانک حملے سے بچ نہ سکا اور پیچھے کی طرف دیوار کے ساتھ جا لگا۔ ساتھ ہی منہ سے کراہ نکلی تھی۔

"داد بخش! یہ کیا کر رہے ہو؟" ماجرہ بیگم، قدیر ہمدانی اور راشدہ بیگم بھی ننگے پیر بھاگتے ہوئے اوپر آئے تھے لیکن اوپر مہاوہ کے بیڈ روم کی صورت حال دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں مہاوہ کی قمیص بازوؤں سے پھٹی ہوئی تھی دوپٹہ نیچے قالین پہ مجروح حالت میں پڑا تھا اس کے بال بکھرے ہوئے اور چہرا تھپڑوں کے نشان سے سرخ پڑ رہا تھا۔ ماجرہ بیگم کی ٹانگیں لرزنے لگی تھیں۔

"اس ذلیل کو مروا دوں گا۔" وہ بولا "اس کا خون پی جاؤں گا میں۔ اس نے سردار بیگم کی عزت پہ ہاتھ ڈالا ہے میں اس کے ہاتھ کاٹ دوں گا۔"

داد بخش کی آنکھوں سے ہی نہیں منہ سے بھی شعلے نکل رہے تھے۔

"بس کرو کیا ہو رہا ہے یہ سب؟" راشدہ بیگم بیٹے کی درگت بنتے نہیں دیکھ سکی تھیں۔

"آپ دیکھ نہیں رہیں کیا ہو رہا ہے؟" داد بخش یکدم دہاڑا۔

"یہ تم کس لہجے میں بات کر رہے ہو؟" راشدہ بیگم غصے سے بولیں۔

"میں اسی لہجے میں بات کر رہا ہوں جس لہجے کو آپ ٹھیک طرح سے سمجھ سکیں گی۔" داد بخش نے پلٹ کر زمین پہ گرا دوپٹہ اٹھایا اور مہاوہ کے گرد خود ہی لپیٹ دیا تھا۔ اس وقت وہ کوئی اور ہی داد بخش نظر آ رہا تھا بے خوف، نڈر اور غصیلا۔

ایک لمحے کے لیے تو روتی بلکتی مہواہ نے بھی حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

"یہ جھوٹ بول رہا ہے بام! میں اپنے بیڈ روم میں سونے کے لیے جا رہا تھا کہ مجھے مہواہ کے کمرے سے باتوں کی آواز آئی اور میں اس طرف آ گیا دروازہ اندر سے لاک تھا اسی لیے میں کچن سے چابیاں لے آیا اور ... اور جب دروازہ کھولا تو یہ دونوں ... یہ دونوں اپنی ہی رنگ رلیوں میں گم نظر آئے ... مجھے دیکھ کر انہوں نے اپنا الزام میرے سر ڈال دیا اور اس نے مجھے مارنا شروع کر دیا۔"

رمیز نے مکاری کی حد کر ڈالی تھی جس پہ داد بخش اور مہواہ اپنی جگہ پہ دم بخود رہ گئے تھے جبکہ راشدہ بیگم کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ انہیں بیٹے کا پلان سمجھ میں آ گیا تھا کہ اب بچنے کا یہی طریقہ تھا۔

"سنا ماجرہ بھابھی؟ سنا آپ نے یہ کیا گل چھرے اڑا رہے تھے؟ یہ ہو رہا تھا یہاں؟" راشدہ بیگم نے پاٹ دار آواز میں گرجتے ہوئے اپنے بیٹے پر پردہ ڈالا تھا لیکن ماجرہ بیگم جو ساکت کھڑی نظر آ رہی تھیں ان کا دل رمیز کی جھوٹی کہانی پہ ایمان نہیں لا پا رہا تھا۔ بے شک وہ داد بخش سے خار کھائے رہتی تھیں لیکن داد بخش کے کردار پہ انہیں رتی برابر بھی شک نہیں تھا۔

"پھپھو ...؟" مہواہ کی آواز جیسے کنویں سے سنائی دی تھی۔

"مر گئی پھپھو! تم نے حویلی کے نوکر کے ساتھ منہ کالا کر کے ہماری عزت کا جنازہ نکال دیا ہے۔ اگر اتنا ہی پسند تھا یا اتنی ہی عشق و عاشقی تھی تو میرے بیٹے پہ ڈورے ڈالنے کی کیا ضرورت تھی؟ پہلے ہی بتا دیتیں اور یہ ... یہ ہماری حویلی میں اسی لیے آیا تھا ہماری ہی عزت میں نقب لگانے کے لیے۔" راشدہ بیگم کا واویلا شروع ہو چکا تھا۔

"راشدہ! یہ کیا بکے جا رہی ہو؟ آرام سے بیٹھ کر ساری بات سمجھاؤ۔" قدیر ہمدانی نے پہلی بار مداخلت کی تھی۔

"سمجھانے کو رہ ہی کیا گیا ہے؟ میں ابھی فون کرتی ہوں اماں بیگم کو۔" راشدہ بیگم نیا گیم کھیلنے کے لیے تیار ہو چکی تھیں۔

"راشدہ بھابھی! اس وقت اماں بیگم کو کچھ مت بتائیں۔" ماجرہ بیگم نے پہلی بار لب کشائی کی تھی۔

"کیوں نہ بتاؤں؟ انہوں نے ایک عمر ہو گئی یہ سانپ لا کر ہمارے سینے پہ بٹھا رکھا ہے۔ آج اس سانپ نے ڈس ہی لیا نا!"

راشدہ بیگم داد بخش پہ قہر آلود نظر ڈالتے ہوئے بولیں۔ وہ چپ کھڑا تھا۔ لیکن اس دوران ہی اس کا موبائل بجنا شروع ہو گیا تھا کال کرنے والی سردار بیگم ہی تھیں۔ راشدہ بیگم کو پتہ چل گیا تھا تب ہی داد بخش کے ہاتھ سے فون جھپٹ کر کان سے لگا لیا تھا۔

"اماں بیگم! اماں ہیں آپ؟ آ کر اپنے چہیتے کے کرتوت دیکھیے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے اس نے نمک حرام نکلا ہے آپ کا لاڈلا ..."

"کس کی بات کر رہی ہو؟" سردار بیگم کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"آپ کے داد بخش کی ..." اس کی طرف دیکھتے ہوئے راشدہ بیگم نے چبا کر کہا تھا اور دوسری طرف سے فون بند ہو گیا تھا۔

داد بخش نے ان سب پہ اک طائرانہ سی نظر ڈالی اور رمیز کو غضب ناک نظروں سے دیکھتا ہوا۔ مہواہ کا ہاتھ پکڑ کر ان سب کے درمیان سے نکلتا چلا گیا تھا اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر گاڑی سے اپنی چادر نکال لایا اور چادر مہواہ کو اوڑھا دی۔

"آپ چپ ہو جائیں۔ کچھ نہیں ہو گا، سردار بیگم بس پہنچنے والی ہوں گی۔"

داد بخش نے ڈرائنگ روم میں ٹہلتے ہوئے وال کلاک دیکھا۔

"لیکن انہیں تو ابھی پتا چلا ہے۔"

"نہیں انہیں بھی اسی وقت پتہ چل گیا تھا جس وقت مجھے پتہ چلا تھا۔" داد بخش کی بات پہ مہواہ کچھ نہ سمجھی لیکن مزید کچھ بولی بھی نہیں تھی ... وقت تھا کہ گزر ہی نہیں رہا تھا سوئیاں ایک ہی جگہ پہ جمی تھیں۔

باہر گاڑی کے ہارن کی آواز سنتے ہی جہاں راشدہ بیگم اور رمیز اپنے اپنے محاذوں پہ الرٹ ہوئے تھے وہیں داد بخش کی پریشانی قدرے کم ہوئی تھی لیکن مہواہ ضبط کا دامن چھوڑ بیٹھی تھی وہ ڈرائنگ روم سے اٹھ کر بھاگتی ہوئی باہر نکل آئی تھی اور گاڑی سے اترتی سردار بیگم سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ ان کے پیچھے قاسم علی کی گاڑی تھی اور قاسم علی کے ساتھ ساجدہ بیگم بھی تھیں۔

"مہواہ! کیا ہوا ہے بیٹا؟ کچھ بتاؤ تو؟" رابعہ بی بی نے آگے بڑھ کے مہواہ کو سردار بیگم سے الگ کرنا چاہا۔

"دادی بیگم! وہ رمیز ... وہ رمیز ... رمیز نے ..." اس کی آواز حلق میں ہی دب گئی تھی قاسم علی بھی مٹھیاں بھینچ کے رہ گیا تھا۔

"ماں! اندر بیٹھ کر بات کرو۔" اس نے مہواہ کو کندھوں سے تھاما اور اندر لے آیا تھا باقی سب بھی اندر آ گئے۔

"اماں بیگم! دیکھا آپ نے؟ کیا گل کھلائے ہیں آپ کے ..."

"بس راشدہ بس، بند کرو اپنی زبان، پہلے مجھے مہواہ سے پوری بات سن لینے دو۔" انہوں نے سختی سے کہتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا تھا۔

"یہ آپ کو کیا بتائے گی؟ کبھی چور نے بھی اپنی چوری بتائی ہے بھلا؟" وہ طنزیہ بولیں۔

"چور اپنی چوری نہیں بتاتا لیکن واویلا بہت کرتا ہے جو اس وقت صرف تم کر رہی ہو۔" سردار بیگم بھی ان ہی کی ماں تھیں۔

"اماں بیگم! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ آپ کو میری بات پہ یقین نہیں اور اس دو ٹکے کے نوکر پہ یقین ہے؟" راشدہ بیگم کے انداز میں حقارت اتر آئی تھی۔

"دو ٹکے کا وہ نہیں، دو ٹکے کا تمہارا بیٹا ہے۔"

سردار بیگم نے کوئی بھی لحاظ رکھے بغیر بیٹی کو آئینہ دکھایا تھا وہاں موجود سب ہی نے چونک کر سردار بیگم کو دیکھا تھا ان کے انداز میں کوئی لچک نہیں تھی لیکن اس بات پہ راشدہ بیگم کو پتنگے لگ گئے تھے۔

"آپ میرے بیٹے کو دو ٹکے کا کہہ رہی ہیں؟ اس گھٹیا لاوارث کے لیے آپ میرے بیٹے پہ انگلی اٹھا رہی ہیں؟ اس کی اوقات ہی کیا ہے؟ جس کو اس کے اپنوں نے کتے کی طرح دھتکار کر پھینک دیا تھا اور آپ اسے اٹھا کر گھر لے آئیں۔ میرے باپ اور بھائیوں کے ٹکڑوں پہ پلنے والے کو آپ میرے برابر میرے مقابل کھڑا کر رہی ہیں؟ اس نمک حرام کی خاطر آپ مجھے ..."

"چٹاخ ..." سردار بیگم کے بوڑھے ہاتھ میں بھی اس قدر طاقت آ سمائی تھی کہ راشدہ بیگم کو دن میں تارے نظر آ گئے تھے۔

"اماں بیگم ...!" ساجدہ نے لپک کے سردار بیگم کا بازو تھام لیا تھا۔

"پیچھے ہٹو ساجدہ! مجھے آج بتانے دو کہ داد بخش کی اوقات کیا ہے؟" انہوں نے ساجدہ کو پیچھے دھکیل دیا تھا۔ "داد بخش جیسا باکردار تمہاری آنے والی نسلوں میں بھی کوئی نہیں ہو گا۔ اس کا چلن کیسا ہے مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا ... صرف داد بخش ہی تھا جو مجھے آ کر یہ بھی بتا رہا تھا کہ سردار بیگم آپ کی پوتی نادانی کر رہی ہے، اسے روکیے، اسے سمجھائیے، نادان ہے، اوقات کا فرق نہیں سمجھتی۔"

مہواہ نے تڑپ کر حیرت زدہ سے انداز میں داد بخش کو دیکھا تھا یعنی اس نے سردار بیگم کو پہلے ہی سب کچھ بتا رکھا تھا ...

"اور تم یقین کی بات کرتی ہو؟ مجھے اس پہ اور اس کے کردار پہ تو یقین ہے لیکن تمہارے کردار پہ نہیں ہے ... تم اس وقت اپنے بیٹے کے بجائے مہواہ اور داد بخش کا ساتھ دیتیں تو شاید مجھے تم پہ بھی یقین آ ہی جاتا۔"

"آپ یہ کس بنیاد پہ کہہ سکتی ہیں کہ داد بخش بے قصور ہے؟" راشدہ پھنکار کے بولیں۔

"قاسم علی! دکھاؤ اسے میرا فون، جس وقت

تمہارے بیٹے نے میری پوتی، میری عزت پہ ہاتھ ڈالا
میں اس وقت داد بخش کے ساتھ فون پہ بات کر رہی
تھی۔"

انہوں نے ایک اور انکشاف کیا تھا۔ راشدہ بیگم کا
دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ قدیر ہمدانی، رمیز اور ماجدہ
بیگم بھی چونک گئے تھے یہاں تک کہ مہپارو نے بھی
حیرت اور بے یقینی سے دیکھا تھا۔

"تمہارے بیٹے کے گھٹیا کرتوت کا مجھے بتا کے ہی پتا
چل گیا تھا اسی لیے قاسم علی اور ساجدہ کو فون کر کے
حویلی سے نکل آئی، شکر ادا کرتی ہوں اپنے رب کا،
جس نے میری بچی کو برباد ہونے سے بچا لیا، شادی کے
بعد اصلیت سامنے آتی تو میں ولی محمد کو کیا منہ دکھاتی؟"
انہوں نے انتہائی نفرت و حقارت سے کہتے ہوئے رمیز
کو دیکھا تھا۔

"اماں بیگم۔۔۔!"

"خبردار اپنی گندی زبان سے مجھے اماں مت کہنا۔"
انہوں نے انگلی اٹھا کر روک دیا تھا۔

"لہنگا کہاں ہے ماجدہ؟" ان کے اگلے سوال پہ وہ
سب ایک بار پھر چونکے تھے۔

"وہ۔۔۔ وہ مہپارو کے کمرے میں رکھا تھا شاید۔"
ماجدہ بیگم گھبرا گئیں۔

"جاؤ لے کر آؤ۔" ان کے حکم پہ ماجدہ بیگم فوراً
لینے گئی تھیں۔

"کتنے کا آیا تھا؟"

"بیج جی۔۔۔ پچاس ہزار کا۔۔۔" ماجدہ بیگم نے
بوکھلاہٹ میں جواب دیا۔

"رجائی پرس سے پچاس ہزار نکال کر میرے ہاتھ پہ
رکھ۔" انہوں نے سب سے پیچھے کھڑی رجائی کو حکم
جاری کیا۔۔۔ اور پلک میں رجائی نے پانچ پانچ ہزار کے
دس نوٹ نکال کر ان کے ہاتھ پہ رکھ دیے۔

"یہ میری بچی کے پہلے شگن کا جوڑا ہے، سہاگ کا
جوڑا اس لیے اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتی، وہ اپنی شادی
کے دن یہی پہنے گی۔"

انہوں نے پچاس ہزار راشدہ بیگم کے منہ پہ دے
مار رہے تھے۔

"شادی؟" ایک بار پھر سب چونکے تھے۔

"ہاں! شادی اس کے ساتھ شادی جو اس کا شوہر
بننے کا حق رکھتا ہے، جو بد چلن اور بدکردار نہیں ہے
اور یہ نیچی نظر اور اونچے ایمان والا اور کون ہو سکتا ہے
سوائے میرے داد بخش کے؟"

سردار بیگم نے فخر سے سر بلند کرتے ہوئے داد بخش
کی طرف دیکھ کر دھماکا کیا تھا۔ وہاں موجود تمام نفوس
دم بخود کھڑے رہ گئے تھے۔ داد بخش ششدر سا ان کو
دیکھ رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

فجر کی اذان ہو رہی تھی جب وہ لوگ واپس حویلی
پہنچے تھے وہ سب اندر کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن داد
بخش باہر ہی رک گیا تھا۔

"تم کیوں رک گئے؟" قاسم علی نے پلٹ کر اسے
دیکھا۔

"میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔"

"واپسی پہ مولوی صاحب کو اپنے ساتھ ہی لے
آنا۔" سردار بیگم نے پلٹ کر ہدایت دی۔

"سردار بیگم؟" اس نے بے بسی سے انہیں دیکھا
تھا۔

"قاسم علی! جاؤ اس کے ساتھ، آج تم بھی ثواب
کماؤ، فجر کی نماز پڑھو اور واپسی پہ اس کے ساتھ ہی
مولوی صاحب کو بھی لے آنا، آج کا سورج نکلنے سے
پہلے ہی نکاح ہو جائے تو بہتر ہے، رخصتی مہپارو کے
ساتھ ہی ہو گی۔" سردار بیگم کے حکم سے انکار بھی
کسے تھا؟ قاسم علی داد بخش کے ساتھ ہی مسجد چلا گیا تھا
!

اور جب وہ دونوں نماز پڑھ کے مولوی صاحب کو
ساتھ لے کر حویلی آئے تو وہاں دوسری حویلی کے بھی
تمام افراد آئے ہوئے تھے۔ اور یقیناً ان کو سردار بیگم
نے ہی بلایا تھا۔

"مولوی صاحب پہلے قاسم علی اور مہپارو کا نکاح
پڑھوائیں، مہپارو ہماری بیٹی ہے پہلے اسی کا نکاح ہو گا۔"

لیکن قاسم علی کے نکاح کے بعد جب داد بخش کی
باری آئی تو وہ سراپا لرز اٹھا تھا۔ اسے لگا سردار بیگم
اسے زمین سے اٹھا کر عرش پہ بٹھا رہی ہیں۔

"داد بخش سمجھو کہ تمہاری دعا بھی قبول ہو گئی ہے،
ویسے بھی تم نے تو نمازیں بھی بہت پڑھی ہیں اور
دعائیں بھی بہت مانگی ہیں۔" قاسم علی نے داد بخش کو
کہنی مارتے ہوئے چھیڑا تھا۔

اور پھر سب کی موجودگی میں سردار بیگم نے اپنی پوتی
داد بخش کی زوجیت میں دے دی تھی۔ انہوں نے اپنی
عزت اسے سونپ ڈالی تھی۔۔۔ ہر طرف مبارک
سلامت کا شور مچ گیا تھا لیکن داد بخش سردار بیگم کے
قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔

"سردار بیگم! میں آپ کا نوکر، آپ کا خادم اس قابل
نہیں تھا، میں آپ کے قدموں کی خاک بھی نہیں تھا
آپ نے مجھے عرش پہ بٹھا دیا ہے۔" اس کی آنکھیں
بھر آئی تھیں۔

سردار بیگم نے اسے کندھوں سے تھام کے اٹھایا
اور اپنے سینے سے لگایا تھا۔۔۔ "میرا [illegible]
آج تم نہ ہوتے تو اس حویلی کی عزت مٹی میں
ڈوب جاتی۔۔۔ اللہ تمہیں زندگی دے، خوش رکھے، آباد
رکھے۔" انہوں نے داد بخش کی پیشانی چوم کر اس کے
کندھے پہ ہاتھ پھیرا تھا۔

"اماں بیگم! اب منہ میٹھا کریں۔" رابعہ بی بی خود ٹرے
میں مٹھائی لے آئیں اور وہاں بیٹھے تمام افراد کا منہ
میٹھا کرانے لگیں۔

✡ ✡ ✡

داد بخش پہلی فرصت میں شاہ میر کے پاس گیا تھا اور
اس کی آفر قبول کر لی۔

"اس آفر کے ساتھ جو تم نے سہولیات پیش کی
تھیں ان کا جلدی سے انتظام کرو۔" داد بخش نے
گاڑی اور فلیٹ کی بات کی تھی۔

"کیا مطلب!؟ اتنی جلدی کس لیے ہے؟" شاہ میر
کو حیرانی ہوئی۔

"آج سے ٹھیک چودہ دن بعد میری شادی ہے۔"
اس نے آہستہ سے کہا۔

"کس کی؟ تمہاری؟" شاہ میر کو اچنبھا ہوا۔

"وہ مہپارو بی بی کی۔"

"لیکن کس کے ساتھ؟"

"میرے ساتھ یار اور کس کے ساتھ؟"

"سچ؟" شاہ میر صوفے سے کھڑا ہو گیا۔

"ارے یہ کیسے ہوا؟"

"بس یار! سب کچھ اتنا اچانک ہوا ہے۔" داد بخش
آہستگی سے بولا۔

"تم فکر نہ کرو میں تمہارا فلیٹ ان چودہ دنوں میں ایسا
تیار کرواؤں گا کہ تمہیں خود پہ رشک آئے گا۔" شاہ
میر نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"اور گاڑی؟"

"او یار! فکر کیوں کرتے ہو تمہاری گاڑی کو دلہنوں
کی طرح سجا کر لاؤں گا اور دولہا کو بھی۔" شاہ میر نے
خوش دلی سے کہا۔

"شاہ میر دولہا [illegible] کی ضرورت نہیں۔" وہ [illegible]
[illegible] تھا۔

"کیوں تمہیں شرم آ رہی ہے ویسے جس لاڑے
(دولہا) کو شرم آتی ہے اس پہ روپ بھی بہت آتا
ہے۔" شاہ میر ہنس کے بولا۔

"جتانے کا شکریہ۔" داد بخش نے کہا۔

"کیا ہم بھی انوائٹڈ ہیں؟"

"ارے یار! تم ہی تو انوائٹڈ ہو میری طرف سے
اور ہے ہی کون؟ نہ ماں باپ نہ بہن بھائی نہ کوئی اور
رشتہ دار، ایک دوست ہی تو ہے۔" داد بخش کے لہجے
میں رنجیدگی اتر آئی تھی۔

"ارے یار اگر میں ہوں تمہاری طرف سے تو میں
سارے رشتے نبھاؤں گا۔" شاہ میر نے اس کے
کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا۔

"تھینک یو شاہ میر! مجھے لگتا ہے اللہ نے تمہیں
میری مدد کے لیے بھیجا ہے۔"

"اپنی وے تم یہ بتاؤ سردار بیگم اور ان کی حویلی کا کیا کرو گے؟" شاہ میر نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"شاہ میر! اتم سچ پوچھو تو میں سردار بیگم کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ نہ آج نہ کل، لیکن ایک بات اور ہے کہ میں اب حویلی میں رہنا بھی نہیں چاہتا، حالانکہ آج تک انہوں نے جو احسان اور کرم نوازیاں مجھ پہ کی ہیں وہ شاید ہی کوئی دوسرا بندہ کر سکتا ہو۔ لیکن میں اپنی بیوی کی ذمہ داری میں خود اٹھانا چاہتا ہوں۔ پہلی کمائی سردار بیگم کے ہاتھ پہ ہی رکھوں گا کیونکہ میری کمائی پہ پہلا حق ان ہی کا ہے، وہ میری ماں بھی ہیں اور باپ بھی جب تک وارث بڑا نہیں ہو جاتا میں حویلی کے تمام کام تمام ذمہ داریاں نبھاؤں گا جیسے پہلے نبھاتا رہا ہوں۔ لیکن ساتھ ساتھ اپنا کام بھی کروں گا۔ وارث ذمہ دار ہو گیا تو میں بالکل ہاتھ ہٹاؤں گا کیونکہ اگر اس وقت میں سب کچھ یہیں چھوڑ دوں تو سردار بیگم کو بڑی پرابلم ہو گی۔"

داد بخش بغیر رکے بولتا چلا گیا تھا اور شاہ میر کو اس کے خیالات جان کر خوشی ہوئی تھی لیکن حویلی جا کر جب اپنی خیالات کا اظہار اس نے سردار بیگم کے سامنے کیا تو جیسے وہ چپ ہو گئی تھیں۔

"سردار بیگم! آپ خاموش کیوں ہو گئیں؟" اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"کیا بولوں؟ کیا بولنے کے لیے کچھ باقی ہے؟ تم سارا کچھ طے کر کے اب مجھ سے مہر لگوانے کے لیے آئے ہو؟"

"ہاں سردار بیگم! اب کچھ طے کر کے آپ کے پاس آیا ہوں تاکہ آپ مجھے روک نہ سکیں، سردار بیگم! میں اگر یہاں رہا تو میری گردن اور میری نظر ہمیشہ کے لیے جھکی رہے گی۔ میری اوقات تو کیا میری ذات بھی نہیں رہے گی، میں گھر والا بن کے کسی سے نظر نہیں ملا پاؤں گا۔ کبھی سر نہیں اٹھا سکوں گا آپ کی اتنی محنتوں سے دلوائی ہوئی تعلیم رائیگاں جائے گی۔ سردار بیگم! پلیز داد بخش کہیں بھی چلا جائے لیکن آپ کے قدموں کی خاک ہی رہے گا۔"

اس نے کہتے کہتے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر چومتے ہوئے آنکھوں سے لگا لیے تھے۔

داد بخش کی خودداری پر ان کا سر فخر سے بلند ہو گیا تھا۔ ان کا انتخاب صحیح تھا۔ وہ خود بھی سوچتی تھیں کہ ان کی وفات کے بعد داد بخش کا ٹھکانا کیا ہو گا۔ یہاں لوگوں کے رویے ان سے چھپے نہیں تھے ان کی زندگی میں یہ حال تھا تو ان کی وفات کے بعد نہ جانے کیا ہوتا تھا۔

"جاؤ میرے بچے اللہ کامیابیاں تمہارے قدموں میں بچھائے۔" انہوں نے اسے محبت پاش اور نم آلود آنکھوں سے اس کے ماتھے پہ بوسہ دے کر دعا دی تھی، داد بخش نے بے ساختہ ان کی پیشانی چوم لی تھی۔

"تھینک یو اماں بیگم! تھینک یو سو مچ۔"

"تم مجھے اماں کہہ رہے ہو؟" وہ خوشی سے سرشار ہو گئیں۔

"ہاں اب میں خود سے نظر ملانے کے قابل ہو گیا ہوں، اب مجھے سردار بیگم نہیں اپنی ماں کی صورت نظر آ رہی ہے۔" وہ ان کو اپنے مضبوط بازوؤں میں بھینچ رہا تھا، اپنی خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ سردار بیگم نے بچپن سے ہزاروں بار کہا تھا کہ وہ انہیں اماں بیگم یا دادی بیگم کہے لیکن اس نے رکھی، رجائی اور اجو وغیرہ کی دیکھا دیکھی انہیں سردار بیگم ہی کہا تھا، وہ خود کو نوکروں کے دائرے میں رکھتا تھا لیکن آج وہ نوکروں کے دائرے سے نکل کر خود کو ایک رشتے کے دائرے میں محسوس کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں آزاد ہو چکے تھے۔ اس نے شاہ میر کو فون کر کے سردار بیگم کی رضا مندی بھی بتا دی تھی۔

۞ ۞ ۞

اس سپر لگژری فلیٹ کا کونا کونا پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ شاہ میر نے داد بخش کا بیڈ روم ہی نہیں بلکہ ڈرائنگ روم، کچن اور لاؤنج میں بھی پھولوں سے ڈیکوریشن کروائی ہوئی تھی، اس فلیٹ میں قدم رکھتے ہی سفید موتیا اور سرخ گلابوں کے انبار نظر آ رہے تھے

لو، مہک، آنچ، مسحور کن تھی کہ قدم تھم سے گئے تھے۔ دل کے تار خوشبو کی شرارتوں سے بجنے لگے تھے۔ جذبات اتنے منتظر اور پاکیزہ تھے کہ داد بخش کا اپنا ہی دل پگھلا جا رہا تھا۔ دل کی حالت اس کی پیشانی پہ چمکتے قطروں سے نظر آنے لگی تھی اور وہ اسی مشکل کا شکار تھا کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار اس پاگل لڑکی کے سامنے کرے گا بھی تو کیسے؟

"داد بخش!" شاہ میر نے اسے پکارا۔

"ہوں؟"

"لگتا ہے تو خیالوں ہی خیالوں میں اپنے بیڈ روم میں پہنچا ہوا ہے۔" اس نے چھیڑا۔

"پہنچنا بھی چاہیے۔ آخر اتنا ٹائم ہو رہا ہے؟" شاہ میر کی امی نے اٹھتے ہوئے کہا آج شاہ میر کی فیملی بھی شادی میں شریک ہوئی تھی۔

"ارے نہیں آنٹی! آپ بیٹھیے ناں' اتنی جلدی اٹھنے کی کیا ضرورت ہے؟" داد بخش نے انہیں روکا۔ وہ لوگ انہیں گھر تک چھوڑنے آئے تھے۔

"تم سب کے درمیان بیٹھے ہوئے ہو اس لیے تمہیں جلدی لگ رہی ہے لیکن اندر دلہن اکیلی بیٹھی ہے اسے یہ ٹائم بھی تو آدھی رات لگ رہا ہوگا تم جاؤ اس کے پاس جاؤ شاباش۔" انہوں نے کندھا تھپکا۔ داد بخش مسکراتے ہوئے دروازہ لاک کر کے اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ اس وقت ساڑھے گیارہ کا ٹائم ہو رہا تھا لیکن تنہائی کی وجہ سے رات خاصی گہری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ آہستگی سے دروازہ کھول کے اندر آیا تو قدموں کی روانی میں کمی آگئی اندر ہر چیز ہی ہوش ربا تھی۔

"السلام علیکم!" اس نے بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے سلام کیا۔ مہلو ذرا سا پیچھے کھسک گئی تھی اور اس نے اس کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔ وہ اس کی اس حرکت میں چھپی ناراضی کو اچھی طرح سمجھتا تھا اسی لیے سر کھجاتے ہوئے سوچنے لگا کہ اب کیا کرے؟

"دیکھیے مہلو بی بی! میں آپ کا شوہر ہوں' ملازم نہیں کہ آپ کے نخرے ہی دیکھتا رہوں۔" اس نے مہلو کا ہاتھ پکڑ کر اسے سامنے کر لیا تھا اور اس کا گھونگھٹ الٹ دیا تھا لیکن گھونگھٹ کے اندر مہلو ششدر سی حالت میں آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھی۔

"یہ سب تم نے کہا ہے؟" وہ حیرت زدہ تھی۔

"جی میں نے ہی کہا ہے اور یقیناً آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا؟" داد بخش نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا داد بخش!" وہ ابھی حیرانی کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔

"آئیے میں آپ کو یقین دلا دیتا ہوں۔" اس نے مہلو کو بازو کے حصار میں گھیر لیا تھا لیکن وہ جیسے ہوش میں آ گئی تھی یکدم تڑپ کے دور ہٹ گئی۔

"بس بس تم اپنے یقین اپنے پاس ہی رکھو' میرے پاس آنے کی اور مجھے چھونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' میں تمہارے لیے کیا ہوں' خوب جانتی ہوں میں۔" وہ تنک گئی تھی۔

"کیا جانتی ہیں آپ؟" اس نے مہلو کا بازو اپنی مضبوط گرفت میں لیا تھا۔

"یہی کہ زبردستی تم پہ مسلط کی ہوں تم نے دادی بیگم کی خاطر مجھے اپنایا ہے ورنہ تمہارے دل میں اور تمہاری زندگی میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں رتی برابر بھی اہمیت نہیں رکھتی تمہاری نظر میں۔" مہلو کو آج موقع ملا تو اپنے حساب کتاب کھول بیٹھی تھی۔

"سردار بیگم سے میرا کیا رشتہ تھا کہ وہ مجھے ایک دربار سے اٹھا کر گھر لے آئیں؟ مجھے تعلیم دلوائی محبت دی عزت دی' میں ان کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتا تھا کجا کہ ان کے گھر کی عزت پر نظر ڈالتا۔ اور رہی آپ کی اہمیت تو اپنی اہمیت میرے رب سے پوچھیے جس سے میں دعائیں کرتا تھا اور ان دعاؤں میں آپ کے نام کے علاوہ کوئی اور نام نہیں ہوتا تھا۔" داد بخش کے لفظ لفظ سے سچائی کی مہک اٹھ رہی تھی۔

"تو پھر تم محبت سے انکار کیوں کرتے تھے؟"

"کیونکہ اس وقت میں اپنے آپ کو آپ کے قابل

نہیں سمجھتا تھا۔ اس وقت میں خود محتاج تھا کسی کا تو کیا آپ کو وہ سب نہیں دے سکتا تھا جس کا آپ حق رکھتی تھیں۔"

اس نے مہلو کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ مہلو کی نظر جھک گئی تھی۔ اور داد بخش نے اس کی جھکی پلکوں پہ اپنے ہونٹوں کا لمس سجا کر انہیں بوجھل کر دیا تھا۔ مہلو کی ہتھیلیوں میں پسینہ اتر آیا اور دل کا پنچھی سینے کے پنجرے میں پھڑپھڑا کے رہ گیا۔

"داد!" اس کی گرفت میں استحقاق بڑھا تو وہ بول گئی تھی۔

"اپنی شدتوں کا تو ہمیشہ اظہار کیا آپ نے' اب میری شدتوں کو رستہ ملا ہے تو بس تماشا دیکھیے۔" اس کی آواز کی گمبھیرتا مہلو کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر گئی تھی۔

وہ ایسا رومانٹک بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ قطرہ قطرہ پگھلتی رات ان کے ملن پہ کھل کے مسکرائی تھی۔

☆☆☆

صبح فجر کے وقت ابھی اس کی آنکھ کھلی تو اس کی پہلی نظر مہلو کے چہرے پہ گئی تھی جو اس کے بازو پہ سر رکھے سو رہی تھی لیکن نیند میں بھی دھیمی سی مسکان نے اس کے لبوں کا احاطہ کر رکھا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ دائمی مسکان اس کے لبوں پہ ہمیشہ کے لیے ٹھہر گئی ہو... لیمپ کی مدھم روشنی اس کے چہرے پہ پڑ رہی تھی اور داد بخش اپنی سوئی ہوئی دلکش ملکیت سے نظریں نہیں ہٹا سکا تھا اور بے اختیار اس کے چہرے پہ جھکتے ہوئے اس کی مسکراہٹ میں اپنی مسکراہٹ کے رنگ بھر دیے تھے اس کے لمس و دل [illegible] چھپایا تھا اور مہلو کی آنکھیں پٹ سے کھل گئی تھیں۔ وہ کہنی کے بل پہ اسی کی سمت جھکا ہوا تھا۔

"تم جاگ رہے ہو؟"

"خوش قسمتی سے آنکھ کھل گئی۔"

"لیکن اس وقت؟" مہلو نے نظر گھما کے سائیڈ ٹیبل پہ رکھے کلاک کو دیکھا۔ اس کی اپنی آواز اور آنکھیں نیند کی وجہ سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

"آپ پریشان نہ ہوں' میں آپ کے لیے نہیں جاگ رہا' میں تو نماز پڑھنے کے لیے جاگ رہا ہوں۔" اس نے مہلو کے بال چہرے سے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا اور اپنی انگلی سے اس کے نرم شفاف گلابی ہونٹوں کو چھونے لگا۔

"تو پھر جاؤ نماز پڑھو۔"

"ابھی چند منٹ ہیں نماز میں' ابھی اذان نہیں ہوئی۔" وہ پھر کسی گستاخی کے ارادے سے اس پہ جھکا لیکن مہلو نے تیزی سے اس کے سینے پہ ہاتھ رکھ کے روک دیا تھا۔

"بہت بے شرم ہو تم' کہاں تو نظر اٹھا کر دیکھتے ہی نہیں تھے اور کہاں اب نظر ہٹا ہی نہیں رہے؟" اس نے حیرت سے کہا تھا۔

"اگر نظر ہٹا لوں تو پھر آپ کو ہی شکوہ ہو گا کہ میں نظر بھر کے دیکھتا ہی نہیں؟" اس نے شرارت سے کہا۔

[illegible]

"اف... ہاں' [illegible] کب چھوڑو گے؟"

"تو اور کیا کہوں؟" وہ مسکراہٹ دبا کے بولا۔

"داد بیگم۔" اس نے فوراً جواب دیا۔

"داد بیگم؟" اسے حیرت ہوئی۔

"ہاں میری بڑی خواہش ہے کہ جس طرح لوگ دادا جان کے نام سے دادی بیگم کو 'سردار بیگم' کہتے ہیں اسی طرح مجھے بھی تمہارے نام سے 'داد بیگم' کہہ کے پکاریں۔" وہ کھلکھلائی۔

"اور یہ تم مجھے آپ کے بجائے 'تم' کا درجہ کب دو گے؟" اس نے گھور کے پوچھا۔

"جب آپ مجھے تم کے بجائے 'آپ' کا درجہ دیں گی۔" داد بخش کا جواب برجستہ تھا۔ مہلو اپنی غلطی پہ چپ ہو گئی بلکہ کچھ کھسیا گئی تھی۔

"آئی ایم سوری۔"

"اٹس اوکے آئندہ سہی۔" وہ ہنسا تھا۔

اذان ہو رہی ہے۔"

"میں جانتا ہوں آپ بھی اٹھ کر فریش ہو جائیں اور نماز پڑھ لیں۔" وہ کمبل ہٹا کر اٹھ گیا تھا اور نماز پڑھنے کے لیے مسجد چلا گیا اس کے پیچھے مہلو بھی اٹھ گئی تھی اس نے شاور لیا، وضو کیا اور نماز پڑھنے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

نماز پڑھنے کے بعد وہ کھڑکی سے پردے ہٹا کر سورج کی نوخیز کرنوں سے لطف اندوز ہونے لگی تھی لیکن دھیان اب بھی داد بخش کی طرف ہی تھا۔

"داد بخش! میں تمہیں اپنے دل سے سلام پیش کرتی ہوں تم نے اپنے مضبوط کردار کے بل بوتے پہ سردار بیگم کا دل بھی جیت لیا اور مہلو ولی محمد کو بھی۔ آج میں یہاں ہوں تو صرف تمہاری ایمانداری، دیانتداری اور کردار کی وجہ سے ورنہ یہاں ایسا کوئی مرد نہیں جو اپنی طرف بڑھنے والی لڑکی کا ہاتھ جھٹک دے یا اس کے وجود سے نظریں چرالے۔ تم میرا نصیب بنے ہو تو میں واقعی خوش نصیب ہو گئی ہوں آئی ایم رئیلی پراؤڈ آف یو۔" وہ کھڑکی کے پٹ سے ٹیک لگائے اپنی سوچوں کے دوش پہ نجانے کہاں سے کہاں پہنچی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

آج شادی کے دو دن بعد مہلو گاؤں جا رہی تھی۔ سردار بیگم نے مہر نگار، وارث اور رابعہ بی بی کو لینے کے لیے بھیجا تھا۔ داد بخش کو شاہ میر کے ساتھ مل کر کوئی میٹنگ طے کرنا تھی اس لیے مہلو کو رخصت کر کے آفس چلا گیا تھا لیکن سردار بیگم نے اسے باقاعدہ فون کر کے آنے کی تاکید کی تھی اور اس نے ہامی بھی بھرلی تھی۔

ایک گھنٹے بعد وہ فارغ ہوا تو گاؤں کا رخ کیا تھا لیکن گاؤں میں داخل ہوتی سڑک کے بیچوں بیچ کسی کی بائیک اوندھی پڑی تھی دو تین بار اس نے گاڑی کا ہارن دیا لیکن کوئی پتہ نہ چلا کہ بائیک کا مالک کون ہے؟ اور کہاں ہے؟ وہ گاڑی روک کے نیچے اتر آیا تھا جیسے ہی وہ بائیک کو ہٹانے کے لیے آگے بڑھا ایک سنسناتی ہوئی گولی اس کا کندھا چھید کے رکھ گئی تھی۔ داد بخش اک کراہ کے ساتھ پلٹا تھا۔ سڑک کے قریب جھاڑیوں میں اسے رمیز کی شکل نظر آئی تھی لیکن دوسری گولی اس کے بازو کو چیرتی ہوئی گزر گئی تھی وہ یکدم زمین پہ گرا تھا اتنے میں لوگوں کی آوازیں آنے لگیں۔ رمیز بائیک لے کر ہوا ہو گیا تھا۔ داد بخش اسے اچھی طرح پہچان چکا تھا گاؤں کا چاچا بشیر لوہار ہاتھ میں درانتی پکڑے سب سے پہلے داد بخش تک پہنچا تھا۔

"اوئے داد بخش! اوئے کیا ہو گیا؟ گولی کس نے چلائی؟ کون تھا؟"

بشیرے لوہار کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ اس نے داد بخش کا سر اٹھا کر گود میں رکھا تھا لیکن اتنے میں اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں اور اتفاقاً دوسری حویلی کا ڈرائیور امتیاز گاڑی لے کر آ گیا، وہ بھی داد بخش کو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا اور پھر وہاں جمع ہونے والے تمام کسانوں نے مل کر اسے گاڑی میں ڈالا اور ہسپتال لے گئے تھے اور کچھ حویلی کی طرف دوڑ پڑے تھے حویلی میں بھی جس جس کو پتہ چلا وہ دھک سے رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

مہلو چونک کر اٹھی تھی۔ نہ جانے کیسا خواب دیکھا تھا۔ اس کا دل بری طرح گھبرا رہا تھا اس نے داد بخش کے بارے میں پوچھا تھا اور یہ جان کر کہ وہ ہسپتال میں ہے اس پر آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔

"اف خدایا! مجھے پتا ہی نہیں چلا۔" وہ چکرا کر گرنے لگی تھی کہ مہلو نے اٹھ کر اسے تھام لیا تھا۔

"مہلو! پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے خود کو سنبھالو، وہ اب ٹھیک ہے۔ دادی بیگم کا فون آیا تھا۔ وہ پولیس کو بھی اطلاع کر چکی ہیں۔" مہلو کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ یکدم پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی تھی۔ وہ بچوں کی طرح بلک رہی تھی اور رابعہ بی بی اسے چپ کرواتے ہوئے تسلی دینے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد دوسری حویلی سے ساجدہ وغیرہ بھی آ گئیں۔ قاسم علی تو اطلاع ملتے ہی ہسپتال پہنچ گیا تھا لیکن جیسے جیسے سب کو خبر مل رہی تھی سبھی پریشان ہو رہے تھے۔

"اماں! اس پہ گولی رمیز نے چلائی ہے یہ کام وہی خبیث کر سکتا ہے ورنہ داد کی کسی کے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے بھلا؟" مہلو ہچکیوں کے درمیان بولی تھی۔

"بس بیٹا! ہم کیا کہہ سکتے ہیں اب؟ یہ تو پولیس ہی بتائے گی کہ کس کا کام ہے؟" رابعہ بی بی بغیر کسی تصدیق کے رمیز پہ الزام نہیں رکھنا چاہتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"داد...!" وہ بے تابی سی اندر داخل ہوئی تھی۔ داد بخش نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اسے جو ہسپتال چھوڑ کے گیا تھا۔

"کیسی ہو؟"

"آپ کیسے ہیں؟ کب ڈسچارج ہوں گے؟ ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟" اس نے داد کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"اف تمہاری یہ بے تابیاں اور جلد بازیاں۔" [illegible] جذباتی اور جنونی!"

"میں صبر نہیں کر سکتی۔ آپ کے معاملے میں تو ہرگز نہیں۔"

"یار صبر کس کافر کو آتا ہے؟ مجھ سے پوچھو میں صبر کی کس انتہا پہ ہوں تم سامنے کھڑی ہو اور میں بے بس۔" داد بخش کی معنی خیز بے باک نظر مہلو کے چہرے کا طواف کر رہی تھی مہلو نظریں چرانے پہ مجبور ہو گئی۔

"پلیز داد! مجھے ستائیں مت۔ یہ بتائیں طبیعت اب کیسی ہے؟"

"تم آ گئیں اور میں ٹھیک ہو گیا، کہو تو اٹھ کر بیٹھ جاؤں؟"

"جی نہیں۔ آپ آرام کریں۔" وہ گھبرا گئی تھی۔ "ڈاکٹر سے کہو جلدی ڈسچارج کر دے کہیں دل کے

ارمان دل میں ہی نہ رہ جائیں' پہلے ہی آپ سے "تم تک آتے آتے عمر گزر گئی ہے' تم سے یار ایوں لگتا ہے تمہاری چاہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔۔۔" مہوا اس کے افسردہ سے انداز پہ یکدم کھلکھلا کے ہنسی تھی۔

"ظاہر ہے میں اکیس سال کی کمسن دوشیزہ اور آپ تیس سالہ مرد "اف اتنی ایج۔" اس نے منہ بنا کے کہا۔

"بس بس زیادہ دوشیزہ بننے کی بھی ضرورت نہیں ہے تمہاری شادی ہو چکی ہے اب۔" داد بخش نے پینترا بدلا۔

"بہت تیز ہو گئے ہو؟"

"تمہارے ساتھ کا کمال ہے؟"

"کیا کہا؟" وہ چیخی۔

"ایک بات مانو گی؟"

"ہوں کہیں؟"

"اماں بیگم سے کہو کیس واپس لے لیں' رمیز کو آزاد کروا دیں۔۔۔ تین دن سے وہ جیل میں ہے اور پولیس والوں کی مار کھا رہا ہے۔ پلیز دراصل اس کی اذیت کا سبب میں نہیں بن سکتا۔ یوں سمجھو کہ میں نے تمہارے صدقے اور اپنی خوشیوں کے صدقے اسے معاف کیا۔" داد بخش نے مہوا کا ہاتھ پکڑ کر اسے سمجھایا۔

"دادی بیگم اسے معاف نہیں کریں گی اور وہ معافی کے قابل نہیں ہے اس نے دوبار ہمیں قتل کرنے کی کوشش کی ہے ایک بار میری عزت پہ ہاتھ ڈال کر اور ایک بار آپ پہ گولی چلا کر۔"

"یار غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے اور معاف بھی انسان ہی کرتے ہیں پلیز کوشش کرو کہ اماں بیگم مان جائیں۔"

داد بخش نے اسے راضی کرنا چاہا مہوا چپ ہو گئی تھی لیکن سردار بیگم اپنے اصولوں سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھیں سب نے کوشش کر کے دیکھی تھی لیکن وہ نہیں مانی تھیں اور پورا ایک سال گزر گیا۔

☆ ☆ ☆

"مجھے لگتا ہے یہ پورے کا پورا اماں بیگم پہ گیا ہے۔" داد بخش نے سردار بیگم کی گود میں لیٹے بچے کو غور سے دیکھتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔

"اور مجھے لگ رہا ہے کہ یہ پورے کا پورا تم پہ گیا ہے۔" سردار بیگم نے مسکرا کر داد بخش کو دیکھا۔

"واہ جی واہ۔۔۔ بیٹا میرا ہے اور لگ آپ جیسا رہا ہے کیا کمال کی بات ہے' ہونہہ آپ دونوں کو اپنے سوا بھی کوئی نظر آتا ہے یا نہیں؟ یہ میرے جیسا بھی تو ہو سکتا ہے؟" مہوا ان دونوں کی طوطا چشمی پہ سلگ اٹھی تھی اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوئے آٹھ دن ہو چکے تھے پہلے چھ سات دن مہوا تو میر نگار اور رابعہ بی بی اس کے پاس وقفے سے آ کر رہی تھیں اور اس کی دیکھ بھال کر رہی تھیں اب وہ گئی تھیں تو داد بخش کی فرمائش سردار بیگم آ گئی تھیں اور ان کے ساتھ ان کی لاڈلی اور چہیتی رجائی بھی آئی ہوئی تھی۔

"بیٹے ہمیشہ باپ کا پرتو ہوتے ہیں۔" سردار بیگم نے مہوا کے سر پہ چپت لگائی۔

"لیکن بیٹوں کو زیادہ پیار ماں سے ہی ہوتا ہے۔" مہوا اترا کے بولی۔

"جیسے مجھے اماں بیگم سے ہے۔" داد نے ان کے کندھے پہ بازو پھیلایا۔

"ہاں اسی لیے تو میری ساری باتیں چوری چھپے جا کر ان کو بتا آتے تھے؟" وہ گھور کے خفا سے لہجے میں بولی اور داد بخش قہقہہ لگا کے ہنس پڑا تھا اور سردار بیگم بھی اپنی ہنسی نہیں روک سکی تھیں۔

"ابھی تک صدمہ ہے بے چاری کو۔"

"ہاں تو اور کیا مجھے کیا پتہ تھا کہ اندر ہی اندر میری جڑیں کاٹی جا رہی ہیں میری مخبری کی جا رہی ہے۔"

اس کی خفگی پہ وہ دونوں ہنس رہے تھے کہ اتنے میں ڈور بیل کی آواز سنائی دی۔

"شاہ میر بھائی ہوں گے۔" اس نے اندازہ لگایا۔ "میں دیکھتا ہوں۔" وہ اٹھ کر باہر آیا اور دروازہ کھول دیا لیکن سامنے راشدہ بیگم کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"آپ؟"

"ہاں میں تم سے کچھ مانگنے آئی ہوں داد بخش اللہ کے واسطے مجھے مایوس مت کرنا۔" راشدہ بیگم نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟ پلیز اندر آ جائیے۔" وہ سامنے سے ہٹ گیا تھا۔

"داد! کہاں رہ گئے آپ؟ کون ہے باہر؟" مہوا کی آواز سنائی دی تھی۔

"بیگم صاحب آئی ہیں۔" وہ واپس ڈرائنگ روم میں آتے ہوئے بولا جس پہ وہ دونوں چونک گئی تھیں۔

"میں کسی سے بھی کچھ کہنے نہیں آئی میں بس اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگنے آئی ہوں۔" راشدہ بیگم نے سردار بیگم اور مہوا کی طرف دیکھ کر داد بخش کو دیکھا تھا۔ "خدا کے واسطے داد بخش' رمیز کو معاف کر دو' اسے ایک سال ہو گیا ہے مقدمے کی پیشیاں بھگتتے ہوئے وہ اب ہار جانا چاہتا ہے اس نے جو کیا واقعی برا کیا وہ اپنی سزا بھگت چکا ہے۔ بس کیس واپس لے لو۔" راشدہ بیگم نے ایک بار پھر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے' ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے داد بخش نے ایک نظر سردار بیگم کو دیکھا وہ رخ موڑ گئی تھیں۔۔۔ داد بخش نے آگے بڑھ کے راشدہ بیگم کے ہاتھ کھول دیے تھے۔

"آپ میری ماں کے برابر ہیں' ہاتھ جوڑ کر مجھے گناہ گار مت کیجئے' میں نے تو اسی وقت رمیز کو معاف کر دیے کا کہہ دیا تھا جب اسے پولیس نے پکڑا تھا لیکن اماں بیگم کے اصول کے مطابق اسے سزا ملنی چاہیے تھی' جہاں تک میرا تعلق ہے میں اسے کھلے اور سچے دل سے معاف کرتا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں میں کل ہی وکیل صاحب سے بات کر کے کیس واپس لینے کی درخواست پیش کرتا ہوں۔"

داد بخش کے فیصلے پہ سردار بیگم نے چونک کر دیکھا تھا جبکہ راشدہ بیگم کے چہرے پہ خوشی اور بے یقینی کے سائے لہرا گئے تھے۔

"وہ اماں بیگم؟" راشدہ بیگم نے کسی خدشے کے تحت کہا۔

"اماں بیگم میری ماں ہیں وہ میری بات سے انکار نہیں کریں گی۔ آپ بیٹھیے اور چائے پی کر جائیے گا۔" داد بخش نے پختہ یقین سے کہتے ہوئے راشدہ بیگم کو صوفے پہ بٹھایا تھا اور راشدہ بیگم شرمندہ ہو کے رہ گئی تھیں انہیں اپنا رویہ یاد آ گیا تھا۔

"مہوا' رجائی سے کہو چائے لے کر آئے۔" اس نے اشارہ کیا۔

"جی ابھی کہتی ہوں۔" وہ فوراً اٹھ گئی۔

"راشدہ بیگم' یہی فرق ہے میری تربیت میں اور تمہاری تربیت میں' تمہارا اپنا ہی بیٹا تمہارے اختیار میں نہیں جبکہ میرے بیٹے نے میرا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ جاؤ میں اپنے داد کے صدقے تمہیں اور تمہارے بیٹے کو معاف کرتی ہوں۔"

سردار بیگم نے دل پہ لگا تالا کھول دیا تھا۔

راشدہ بیگم نے آج سچے دل سے تسلیم کیا تھا کہ انسان کی عظمت اس کی بڑائی اس کے خاندان اور دولت سے نہیں اس کے کردار سے ہوتی ہے۔

☆

آمنہ ریاض

دین محمد مٹی سے محبت کرنے والا جفاکش مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خون جگر سے سونا اگلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے۔ جو وہ اپنے چھ مربعہ زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرہ اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرہ چھ مردہ بچوں کو جنم دے کر ایک مرتبہ پھر امید سے ہے۔ دین محمد کا رواں رواں اولاد کی خوش خبری پانے کے لیے مجسم دعا بن چکا ہے۔ اس کی دعائیں مستجاب ٹھہرتی ہیں اور اس کے یہاں ایک خوبصورت بچی جنم لیتی ہے۔ اسے وہ اپنی جنت کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کے روز و شب نوکری کی چکی میں پسے گزر رہے ہیں۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ بہتر مستقبل کا خواب اسے متحرک رکھتا ہے۔ تنہائی میں کسی کی محبت کا جگنو اس کی دنیا آباد رکھتا ہے۔ مرحوم امی کی یادیں اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آرام کرنے لیٹتا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے جنت بی بی حراست میں ہے جس کا دعویٰ ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ عجلت میں پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور ثبوت دیکھتا ہے کہ جنت بی بی شیزوفرینیا کی مریض ہے جس کی شادی ابھی ہوئی تھی۔ جنت کی حالت جلال الدین کو اعصابی تکان کا شکار کرنے لگتی ہے جسے وہ اپنے نوکروں کے سہارے علیحدہ گھر میں رکھ چھوڑتا ہے۔

ثمینہ 24 سال بعد اپنی بیٹی ماوی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آئی ہیں تو انہیں توقیر صاحب کے بتلائے گئے بنگلے کو تلاشنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ ثمینہ کے دوست توقیر صاحب کے توسط سے دانیال کی انیکسی میں ٹھہرتی ہیں۔ ثروت جلیل ملنسار اور محبتی خاتون ہیں۔ ولی، اولیفا اور انبیاء ان کے بچے ہیں۔ ماوی کی پہلی ملاقات میں انبیاء سے دوستی ہو جاتی ہے۔

شبیہ العباس طبیعتاً سخت گیر اور غصہ ور نوجوان تھے۔ بے صنف نازک کا جبر مزدوری بنتا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ وہ پھپھو زاد تنوی سے منسوب ہے۔ تنوی اس کی تند خو طبیعت سے نالاں ہے۔ شبیہ، تنوی کو کالج چھوڑنے آتا ہے تو سہیلیاں

عبیرہ اور ثروت تو دیکھ کر بھو جاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شیبہ ماموں کا منگیتر ہے۔ وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔ ماموں دونوں سے گزارش کرتی ہے کہ عروج کو اس کی بات کا علم نہ ہو۔

شیبہ بیگم، ثروت دانیال کی اولاد ہے جسے انہیں دانیال حسن سے شادی سے پہلے چھوڑنا پڑا۔ بچپن کی محرومی نے اسے بدمزاج اور فصیلا بنا دیا۔ وہ انیا اور ولید سے بہت ترشی سے پیش آتا ہے۔ وہ ان سے بحیثیت بہن بھائی قلبی تعلقات محسوس نہیں کرتا۔ انیا اس کی محرومی دل سے محسوس کرتی ہے۔ انیا پر بری نظر ڈالنے پر وہ جے ڈی کے دوست سعدی کو پیٹ ڈالتا ہے۔ صرف جے ڈی اس کی کیفیات سمجھتا ہے۔

بیمار پڑنے پر بیگم دانیال، شیبہ کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتی ہے تو شیبہ ان کے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ انہیں بیگم دانیال کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ پہلے ان سے مل چکی ہیں۔

بچوں کی لڑائی میں جنت کو چوٹ لگتی ہے تو دین محمد اپنی بہن زبیدہ کے بیٹے فاروق کا حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔ ساتھ ہی زبیدہ بہن اور دیق بھائی سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ زہرہ اس کی جنت سے طوفانی محبت سے خوف زدہ ہے۔ دین محمد، زہرہ کو باور کرواتا ہے کہ وہ جنت کو بیاہ کر دوسرے گھر نہیں بھیجے گا بلکہ اس کے شوہر کو گھر داماد بنائے گا۔

اتفاقاً ماوی کا ٹکراؤ شیبہ سے ہوتا ہے جس سے ماوی کا بہیر زخمی ہو جاتا ہے۔ اپنی غلطی کے باوجود جھلاہٹ میں شیبہ ماوی کو بری طرح سے ڈانٹتا ہے تو ماوی اس کی طبیعت صاف کر دیتی ہے۔ شیبہ سے وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔

(اب آگے پڑھیے)

۹
نویں قسط

پھر پلان کے مطابق وحید نے جے ڈی کو فون کیا اور ایکسیڈنٹ کے باعث اپنی خراب حالت کی ایسی تصویر کشی کی کہ جے ڈی کی معصوم روح لرز اٹھی۔

"تم کس اسپتال میں ہو وحید! بتاؤ میں رقم لے کر پہنچ جاتا ہوں۔" جے ڈی نے جذباتی ہو کر کہا۔ وحید اسپتال کے پلنگ پر اطمینان سے لیٹا سیر بلا رہا تھا، بری طرح گھبرا گیا۔

"نہیں جے ڈی، میرے بھائی، میرے دوست، میں جانتا ہوں تم میری حالت دیکھ نہیں پاؤ گے۔ ہاتھ کلائی سے الگ ہو کر تقریباً لٹک رہا ہے، دائیں ٹانگ کچلی جا چکی ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں جب تک پیسے جمع نہیں کرواؤ گے ٹریٹمنٹ شروع نہیں کیا جائے گا، جے ڈی، میری مدد کرو۔" اداکاری میں حقیقت کے رنگ بھرنے کے لیے وہ رو بھی پڑا۔

"رو مت وحید!" جے ڈی نے گلوگیر لہجے میں کہا تھا۔

"جے ڈی! میں نہیں چاہتا تم مجھے اس خراب حالت میں دیکھو، نبیل کو بھیج رہا ہوں، مہربانی کر کے بیس ہزار روپے اسے دے دو، تمہارا احسان، زندہ رہا تو ساری زندگی یاد رکھوں گا۔"

پھر فون بند کر کے دونوں خوب ہنسے۔

"تم نے ٹھیک کہا تھا نبیل! جے ڈی کو بے وقوف بنانا تو بہت ہی آسان ہے۔"

"جب تک رقم ہاتھ نہیں آ جاتی، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔" نبیل نے کہا اور وہ اپنی پلاننگ کی کامیابی کے بارے میں بات کرنے لگے۔

دوسری طرف جے ڈی، وحید کے ایکسیڈنٹ کا سن کر پریشان بیٹھا تھا اس کا بس نہ چلتا تھا کہ اڑ کر وحید کے پاس پہنچ جائے۔ جس وقت نبیل پیسے لینے آیا اس نے نبیل سے بھی گزارش کی کہ اسے وحید کے پاس لے چلے۔ "میں وحید کی بات سے انکار نہیں کر سکتا جے ڈی! تمہیں اس کی حالت کا اندازہ نہیں ہے۔ اس قدر زخمی ہو چکا ہے کہ

مجھ آخری سانسیں ہی چل رہی ہیں۔" "نبیل تو وحید سے بھی بڑا ایکٹر تھا اور چونکہ اس سارے ڈرامے کا ڈائریکٹر بھی وہی تھا اس لیے اس کی اداکاری وحید سے بہتر تھی۔

"ایسے تو مت کہو۔" جے ڈی نے سراسیمگی سے کہا۔

"خدانخواستہ اسے کچھ ہو گیا تو آخری خواہش پوری نہ کرنے پر میں خود کو معاف نہیں کر سکوں گا جے ڈی! اس نے مجھے تاکید کی ہے جے ڈی کو اسپتال مت آنے دینا۔ اس کا دل بہت کمزور ہے پھر اپنے دوستوں سے اسے محبت بھی بڑی ہے، ایسا نہ ہو میری حالت دیکھ کر جے ڈی کو کچھ ہو جائے۔ تم واقعی وحید پر احسان کرو جے ڈی! بیس ہزار اسے دو میں روپے لے کر جاؤں گا تو ہی ڈاکٹر ٹریٹمنٹ شروع کریں گے۔"

"کیا مطلب، وحید کی اتنی سیریس حالت کے باوجود ڈاکٹرز نے ٹریٹمنٹ شروع نہیں کیا؟"

"جب تک رقم جمع نہ کروائی جائے علاج کیوں شروع کریں گے؟ تمہیں نہیں پتا آج کل کے ڈاکٹرز کا۔"

"مجھے اسپتال کا نام بتاؤ، میں بات کرتا ہوں۔"

جے ڈی نے کہا لیکن نبیل نے اسے قائل کر کے ہی چھوڑا۔

"مجھے فون پر وحید کی حالت کے بارے میں ضرور بتاتے رہنا۔"

رقم دے کر جے ڈی نے تاکید کے ساتھ نبیل کو رخصت کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اب سیدھے عشناء کے در پر حاضری دینے نہ پہنچ جانا۔ پہلے اس کامیابی کی خوشی میں اچھا سا لنچ کرواؤ۔" نبیل نے وحید کو بائیک اسٹارٹ کرتے دیکھ کر کہا تھا۔

"صرف لنچ! میں تمہیں ڈنر بھی کروانے کے لیے تیار ہوں۔" وحید بیس ہزار ہاتھ میں آتے ہی جیسے ہواؤں میں اڑنے لگا تھا۔

"لیکن ایک بات ہے وحید! اب تک یہ میرا آئیڈیا تھا لیکن یہ کچھ زیادہ ہو گیا۔" نبیل نے کسی قدر شرمندگی سے کہا تھا۔

"جے ڈی کی شکل دیکھنے والی ہو رہی تھی بہت پریشان ہے تمہارے لیے۔"

"ڈراپ عشناء منحوس پیچھا چھوڑ دے پھر جے ڈی کو بھی سمجھا لیں گے۔ آخر ہم بھی تو یاروں کے یار ہیں۔" وحید نے فرضی کالر جھاڑتے ہوئے کہا۔ یکبارگی اس کی نظر سامنے پیٹرول پمپ پر پڑی جس سے شیبہ اتر رہا تھا۔

"مارے گئے۔" وحید نے سراسیمگی سے کہا، اس دوران نبیل بھی شیبہ کو دیکھ چکا تھا۔

"اگر اس کی نظر ہم پر پڑ گئی تو سمجھو بیچ مارے گئے۔"

وحید نے بائیک کو کک لگائی۔ نبیل اچھل کر پیچھے سوار ہوا اور بائیک جیسے ہواؤں سے باتیں کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"میں نے ابھی نبیل اور وحید کو یہاں سے جاتے ہوئے دیکھا، لیکن فلیٹ بالکل صاف ستھرا ہے، کچن میں بھی کسی فرمائشی پروگرام کی نشانیاں نہیں مل رہیں، اور تم بھی پریشان لگ رہے ہو، جے ڈی! خیریت تو ہے نا؟"

شیبہ اپنے کمرے میں جانے کا ارادہ موقوف کرتے ہوئے اس کے قریب رکا تھا۔ جے ڈی نے اپنی فکرمند نظریں اس پر ٹکائیں اور نفی میں سر ہلانے لگا۔

"خیریت نہیں ہے شیبہ! وحید مر رہا ہے۔"

"وہ تو ہر دوسرے تیسرے دن کسی نہ کسی پہ مر رہا ہوتا ہے، اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے، اب کس پہ مر رہا

ہے؟" جلدی نے جھنجلا کر اسے دیکھا۔
"مذاق کی بھی ایک حد ہوتی ہے شبیہہ! وحید کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے اور۔" جلدی اسے تفصیلات بتانے لگا شبیہہ جیسے جیسے سنتا جا رہا تھا اس کے چہرے کے عضلات تن رہے تھے۔
"ڈونٹ ٹیل می جلدی! کہ تم نے وحید کو بیس ہزار روپے بھجوائے ہیں؟"
"وحید مشکل میں ہے شبیہہ! ایسے میں کیا میں دوست ہو کر تھوڑی سی مدد بھی نہیں کر سکتا تھا۔" جلدی نے ناراضی سے کہا۔
"پہلی بات تو یہ ہے کہ ٹوئنٹی تھاؤزنڈ "تھوڑی سی مدد" نہیں ہوتی دوسری بات یہ کہ تمہیں بہت بہت مبارک ہو کیونکہ اس بار بھی تمہارے دوست تمہیں بدھو بنا گئے ہیں میں نے اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے نبیل اور وحید کو بائیک پر سوار ہو کے یہاں سے جاتے دیکھا ہے۔ اگر وحید واقعی اتنا زخمی ہوا ہے تو یہاں تک بائیک پر کیسے آگیا؟" شبیہہ نے کچا چبانے والے انداز میں کہا تھا۔
جلدی چند لمحے تذبذب کی کیفیت میں کچھ بول ہی نہیں سکا۔
"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو گی شبیہہ!" اس نے کمزور سے لہجے میں کہا۔
"غلط فہمی کیسے ہو سکتی ہے؟ میں بتا تو رہا ہوں میں نے دیکھا ہے میری شکل دیکھ کر وہ دونوں جس طرح بھاگے سمجھ تو مجھے پہلے ہی لینا چاہیے تھا کہ گڑبڑ ہے۔ حد ہو گئی جلدی! تمہیں عقل کب آئے گی ہمیشہ اپنے دوستوں پر بھروسہ کرتے ہو ہمیشہ دھوکہ کھاتے ہو اتنی مرتبہ تو کوئی بے وقوف بھی دھوکہ کھائے تو محتاط ہو جائے گا۔" شبیہہ نے اچھی خاصی جھاڑ پلا دی۔ جلدی سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اسے شبیہہ کی باتیں درست بھی لگ رہی تھیں اور نہیں بھی۔ نبیل اور وحید پر بھی شک کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی سوائے اس کے سابقہ ریکارڈ کے۔
"پھر ایک بات بتاؤ شبیہہ!" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "وحید مجھے دھوکہ کیوں دے گا؟"
"کیونکہ تمہارے سارے دوست دھوکے باز اور فراڈ ہیں۔" شبیہہ نے جل کر کہا۔
"ایسے مت کہو کسی ایک کی خاطر سب کو قصوروار ٹھہرانا کہاں کا انصاف ہے۔"
"تم بیٹھ کر انصاف کرو میں تو تمہارا یہ تازہ کارنامہ دادو کو بتانے لگا ہوں اب جو بھی سمجھانا ہے وہی تمہیں سمجھائیں گی۔" شبیہہ نے دھمکانے والے انداز میں کہا تھا۔
"پلیز۔ پلیز شبیہہ! دادو کو مت بتاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں اگلی بار کسی کی مدد نہیں کروں گا، چاہے کوئی میری آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مر ہی کیوں نہ جائے۔" وہ بے چارا تو بری طرح گھبرا گیا تھا۔
"ویسے بھی شبیہہ! خدا نے ہم پر اتنا کرم رکھا ہے اگر تھوڑا سا پیسہ ہم کسی غریب کو دے بھی دیتے ہیں تو۔"
"پھر وہی بات۔ تم کس قدر الٹی کھوپڑی کے مالک ہو جلدی! انسان دھوکہ کھا کر سنبھلتا ہے دھوکہ دینے والے کو اور اپنی غلطی کو [illegible] نہیں کرتا۔"
"اچھا نا۔ ہو گئی غلطی میں وعدہ کر رہا ہوں دوبارہ ایسا کچھ نہیں ہو گا، پلیز تم دادو کو مت بتاؤ اگر غصے میں آکر انہوں نے میرا اکاؤنٹ فریز کروا دیا تو میرے اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔"
"پھر وحید سے یہ ہی بیس ہزار واپس مانگ لینا۔ اگر اس نے تمہارا خیال کر لیا جس کے بارے میں مجھے یقین ہے وہ ہرگز نہیں کرے گا۔ تو تمہارے کچھ دن تو آرام سے گزر ہی جائیں گے۔" وہ طنز کرنے سے باز نہیں آرہا تھا۔
"شبیہہ!" جلدی نے منت بھرے انداز میں کہا اور تقریباً اس کے آگے ہاتھ ہی جوڑ دیے۔
"میں صرف اس بار تمہاری بات مان رہا ہوں۔" شبیہہ نے اس پر ترس کھاتے ہوئے کہا۔ "بیس ہزار کی تو خیر

تم فکر ہی نہ کرو وحید کے متعلق [illegible] اپنے کسی سو کالڈ فرینڈ پر بھروسہ کرنے [illegible] تمہاری خیر نہیں [illegible] الگ۔" شبیہہ دھمکی دیتا اندر چلا گیا۔ جلدی نے [illegible] اسے دکھ بھی ہو رہا تھا اور شرمندگی بھی۔
"اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی میں واقعی اب کسی کی مدد نہیں کروں گا میں کسی کی بات کا بھروسہ نہیں کروں گا، چاہے کوئی میری منتیں ہی کیوں نہ کرے اور کوئی میرے سامنے مر بھی رہا ہو گا تو مدد نہیں کروں گا۔" اس نے خود سے تہیہ کیا اور گرنے کے سے انداز میں صوفے پر لیٹ کر کشن چہرے پر رکھ لیا تھا۔
اور عین اس وقت جب جلال الدین کسی کی مدد نہ کرنے کا تہیہ کر رہا تھا اسے بے ساختہ ثمینہ یاد آئی تھیں اس کا دل چاہا شبیہہ کو ان کے بارے میں بتائے لیکن اس صورت میں مزید جھاڑ پڑنے کا خدشہ تھا۔ اس لیے دل کی بات دل میں رکھ کر اپنے بے وقوف بنائے جانے کا غم مناتا رہا۔

✿ ✿ ✿

فیضان دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اندر داخل ہوئے تھے۔
"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"
انہوں نے کرسی بیڈ کے قریب رکھتے ہوئے پوچھا۔ تاخیر سے بیدار ہوئے تھے۔ چہرے پر بھرپور نیند کا تاثر اور ہلکی سی نمی محسوس ہوتی تھی۔ ابھی تک نائٹ سوٹ میں ملبوس تھے۔ ثمینہ نے نظروں ہی نظروں میں بھائی کی بلائیں لے ڈالیں۔
"اب تو بہت بہتر ہوں۔ لیکن کندھے میں کھنچاؤ بہت محسوس ہوتا ہے۔" "آج چیک اپ کے لیے جائیں گے تو ڈاکٹر سے کہیے گا [illegible] اور تم اتنی دیر سے کیوں اٹھے ہو طبیعت تو ٹھیک ہے؟" انہوں نے فیضان کی پیشانی چھو کر [illegible]۔
"رات کچھ کام کر رہا تھا سونے میں دیر ہو گئی تھی۔" فیضان نے آنکھیں مسلتے ہوئے جواب دیا۔
"ماما! کافی پئیں گے یا بریک فاسٹ بنا دوں؟" ماوی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ اس نے فیضان کو ایک نظر دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"فی الحال تو کافی۔" پھر اسے کتاب بند کرتا دیکھ کر بولے۔
"تم بیٹھو میں خود بنا لوں گا۔"
ماوی جانتی تھی وہ نہیں اپنے ہاتھ کی کافی زیادہ پسند تھی اس لیے اصرار نہیں کیا، بلکہ بولی۔
"پلیز میرے لیے بھی ہاف کپ۔"
"شرم کرو ماوی۔ یہ نہیں کہ خود اٹھ کر کافی بنا دو اس سے کہہ رہی ہو۔" ثمینہ نے بری طرح اسے جھڑکا تھا، لیکن وہ کندھے اچکا کر بولی۔
"فیضان ماما کو میری بنائی کافی کبھی پسند نہیں آئی۔" اس کی وضاحت پر ثمینہ کو اچھی خاصی تپ چڑھ گئی تھی۔
فیضان ماما کچھ بولے محض مسکراتے باہر نکل گئے۔ چند منٹ بعد کافی کے دو مگ ہاتھ میں لیے واپس آئے تو ماوی بولی۔
"تھینک یو ماما! آپ بہت اچھی کافی بناتے ہیں۔ پلیز شہوز کو بھی بنانا سکھا دیں۔"
"ہاں تاکہ شادی کے بعد یہ محترمہ آرام کریں اور شہوز بے چارہ اسے کافی بنا بنا کر پلائے۔" ثمینہ جل کر

بولیں۔
"تم تو میرے سکھلائے کا نام خراب کرو گی بادی۔"
"اس میں میرا کیا قصور؟ میری اماں نے مجھے کچھ سکھایا ہی نہیں۔" وہ شرارت سے ہنسنے لگی۔
"تو پیپر کہاں ہے؟" ان دونوں کی بحث سے بے پروا فیضان نے پوچھا۔
"اوف میں تو پیپر اٹھانا ہی بھول گئی۔ گیٹ کے پاس ہی پڑا ہوگا۔"
"جاؤ ماموں کو لا کر دو۔" ثمینہ نے فورا" کہا۔ فیضان ہنس دیے۔
"میں لے لوں گا آپا کیوں اس بے چاری کو اٹھا رہی ہیں۔"
"بس اسی لاڈ نے اسے بگاڑا ہوا ہے۔" انہوں نے جھنجلا کر کہا تھا۔
"آپ کو تو بس مجھ میں خامیاں ہی نظر آتی ہیں۔" جس وقت فیضان دروازہ بند کر رہے تھے انہوں نے نادی کو کہتے ہوئے سنا تھا۔
اخبار گیٹ کے قریب رکھے گملوں کے پیچھے پڑا تھا۔ فیضان نے احتیاط سے رول کیے ہوئے اخبار کا ربڑ بینڈ ہٹا کر اسے ایک ہاتھ سے جھاڑ کر سیدھا کیا اور وہیں کھڑے ہو کر شہ سرخیوں پر نظر ڈالنے لگے۔
انہیں وہاں کھڑے چند منٹ گزرے تھے کہ اچانک کچھ گرنے کی زوردار آواز سنائی دی۔ انہوں نے گردن موڑ کر دیکھا شازیہ نے اسٹیل واٹر کین گرا دیا تھا اور اب انیبہ سے جھاڑ سن رہی تھی۔
فیضان کچھ سوچ کر اس طرف آ گئے۔ انیبہ نے شازیہ کو اچھی طرح ڈانٹ پھٹکار کر کوئی حکم جاری کیا۔ وہ خیر منانی بھاگی۔ پھر خود کیاری کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی اور کمر پر دونوں ہاتھ ٹکا کر پودے کو دیکھنے لگی۔ اس کے جھکے ہوئے چہرے پر بیک وقت پریشانی اور صدمہ دکھائی دے رہا تھا۔
"گڈ مارننگ۔" فیضان نے بلا ارادہ اونچی آواز میں کہا۔ انیبہ اپنی ہی دھن میں تھی۔ اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔
"مارننگ۔" وہ سادگی سے مسکرا دی۔ لیکن اس مسکراہٹ میں بھی پریشانی جھلک رہی تھی۔
"خیریت؟ کوئی پریشانی ہے؟" انہوں نے پوچھا۔
"یہ ساری کیاری سوکھ گئی ہے۔ ایک بھی پودا سلامت نہیں۔ سارے مرجھا گئے ہیں۔" ہوا سے بکھرتے بالوں کو کان کے پیچھے اڑستے ہوئے اس نے روہانسی ہو کر کہا تھا۔
فیضان کی نظریں بے ساختہ کیاری تک گئیں۔ لیکن درمیانی فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ کچھ بھی واضح طور پر دکھائی نہیں دیا۔ تب انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے انتظار کرنے کے لیے کہا پھر باڑھ عبور کر کے اس کی طرف آ گئے۔
"یہ پکڑو۔" انہوں نے کافی کا مگ اور اخبار انیبہ کو پکڑایا اور خود پنجوں کے بل بیٹھ کر مرجھائے ہوئے پودوں کا جائزہ لینے لگے۔ انیبہ دلچسپی و فکرمندی سے انہیں کام کرتا دیکھنے لگی۔
فیضان بڑی عرق ریزی سے پودوں کا معائنہ کر رہے تھے۔ ابھی پتے اٹھا کر دیکھتے، ابھی جڑوں میں جھانکتے۔ ان کے ہاتھ مشاقی سے کام کر رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس کام میں بہت ماہر ہوں۔ ان کے ہاتھ مضبوط اور گندمی تھے۔ وہ بلیک ٹراؤزر اور وائٹ شرٹ میں ملبوس تھے۔ جس کی آستینیں کہنیوں سے کچھ اوپر تھیں۔ پیشانی روشن تھی۔ آنکھوں میں ذہانت و پختگی کی بڑی واضح چمک۔ انیبہ کو احساس تک نہ ہو سکا، وہ کب پودوں کو چھوڑ کر ان کا جائزہ لینے لگی۔
(سوئے اتفاق بعض وارداتیں انجانے میں بھی ہو جاتی ہیں۔ خصوصا" جن کا تعلق دل سے ہو۔)

"اچھی شکل تو سبھی کو اچھی لگتی ہے۔ لیکن کسی کسی شخصیت میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ شاید کوئی دیوتا تھا اپالو نام تھا اس کا، بڑا حسین تھا، بے پناہ کشش تھی اس کی شخصیت میں۔ لیکن کیا ان سے بھی زیادہ پرکشش ہوگا؟ ان سے بھی زیادہ حسین؟ حسین؟ لاحول ولا۔ کس قدر زنانہ لفظ ہے۔ ان کے لیے تو کوئی اور لفظ ہونا چاہیے۔ جو ان کے شایان شان ہو جیسے گریس فل۔ شان دار۔ سوبر۔ اور۔ اور اچھا بھی ہوگا کوئی اپالو۔ بڑا حسین، بے حد شان دار۔ ہمیں کیا۔ ہمیں تو یہ ہی پسند ہیں۔"
اپنی ہی سوچوں میں ابھی وہ اسی بری طرح سے گڑبڑائی کہ ہاتھ سے مگ ہی چھوٹ گیا۔ فیضان نے چونک کر اسے دیکھا۔ کافی ضائع ہو گئی لیکن گھاس کی دبیز تہہ ہونے کی وجہ سے مگ ٹوٹنے سے بچ گیا تھا۔
انیبہ اتنی بری طرح سے شرمندہ نظر آ رہی تھی کہ حد نہیں۔
"آئی ایم سوری۔ میں آپ کے لیے اور کافی لاتی ہوں؟"
"اٹس او کے۔ اپنے پلانٹس کے لیے اتنا بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" فیضان نے دوستانہ مسکراہٹ سے اس کے گھبراہٹ زدہ چہرے کو دیکھا۔ وہ اس کی گھبراہٹ کو پریشانی پر محمول کر رہے تھے۔
"نہیں کیڑا لگ گیا ہے۔ گھر میں اگر نیلا تھوتھا ہے تو وہ لے آؤ۔" انیبہ دوڑ کر گئی اور نیلا تھوتھا لے آئی۔
"پانی۔ کدال۔" فیضان چیزیں بتاتے رہے۔ انیبہ بھاگ بھاگ کر مطلوبہ چیزیں فراہم کرتی رہی۔ جب فیضان اپنا کام سمیٹ چکے تو انہوں نے انیبہ کو کچھ ہدایات دیں۔
"شام میں ایک بار پھر یہ لیکوڈ ان پودوں پر اسپرے کرنا۔ کل تک پوری کیاری پھر سے ہری ہو جائے گی۔"
"آپ کو گارڈننگ [illegible]" انیبہ نے [illegible] دیکھا۔
"بچپن [illegible] لیکن [illegible]" فیضان نے سرسری انداز میں کہا۔
"لیکن جب میں تمہارے جتنا تھا اور میرے پلانٹس کو کچھ ہوتا تھا تو میں بھی پریشان ہو جاتا تھا کیونکہ اس وقت میری معلومات بہت کم تھیں۔ پھر میں نے گارڈننگ سے متعلق کلب جوائن کیے اور ایسی کتابیں اور میگزینز پڑھنے لگا جو میری معلومات میں اضافہ کریں۔"
"آپ یقینا" کیپری کارن (capricorn) ہوں گے سارے کیپری کارنز کو گارڈننگ میں انٹرسٹ ہوتا ہے۔" انیبہ نے جھٹ سے خیال ظاہر کیا تھا۔
"اچھا اور Leo (اسد) کے بارے میں کیا خیال ہے۔" فیضان نے مسکرا کر اس چھوٹی سی لڑکی کو دیکھا۔ "میرا مطلب ہے لیو افراد کو گارڈننگ میں انٹرسٹ ہوتا ہے یا نہیں؟" ان کے انداز میں ہلکی سی شرارت تھی۔
"اس کا مطلب آپ Leo ہیں۔" وہ فورا" نتیجہ نکال کر بولی۔ "مجھے اس اسٹار کے بارے میں زیادہ نہیں پتا۔ میں خود Capricorn ہوں۔ اس لیے زیادہ تر اسی کے بارے میں پڑھتی ہوں۔ میرے پاس ایک بک ہے جس میں سارے اسٹارز کے بارے میں لکھا ہوا ہے۔ میں اس میں دیکھوں گی کہ Leo کو گارڈننگ میں انٹرسٹ ہوتا ہے یا نہیں پھر آپ کو بتاؤں گی۔" اس نے سادگی سے کہا۔ جوابا" فیضان بولے
"بالکل ٹھیک اور اگر اس بک میں لکھا ہو کہ Leo کو گارڈننگ میں انٹرسٹ نہیں ہوتا تو میں فورا" گارڈننگ چھوڑ دوں گا۔"
گو کہ ان کے انداز میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ جھینپا جاتا، بلکہ ان کا انداز ایسا تھا جیسے کسی چھوٹے بچے کو بہلا رہے ہوں، لیکن انیبہ کھسیا سی گئی۔

"میرا وہ مطلب نہیں تھا۔"

فیضان نے اس کی شکل دیکھی اور بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔ انیبہ دھک سے رہ گئی۔

(یا اللہ۔ کیا وہ ایالو ہنستا ہوا ان سے زیادہ اچھا لگتا ہوگا؟)

"مطلب وطلب کچھ نہیں۔ میں انتظار کروں گا کہ تم مجھے میرے اسٹار کے متعلق بتاؤ، پھر میں تمہیں گارڈننگ سے متعلق میگزینز اور بکس لا کر دوں گا اور جب ہماری دوستی ہو جائے گی تو میں تمہیں Yellow goddes (دوپہر کا پھول) دوں گا۔" فیضان لاپروائی سے کہہ رہے تھے۔

انیبہ خاموش رہی۔ وہ ان کی طرف دیکھنے سے لاشعوری طور پر احتراز برت رہی تھی اور اس کی نظریں ہاتھ میں پکڑے مگ پر تھیں۔

فیضان نے ذرا سا جھک کر بغور اس کا چہرہ جانچا، پھر ہتھیلی اس کے سر پر جما کر خفیف سا جھٹکا دیا۔

"کیوں؟ ٹھیک ہے نا؟" ان کے لہجے میں اصرار تھا۔ انیبہ نے یونہی نظریں جھکائے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ویری لائیک اے گڈ گرل۔" فیضان مسکرا دیے۔

"ہائے اوئے" آئی ایم سوری۔" انہوں نے مگ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

انیبہ نے تعجب سے انہیں دیکھا۔

"کس لیے؟ کافی تو میرے ہاتھ سے ضائع ہوئی ہے؟" اس نے بے ساختگی سے پوچھا۔

"میں نے اس دن یوفنیس کے پتے کاٹ دیے تھے مجھے تمہاری اجازت لینا چاہیے تھی۔"

"آپ نے تو جو بھی کیا اچھی نیت سے ہی کیا تھا اب سوری بول کے مجھے شرمندہ نہ کریں۔"

"میں آپ کے لیے کافی بھجواتی ہوں۔" اس نے اخبار بھی فیضان کو پکڑایا اور عجلت میں اپنے پورشن کی طرف چلی گئی۔

فیضان اس کی عجلت پر حیران تو ہوئے پھر کندھے اچکا کر انیکسی کی طرف چل دیے۔

☼ ☼ ☼

"یہ تو نے کیا کر دیا دین محمد!"

دین محمد کی ماں سر پکڑے بیٹھی تھی۔ دین محمد نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے تیکھی نظر اس کے منحنی وجود پر ڈالی۔

"وہی کیا، جو کرنا چاہیے تھا۔ اگلی بار باجی زبیدہ نے ایسی ہمت کی اور یہاں آئی میں تب بھی یہی کروں گا۔"

دین محمد نے سرد مہری سے کہتے ہوئے جنت کا سر تھپتھپا کر اسے کھانا کھانے کو کہا تھا جو دادی کی بات پر ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

زہرہ کے انتقال کو تقریباً چار مہینے گزر چکے تھے، لیکن موت کا صدمہ جیسے در و دیوار سے لپٹ کر رہ گیا تھا۔ ماں کی دوری سے جنت کملا کر رہ گئی تھی۔ دین محمد خود بھی بہت افسردہ رہتا، لیکن محض جنت کی خاطر اس نے اپنے غم کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی تھی۔ وہ زیادہ وقت حویلی میں گزارتا، تاکہ جنت کو زندگی کی طرف واپس لا سکے۔ وہ ہمہ وقت اس سے باتیں کرتا، اسے اسکول جانے کی تاکید کرتا، اس کی سہیلیوں کو گھر بلواتا۔ مقصد محض یہی تھا کہ جنت ماں کے صدمے سے نکل کر خوش رہ سکے۔ لیکن جنت زیادہ تر افسردہ ہی رہتی۔

اس عرصے میں دین محمد اپنی ماں کو بالکل فراموش کر بیٹھا تھا۔ جسے بہو کی دائمی جدائی نے صدمہ پہنچایا تھا تو دوسری طرف بیٹی کی دوری اور تذلیل نے نڈھال بھی کر دیا تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ خاموش رہنے لگی تھی۔

پورے دن میں بمشکل [illegible] کا چوتھا [illegible] کھانا وہ بیٹے سے گفتگو سے احتراز برتتی ہوئی کرتی۔ سارا دن وہ کمروں اور دالان میں چکر کاٹتی رہتی۔

اس کی ایسی حالت دیکھ کر کبھی کبھار دین محمد شرمسار ہو کر ماں کی طرف دیکھ بھال کرنے لگتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ باتیں کر کے اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتا۔

لیکن پھر اچانک دین محمد کی ماں کو اس کی بیٹی یاد آ جاتی اور وہ کوئی ایسا ہی سوال کرتی جو دین محمد کو بہن کے ساتھ ساتھ ماں سے بھی متنفر کر دیتا۔ وہ ماں سے خفگی کے اظہار کے طور پر چند روز قصداً" خاموش رہتا اور پھر ماں سے لاتعلق ہو جاتا۔

ایک بار پھر اس کی توجہ کا مرکز صرف جنت بن جاتی اور ماں تنہائی کے آسیب میں جکڑی ہولائی ہولائی پھرتی۔

آج پھر دین محمد کی ماں کو بیٹی کی یاد ستانے لگی تھی اور دین محمد کا سرد مہر سا لہجہ اس کی سماعت سے ٹکرایا تھا۔

"دین محمد ایسا نہیں ہوتا پتر۔ کوئی سگی بہنوں کے ساتھ بھی ایسا کرتا ہے۔" ماں منمنائی تھی۔

"اگر کوئی سگے بھائی کے ساتھ ایسا کر سکتا ہے، اس کی بیوی اور بیٹی کو بددعائیں دے سکتا ہے تو پھر کوئی سگی بہنوں کے ساتھ بھی ایسا کر سکتا ہے۔" اس نے رکھائی سے کہا تھا۔

"ہو سکتا ہے جنت نے جھوٹ بولا ہو۔" ماں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"میں نے کہا تھا میری جنت جھوٹ نہیں بولتی۔" دین محمد نے درشتی سے کہا۔ "اس معصوم کی طرف دیکھ اماں! تجھے لگتا ہے یہ نمانی جھوٹ بول سکتی ہے۔"

"چل اچھا۔ جھوٹ نہ سہی پر اسے سننے میں غلطی تو ہو سکتی ہے؟ بچی ہے کیا پتا پھوپھی نے کچھ کہا ہو، اس نے کچھ سنا۔"

"[illegible]" دین محمد نے غصے سے نوالہ پلیٹ میں پٹخ دیا۔ "[illegible] پھر بھی تجھے اپنی بیٹی سچی اور میری بیٹی جھوٹی لگتی ہے؟"

"اب بوڑھی ماں کو روٹی کا طعنہ دے گا دین محمد۔"

"نہ اماں! میری اتنی مجال کہاں کہ تجھے طعنے دوں۔ طعنے تو تو دے مجھے، چپیڑیں مار میرے منہ پر جس نے تیری بیٹی تجھ سے الگ کر دی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا میں اسے سر آنکھوں پہ بٹھاتا اور کہتا 'کہ باجی! بھر جائی تو تیری بکواس سن کر اللہ کو پیاری ہو گئی، بھائی کو اپنے ہاتھوں سے زندہ دفنا دے۔"

دین محمد کا دماغ بالکل الٹ چکا تھا۔

غم سے نڈھال ماں گہرے گہرے سانس بھرنے لگی۔

"میں یہ کب کہتی ہوں دین محمد! لیکن کوئی راستہ تو نکالا جا سکتا تھا۔ وہ بڑی بہن کے غصہ دبا کے آئی تھی تو بھی دل بڑا کر لیتا، پر تو نے بڑا ظلم کیا، سچ کہتی ہوں دین محمد! تو نے بڑا ظلم کیا میری بچی پر اس کا میکہ چھڑوا دیا۔ اب کون اس کے سر پر ہاتھ رکھے گا۔ نہ بوڑھی ماں اس کے پاس کہ دل کے دکھ روئے، نہ بھائی کہ اس کی چھاں (سایہ) میں ٹھنڈک پائے۔ ہائے۔ بڑا ظلم کیا تو نے۔ کوئی سرد گرم آیا تو کس کے پاس جائے گی؟"

ماں سر پہ ہاتھ رکھ کر جیتی جاگتی بیٹی کو رونے لگی۔

"بات سن اماں! ایک کام کر، تجھے بیٹی کا غم ستا رہا ہے تو اسی کے پاس جا کر رہ، ہاں میں نے دیکھا ہوا ہے باجی زبیدہ کا گھر، چوہے کے بل جتنے گھر میں رہنے والے وہ غریب لوگ اتنی جگہ تو نکال لیں گے کہ تو وہاں رونے جا، اسی کو

بتاؤ کہ وہ بچی تھی اور میری بیٹی جھوٹی؟ مجھے تو اس بات سے دلچسپی نہیں کیونکہ جانتا ہوں میری بیٹی بچی ہے، وہ بھی جھوٹ نہیں بول سکتی۔ ایسی معصوم بھولی بھالی صورت کی سچائی پر کوئی شک کرے تو اس کی عقل پر شک کرنا چاہیے۔ مجھے تو آسمان سے آ کر اللہ کے فرشتے بھی کہیں کہ جنت نے جھوٹ بولا تھا تو میں یقین نہ کروں۔ اتنا بھروسہ ہے مجھے اپنی بیٹی پر۔" غصے سے لال چہرہ لیے دین محمد دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔

دین محمد کی ماں ہکا بکا رہ گئی۔

"کفر نہ بک دین محمد! تجھے اللہ کا واسطہ۔"

وہ زیر لب بڑبڑا کر رہ گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا بیٹا... اتنی عقل والا بیٹا ایسی گناہ کی بات بھی کر سکتا ہے۔

گناہ اور خدا کے قہر کے خوف سے اس کی روح کانپنے لگی تھی اور سارے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔

اپنے سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے جنت کی طرف دیکھا۔ جنت دادی کے رونے اور باپ کی اونچی آواز سے خائف ہو گئی تھی اور اب دادی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دادی کو اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ جلدی سے اپنی پلیٹ پر جھک گئی اور جلدی جلدی کھانے لگی۔ دین محمد کی ماں اسے دیکھتی چلی گئی۔ اس کے دل میں کوئی وہم جڑ پکڑ رہا تھا۔ اور اس کی نظریں جنت پر سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔

ضروری نہیں کہ تباہی ہمیشہ شدید زلزلے کی کوکھ سے جنم لے، کبھی کبھار معمولی نوعیت کے مسلسل جھٹکے بھی عمارتوں کو مسمار کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

"لیو (Leo) افراد باوقار شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ مضبوط قوت ارادی، پرعزم اور خود بین۔ مسلسل جدوجہد کے قائل ہوتے ہیں۔ کبھی ہار نہیں مانتے۔ ایک بار ارادہ کر لینے کے بعد ممکن نہیں کہ پیچھے ہٹ جائیں۔ یہ ساتھ نبھانے والے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ تنہائی پسند نہیں ہوتے بلکہ مل بیٹھنے کے شوقین ہوتے ہیں۔ ان کی قوت برداشت اتنی بہترین ہوتی ہے کہ بری سے بری صورت حال میں دل کی ناپسندیدگی چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ بہت ہی لونگ اور لوایبل پرسنالٹیز کے مالک ہوتے ہیں یہ لوگ۔ پھر ان کے یہاں محبت کے جذبے کی اہمیت بھی بہت ہوتی ہے۔ یہ بہت دور اندیش، ذہین، دانا اور مستقل مزاج ہوتے ہیں۔

خوش مزاج بھی بہت ہوتے ہیں اور ہر طرح کی صورت حال کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔"

"او بھائی! انیہ تم لونہ میں نہ ہی مجھے Zodiac Signs کے بارے میں جاننے کا شوق ہے، پھر آخر کیوں تم اپنا یہ ریسرچ ورک میرے دماغ میں انڈیلنے کی کوشش کر رہی ہو؟" ہادی نے چائے کی کیتلی میں جھانکتے ہوئے اکتا کر پوچھا۔

وہ برنر کے قریب کھڑی تھی جبکہ انیہ کچن شیلف پر چڑھی بیٹھی نمکس نمکو کی پلیٹ میں سے چن چن کر مونگ پھلی کھاتے ہوئے اپنی تازہ ترین معلومات سے اسے زبردستی مستفید کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تمہارا یا میرا اسٹار نہ سہی لیکن کسی کا تو ہوگا۔" انیہ نے خیال ظاہر کیا۔

"وہ "کسی" سے مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟" ہادی نے لاپروائی سے پوچھا تھا۔

"کیا مطلب؟ تمہیں اپنے ماموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے؟" انیہ نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

"تمہارا مطلب فیضان ماما کا اسٹار لیو ہے؟" ہادی حیران ہوئی۔ "ہائے، میرے ماموں ہیں اور مجھے ہی نہیں پتا۔ تمہیں کس نے بتایا؟"

"انہوں نے خود بتایا تھا۔"

"ارے، کمال ہے۔ ہمارے ماموں نے ہمیں کبھی نہیں بتایا۔"

ہادی نے چونک کر اور بغور انیہ کو دیکھا۔ وہ اپنی ہی دھن میں تھی۔

"ویسے اتنی ساری خصوصیات کے ساتھ ان افراد میں ایک بری عادت بھی ہوتی ہے۔ ان کا مزاج آتشی ہوتا ہے۔ حیرانی کی بات ہے، فیضان ماما تو غصہ ور نہیں لگتے۔" انیہ کہہ رہی تھی۔

"ارے توبہ کرو۔ غصہ تو انہیں ایسا زوردار آتا ہے کہ بڑے بڑے جی دار کانپ جائیں لیکن تسلی کی بات یہ ہے کہ غصہ سال میں ایک ہی بار آتا ہے۔ اسی لیے مجھے لگتا ہے ان کی بیوی بہت خوش رہے گی۔ بس ہر سال چند روز کی ناراضی اور غصہ جھیلنا پڑے گا اور بس۔ اس کے بعد سکون ہی سکون۔"

"ارے ہاں۔ بیوی سے یاد آیا۔ انہوں نے اب تک شادی کیوں نہیں کی۔ اچھے تو بڑے ہیں۔" اس نے ہادی سے پوچھا۔

"بوڑھے تو نہیں ہیں۔" ہادی تنک کر بولی۔ "مجھ سے کچھ سال ہی بڑے ہوں گے۔" اپنے ہینڈسم سے ماموں کو بوڑھا کہلوانا اسے بالکل منظور نہیں تھا۔

"ایک دفعہ میں نے پوچھا تھا، کہنے لگے، ابھی تک کوئی اتنی اچھی ہی نہیں لگی کہ شادی کرتا۔ جس دن پسند کے مطابق لڑکی مل گئی شادی کر لوں گا۔"

"تو ان کی پسند کی لڑکی کیسی ہے؟" انیہ خاصی مشتاق نظر آئی۔

"یہ تو پتا نہیں۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا، پھر جلدی سے بولی۔

"ہاں، لیکن میں ان سے کہوں گی انیہ پوچھ رہی تھی کہ آپ کو کیسی لڑکی پسند ہے۔" اس نے کیتلی ٹرے میں رکھتے ہوئے نیم شرارت سے کہا۔

"خبردار! میرا نام مت لینا۔" انیہ نے جلدی سے کہا۔

"اچھا۔ میں چلتی ہوں۔" وہ چھلانگ لگا کر شیلف سے اترتے ہوئے بولی۔

"مجھے پتا ہے۔ تمہیں چلنا آتا ہے۔ اب چپ چاپ اندر چلو، چائے پی کر چلی جانا۔" ہادی نے کہا۔

"نہیں ہادی! میں تو یونہی آ گئی تھی۔ چائے پینے کا بالکل موڈ نہیں۔ باتیں کرنے کا موڈ تھا۔ لیکن اب تم اپنے مہمان نمٹاؤ۔ میں بھی جا کر دیکھوں ڈیڈی اگر جاگ گئے ہوں تو بتاتی ہوں کہ توقیر انکل آئے ہوئے ہیں۔" وہ کچن کے مخالف دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی، پھر کچھ خیال آنے پر دروازے کے قریب رک کر بولی۔

"سنو ہادی! اپنے ماموں کے سامنے میرا نام مت لینا، پلیز۔ میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا۔ وہ کیا سوچیں گے یہ لڑکی میری پسند کے بارے میں اتنی انٹرسٹ کیوں کر رہی ہے۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا اور جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی مبادا ہادی کچھ اور کہہ دے۔

"صرف وہی کیوں؟ میں تو خود یہی سوچ رہی ہوں۔" ہادی نے آنکھیں سکوڑ کر دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے دل میں خود سے کہا، پھر اسی پرسوچ انداز میں سرونگ ٹرالی گھسیٹتی کچن سے باہر لے گئی۔

☆ ☆ ☆

"آپ کا بھی جواب نہیں شمینہ آپا! کیا ضرورت تھی بس کو ٹکر مارنے کی؟ مجھے فیضان نے بتایا اور میں دیکھ کر آ رہا ہوں۔ بس کا سامنے والا حصہ تو بالکل صحیح ہو گیا۔ ایسے زبردست ڈینٹ پڑے ہیں کہ کیا بتاؤں۔"

توقیر صاحب کی سنجیدگی سے کہی ہوئی بات کے جواب میں قہقہے بلند ہوئے تھے۔

"یہ فیضان اور ہادی کم تھے میری ٹانگ کھینچنے کے لیے کہ تم بھی آگئے۔" ثمینہ نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ شگفتگی سے جواب دیا۔

"ابھی کل ہی ہادی کہہ رہی تھی۔ ممی! جہاں آپ گری تھیں سنا ہے وہاں سڑک پر گہرا گڑھا پڑ چکا ہے۔ ٹریفک کی آمد و رفت میں اچھا خاصا خلل پڑ رہا ہے۔" اس پر فیضان کہنے لگا۔

"آپ اس بات کا ذکر کسی اور سے مت کرنا۔ کسی کو بھنک بھی پڑ گئی کہ وہ گڑھا آپا کی وجہ سے پڑا ہے تو حکومتی املاک کو نقصان پہنچانے کے جرم میں آپا دھر لی جائیں گی۔ میں ایک ہفتہ بعد دبئی جا رہا ہوں۔ تم کہاں آپا کو چھڑوانے کے لیے تھانے اور عدالتوں کے چکر لگاتی پھرو گی۔"

بتاؤ "آپا اتنا زخمی ہو گئی سات دن اسپتال میں رہ آئی۔ اب تک بازو پر پلاسٹر لگائے گھوم رہی ہے اور یہ ہیں کہ آپا سے زیادہ سڑک اور بس کی فکر میں ہلکان ہو رہے ہیں۔" ثمینہ نے آڑے ہاتھوں سب کو لیا۔

"فیضان تو لگتا ہے آج کسی اور ہی فکر میں ہلکان ہے۔" توقیر صاحب نے توپوں کا رخ فیضان کی طرف موڑا۔

"کیوں میاں! ہمیں بھی تو اس فکر کا نام بتاؤ۔" انہوں نے شرارت سے کہا۔ فیضان چائے کا کپ ہاتھ میں لیے واقعی کسی گہری سوچ میں تھے۔ توقیر صاحب کی بات سن کر اور ثمینہ آپا اور منیزہ بھابھی کی نظریں خود پر مرکوز دیکھ کر جھینپ سے گئے۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے توقیر بھائی! میں تو بس یوں ہی کچھ سوچ رہا تھا۔"

"یہی تو ہم جاننا چاہ رہے تھے کہ "سوچ رہے ہو۔" بھئی اس سوچ کا کوئی اچھا سا نام بھی تو ہو گا۔" انہوں نے تو فیضان کا پیچھا ہی لے لیا۔ فیضان ان کی رگ رگ سے واقف تھے فوراً مسکرا کر بولے۔

"آپ [illegible] بھئی کیوں آپ [illegible] تو ہوں گے نہیں۔ ایسا کیجیے کوئی اچھا سا نام خود ہی تجویز کیجیے۔ میں وہی لے لیتا ہوں [illegible] آپ ہی کی [illegible] کے لیے [illegible]"

"دیکھ رہی ہیں ثمینہ آپا! کس سہولت سے یہ دامن بچا رہا ہے۔ میں تو کہتا ہوں کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر اس کے ہاتھ پیلے کر دیں ورنہ یہ تو جانے کون کون سی فکر پال کر سوچوں میں ہی الجھا رہے گا۔"

"یقیناً" آپ کے بھی ہاتھ "پیلے" ہی ہوئے ہوں گے۔" فیضان نے سہولت سے ان کا جملہ پکڑا تھا۔

"ارے ایسے ویسے۔" توقیر صاحب نے ترنت کہا۔

"لیکن بھئی۔ خدا گواہ ہے وہ جو ایک بار پیلے ہوئے تھے تو آج تک نیلے ہوتے ہیں۔ خوف سے۔" اس بات پر ایک اور قہقہہ بلند ہوا یہ الگ بات کہ جھینپنے کی باری اس بار منیزہ کی تھی۔

"توبہ ہے۔ پتا نہیں ان مردوں کو ہر وقت خود کو مظلوم ثابت کرنے کا شوق کیوں رہتا ہے۔ چاہے صبح سے شام بیوی کی دوڑ لگوائے رکھیں۔" منیزہ نے خفگی سے توقیر صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ذرا فیضان کی شادی ہو لینے دو پھر ہم دونوں خوب اچھی طرح سے اس سوال پر غور کرنے کے بعد اس اہم سوال کا جواب دیں گے۔"

"مجھے تو معاف رکھیں۔ آپ کا جواب تیار کروانے کے لیے میں اپنا سکون اور آزادی کی قربانی نہیں دے سکتا۔" فیضان نے جلدی سے کہا۔

"بھئی۔ حد ہے۔ تم سے کس نے کہہ دیا شادی سکون اور آزادی کی بربادی ہے؟ یہ تو بڑا خوبصورت رشتہ ہوتا ہے جب انسان خود کو مکمل محسوس کرنے لگتا ہے ورنہ بنا شادی کے بھی کوئی زندگی ہے جیسے بنا پہیوں کی گاڑی۔"

کم گو توقیر صاحب بہت دھیمی آواز میں بول رہے تھے مبادا بیوی کے کان میں آواز پڑ جائے اور بعد میں اعتراض

پھر بس کہ ابھی بلا واسطہ [illegible] فیضان کی ہنسی چھوٹ گئی وہ دیر تک محظوظ ہوئے۔

"میں بتاتا ہوں بھابھی کو۔ آپ کے نیک خیالات سے وہ بھی تو فیض یاب ہوں۔"

"ہوں۔ یعنی بلیک میلنگ۔" توقیر صاحب پھر بھی متاثر نہ ہوئے۔

"تمہاری بھابھی کو کیا فرق پڑتا ہے اتنے سال ہو گئے ہماری شادی کو۔ تمہارا کیا خیال ہے تمہاری بھابھی اب تک ہمارے خیالات سے واقف نہیں ہوں گی۔" توقیر صاحب شگفتگی سے بولے تھے۔

منیزہ نے گلا کھنکار کر انہیں متوجہ کیا۔

"محفل میں بیٹھ کر دھیمی آواز میں گفتگو کرنا بد تہذیبی کے زمرے میں آتا ہے۔" انہوں نے جتایا۔

"میں ذرا بیویوں کے فوائد پر روشنی ڈال رہا تھا۔" توقیر صاحب نے کہا۔

"جی ہاں۔ آپ کو تو بڑا عبور ہے اس موضوع پر۔ ذرا ہمیں بھی تو بتائیں کتنی بھگتائے بیٹھے ہیں۔" منیزہ جل کر بولیں۔

"ایک کے بعد دوبارہ ہمت ہی نہیں ہوئی۔" انہوں نے مسکین سی شکل بنا کر جواب دیا۔ ثمینہ اور فیضان محض ہنسنے والوں میں شامل تھے۔

"اچھا بھئی۔ مذاق برطرف۔ فیضان کو ڈرائیں نہیں بے چارہ سمجھے گا بیوی بڑی مصیبت قسم کی چیز ہوتی ہے۔"

"مذاق؟" توقیر صاحب نے اچنبھے سے کہا۔ "میں سو فیصد سنجیدہ ہوں بیگم۔" وہ فیضان کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس پڑے۔

"اور میرے لیے کیا حکم ہے؟" "یعنی آپ کے کس بیان پر یقین کیا جائے؟"

فیضان نے شرارت سے [illegible] پوچھا۔

"بات [illegible] یوں ہے فیضان!" توقیر صاحب [illegible] کرتے ہوئے [illegible] "کہ ہمارے شادی شدہ افراد کی سائیکالوجی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ ان سے کوئی کنوارا خوش و خرم برداشت نہیں ہوتا۔ خواہ مخواہ حسد ہونے لگتا ہے کہ۔ ہمارے سر پر تو بیوی نام کی تلوار تو ہر وقت لٹکتی ہے یہ کنوارا کیوں خوش ہے۔ چلو اس کی بھی شادی کرواؤ۔ لیکن جوں ہی وہ کنوارا شادی کرنے کے لیے راضی ہوتا ہے تو ہمیں اس پر ترس آنے لگتا ہے کہ اس کی زندگی سے خوشی اور سکون ختم ہونے والا ہے تب ہم دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بے ساختہ تاریک پہلو دکھانا شروع کر دیتے ہیں شادی کے۔" دونوں ہنسنے لگے۔

"اوہو توقیر! بس کریں پلیز۔ فیضان تو پہلے ہی شادی کا نام نہیں لے رہا آپ اور ڈرا دیں۔"

"واقعی توقیر! آپ ہی اسے سمجھائیں۔ میں تو کہہ کہہ کر تھک گئی آخر کب کرے گا شادی؟" ثمینہ نے کہا۔

"تو آپ کس انتظار میں ہیں؟ میں تو پہلے ہی کہہ رہا ہوں کوئی اچھی لڑکی دیکھ کر اس کے ہاتھ پیلے کر دیں۔ نکاح کی تقریب میں اس کو لانے کی ذمہ داری میری ہوئی۔ ایک طرف سے بازو پکڑ کر میں بیٹھوں گا دوسری طرف فیاض کو بٹھا دیں گے پھر دیکھیے گا یہ محترم کیسے رسہ تڑا کر بھاگتے ہیں۔" توقیر صاحب نے دھمکی آمیز انداز میں فیضان کو دیکھا۔ وہ خفیف سے ہو کر بولے۔

"اب آپ مجھے بیل بکرے کی طرح تو ٹریٹ نہ کریں توقیر بھائی! شادی نہ ہوئی سچ مچ قربانی ہو گئی۔"

"اور بعد کی ذمہ داری کون لے گا؟ میں کسی لڑکی کی زندگی کیوں خراب کروں زبردستی اس کے سر منڈھ کے۔ جبکہ اس سے اچھی طرح واقف بھی ہوں۔" ثمینہ کو فیضان سے کم سے کم اس معاملے میں کچھ اچھی امید نہ تھی۔

"ایسا لاپروا تو نہیں ہے میرا خیال ہے ذمہ داری نبھالے گا۔" توقیر نے جانچتی نظروں سے فیضان کو دیکھا جو سر

جھکائے جیسے ہر بات سے بے نیاز بیٹھے تھے۔

"ضد دار تو وہ ہے لیکن ساتھ ہی ضدی بھی بہت ہے اور اب سے نہیں بچپن سے۔ ایک مرتبہ سخت سردیوں میں تربوز کھانے کی فرمائش کر دی۔ اب بتاؤ ایسی ٹھٹھرا دینے والی سردی میں تربوز کہاں تلاش کیا جائے۔ فیاض بھائی پورے تین دن تک منڈی چھانتے پھرے کہ تربوز مل جائے گا تربوز کو نہ ملنا تھا سو نہ ملا اور نہ یہ ٹلا۔ چوتھے روز روح افزا گھول کر پلایا کہ یہ تربوز نہ سہی اس کا جوس ہی سہی تب اس نے ضد چھوڑی۔"

"خدارا ثمینہ آپا! میرا بچپن گزر چکا۔ اب بچپن کے قصوں کو بھول بھی جائیں۔" فیضان نے شرارت سے کہا تھا۔

"تم نے تو بچپن کی ضد اب تک نہ چھوڑی۔ ایک یا... جس کا نام لیا تھا اسی کا غم سینے سے لگائے بیٹھے ہو۔" ثمینہ بے ساختگی سے بولیں۔

"میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔" فیضان نے اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے تیزی سے کہا۔ "آئیں توقیر بھائی! باہر چل کے بات کرتے ہیں۔"

"باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہیں کرتی میں بات۔" ثمینہ نے خفگی سے کہا۔ فیضان نے ناراضی سے انہیں دیکھا پھر مصلحتاً بیٹھ رہے۔ توقیر صاحب نے ایک نظر دونوں بہن بھائی کو دیکھا۔

"تم تو بار اخفا ہو گئے۔"

"خفگی کی بات نہیں ہے توقیر بھائی! بس میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔" فیضان نے سادگی اور قطعیت سے کہا تھا۔

"میں دانیال حسن کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"اچھا پھر کیا نتیجے پر پہنچے؟" توقیر صاحب نے صوفے اور ثمینہ آپا کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ سب ہی دانستہ گفتگو کا سلسلہ بدل چکے تھے۔

"توقیر بھائی! مجھے دانیال حسن کے بارے میں کوئی بات کھٹک رہی ہے۔" فیضان نے الجھن آمیز انداز میں کہا۔

"اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ ایک بار انکار کرنے کے بعد وہ دوبارہ ایسا نہیں کریں گے۔ اگر کچھ عرصہ بعد انہوں نے کوئی اعتراض کیا تو؟" انہوں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"وہ ایسا کچھ نہیں کرے گا۔ میں جو کہہ رہا ہوں۔" توقیر صاحب نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا جو ماوی نے سرو کیا تھا۔

"میں نے اسی لیے کچھ روز بعد دبئی جانے کا فیصلہ کیا کہ پہلے دانیال حسن صاحب کا ارادہ معلوم کر لوں پھر وہیں جا کر فیکٹری کے انتظامات دیکھوں۔ بات یہ ہے توقیر بھائی! ثمینہ آپا ہمیشہ میری بہن رہیں گی اور ظاہر ہے ان کی بیگم بھی ان کے ساتھ رہیں گی۔ ایسا نہ ہو ان کا کوئی وہم ہمارے کاروباری مراسم پر اثر انداز ہو گو کہ ہونا تو نہیں چاہیے۔"

"دانیال ایسا کچھ نہیں کرے گا فیض! میں اسے بڑی اچھی طرح جانتا ہوں تھوڑا سا جذباتی ضرور ہے لیکن بے عقل قطعاً نہیں۔ اسے دوبارہ انکار کرنا ہوتا تو اس بار حامی بھرتا ہی نہیں۔"

"دیکھ لیں توقیر بھائی! میں صرف آپ کی وجہ سے اس کام میں ہاتھ ڈال رہا ہوں ورنہ سچ تو یہ ہے کہ دانیال صاحب کی طرف سے میرا دل مطمئن نہیں ہے۔"

"او ہو بھئی۔ اب تم وہم نہ کرو۔ ابھی چلتے ہیں دانیال کی طرف میں اسی لیے آیا ہوں کہ آج فائنل ڈسکشن ہو جائے یا اسٹریجی تو ضرور پلان کر لیں پھر لیبر ہائر کرنا بھی ایک کام ہوگا۔"

ان کے کہنے پر فیضان نا کوئی اگلا اعتراض اٹھائے سہلانے لگے۔ یہ الگ بات کہ دل ہنوز اسی ایک نکتے پر اٹکا ہوا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد جب دانیال حسن سے ملاقات ہوئی تو ان کے خدشات بہت حد تک ختم ہو گئے کیونکہ دانیال حسن بہت اچھے طریقے سے ملے اور فیضان کا بخوبی خیر مقدم کیا۔ بلکہ فیکٹری کے معاملات میں بھی بھرپور دلچسپی ظاہر کی تھی۔

فیضان واپس آئے تو بے حد مطمئن ہو چکے تھے۔

دوسری جانب دانیال حسن کہیں دل ہی دل میں یہ نکتہ سمجھ چکے تھے کہ ان کی ناراضی عمن کی چپقلش یا ان کی جھنجلاہٹ ثروت کے لیے ہے پھر ساری دنیا سے منہ موڑنے کا فائدہ؟

کاروبار تو کرنا ہے۔ روپیہ تو کمانا ہے۔

وہ ملا رہیں ہے تو چلو یونہی سہی۔

فیملی لائف تباہ ہو رہی ہے۔ ہو جانے دو۔

"بچوں پر برا اثر پڑے گا؟ بچے اب بچے بھی تو نہیں رہے بڑے ہو گئے ہیں۔ سمجھ سکتے ہیں غلطی کس کی تھی۔ ہم تو بھی ناراضی بھی نبھائیں گے۔ دنیاداری بھی کرنا پڑے گی (اور۔ اور اپنا خون بھی جلائیں گے۔)"

دانیال حسن سب کچھ سوچ چکے تھے۔

☆ ☆ ☆

"جلال صاحب! جلال صاحب!"

اس کی گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ ورکشاپ پہنچا کر ٹیکسی سے گھر آیا لیکن موسم اتنا اچھا ہو رہا تھا کہ ٹیکسی اس نے مین روڈ پر ہی رکوا لی اور چہل قدمی کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف چلا۔

شام [illegible] کا وقت تھا۔ بادل آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ [illegible] کی ٹھنڈی ہوا [illegible] ہو چکی تھی [illegible] کہ بس ابھی آسمان سے اگلی بوچھاڑ آئی [illegible] اور پھر آن کی آن میں ہر سمت جل تھل ہو جائے گا۔ سر جھکائے جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ راستے میں آئے ایک پتھر کو ٹھوکر مار رہا تھا جب اچانک کسی نے اس کے نام کے نعرے لگانا شروع کر دیے۔ جلال نے سر اٹھا کر متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ یہ کون محترمہ تھیں جو اس قدر دلکش موسم میں اس موسم سے کہیں زیادہ خوبصورت سریلی آواز میں اس کا نام پکار کے پورے ٹاؤن میں اسے "مشہور" کرنے کا ارادہ کیے بیٹھی تھیں۔

"جلال صاحب!"

اس بار آواز اسے اپنے عقب سے ابھرتی محسوس ہوئی تھی۔ متجسس انداز میں اس نے گردن موڑی پھر ماوی کو دیکھ کر سٹپٹا سا گیا۔ اس کے ڈر سے ہی تو ہسپتال سے بھاگا تھا۔ "یہ یہاں بھی پہنچ گئی۔ پچھل پیری۔ اس نے تو شیبہ جیسے بندے کو نہیں بخشا۔ میرا کیا حشر کرے گی یا اللہ۔ بچا لینا۔"

وہ دوڑنے کے انداز میں لمبے لمبے ڈگ بھرتی اس کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھی۔ یہ جل تو جلال تو کا ورد کرنے لگا۔

ماوی چند قدم پر آ کر رک گئی۔ لبوں پر مسکراہٹ، سانس پھولی ہوئی۔

"آپ تو کمال ہیں جلال صاحب! کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔ لیکن آپ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ میں تو آپ کا تعاقب کرتے کرتے مر گئی ہاہ۔"

بے ترتیب سانس بحال ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔

"آپ تو ہسپتال سے ایسا گئے کہ مڑ کر آئے ہی نہیں۔ میری ممی نے تو آپ کا بہت انتظار کیا اور صرف ممی ہی کیوں؟ میں خود اسی دن سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔ اس روز تو مجھے اتنا ہوش ہی نہیں تھا کہ آپ کا شکریہ ادا کرتی مگر بعد میں میں نے بہت سوچا کہ جس انسان نے میری ممی کی اتنی مدد کی اس کا شکریہ تو بڑے اچھے طریقے سے ادا کرنا چاہیے تھا لیکن شکریہ کس کا ادا کرتی آپ تو دوبارہ آئے ہی نہیں۔"

اس قدر سانس پھولی ہونے کے باوجود وہ خاموش ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بس نان اسٹاپ بول رہی تھی۔

"ابھی میں نے آپ کو گھر کے ٹیرس سے دیکھا تو بھاگی چلی آئی۔ سوچا کہیں اس بار بھی آپ ہاتھ سے نکل ہی نہ جائیں پھر میں کہاں آپ کو تلاش کرتی۔ پہلے ہی تو دعائیں کر کر کے دکھائی دیے ہیں۔"

"سچ۔ اتنی خوشی ہو رہی ہے آپ کو دیکھ کر۔ اتنا خوش تو میں بچپن میں اپنے فیورٹ کارٹون کریکٹر مکی ماؤس کو دیکھ کر بھی نہیں ہوتی تھی جتنا آپ کو دیکھ کر ہو رہی ہوں۔"

بے ساختگی سی بے ساختگی تھی۔

"جی۔" جلالی نے بدک کر کہا کیونکہ وہ تو اسے دیکھ بھی اتنے اشتیاق سے رہی تھی جیسے وہ انسان نہیں مکی ماؤس ہی ہو۔

"میرا مطلب ہے میں آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں۔" ماوی نے جلدی سے کہا تھا۔ "تھینک یو جلال! آپ نے ممی کی مدد کر کے اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ میں کبھی اس کا بدلہ نہیں اتار سکتی۔ اس کا اجر صرف آپ کو اللہ سے ملے گا لیکن میں ساری زندگی آپ کے لیے دعا کروں گی کہ آپ کو بہت ساری خوشیاں ملیں۔ تھینک یو جلال۔ تھینک یو سو مچ۔"

"آپ بار بار شکریہ کر کے مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔"

ماوی چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی تھی غالباً سانس لینے کا خیال آیا تھا۔ اسی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جلال نے جلدی سے کہا۔

جھینپا ہوا انداز گھبرایا ہوا لہجہ۔

ماوی نے چونک کر اسے دیکھا بلکہ بڑے غور سے دیکھا۔ اس لمبے چوڑے ڈیل ڈول والے لڑکے میں ایسی کون سی بات تھی جو غیر معمولی سی محسوس ہوتی تھی۔

"کیوں؟" ماوی نے یکدم کہا۔ "احسان کیا ہے تم نے، شکریہ تو بنتا ہے اور اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے کوئی شکریہ کہے تو اسے حق کی طرح وصول کرنا چاہیے نہ کہ شرمندہ ہونا چاہیے۔"

عجب بے تکلف لڑکی تھی۔ آپ سے "تم" پر آنے میں منٹ بھی نہیں لگایا۔ جلال نے سوچا پھر جھجکتے ہوئے بولا۔

"بس مجھے شرمندگی سی ہوتی ہے۔ جب کوئی بار بار شکریہ کہے۔ آپ بھی نہ کہیں۔ آپ کی مدد کی تو انسانیت کے ناتے کی ہے۔"

"خیر آج کل تو انسان انسانیت کے ناتے بھی کسی کی مدد نہیں کرتے۔"

"اچھا۔ ہو سکتا ہے۔ میں نے کبھی غور نہیں کیا۔" اس نے فوراً ہی ہار مان لی بلکہ حقیقتاً جان چھڑانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ماوی کو یقین نہیں آیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟ آج کل تو سب غور کرتے ہیں۔" وہ معترض ہوئی پھر جلدی سے بولی۔ "عمل کریں نہ کریں غور ضرور کرتے ہیں۔ ویسے میں سمجھ گئی تم نے انسانیت کے ناتے کوئی مدد وَدد نہیں کی اصل میں تمہارا دل بہت

اچھا ہے۔ سب کا دل اچھا تھوڑا ہی ہوتا ہے [illegible] تمہاری تعریف ہی کر رہی ہوں ناں کی تھی۔ میں نے سوچا ممی کو تو سب ہی اچھے لگتے ہیں [illegible] تم تو واقعی بہت اچھے ہو۔ لوِلی ویری ڈفرنٹ۔ تم تو مجھے اس دن بھی بہت اچھے لگے تھے جس دن تمہارے اسٹوپڈ دوست سے بلا وجہ مجھ سے جھگڑا کیا تھا اور تم نے بہت سمجھداری سے جھگڑا ختم کروا دیا تھا لیکن مجھے تمہارا دوست بالکل اچھا نہیں لگا۔ سو روڈ۔" اس نے ناک چڑھا کر کہا۔

"ایک مشورہ دوں؟ تمہیں اس کے ساتھ دوستی نہیں رکھنی چاہیے۔ اچھے لوگوں کے دوست بھی اچھے ہونا چاہئیں۔" کھٹ سے مشورہ آیا۔ جلال بے چارہ ہنوز حواس باختہ۔

"جی۔ جی۔ میں چلتا ہوں۔"

تیز ہوا کے ساتھ پہلی بوند اس کی ناک کی پھننگ سے ٹکرائی تھی۔

"اسپتال تو نہیں آئے لیکن گھر ضرور آنا۔ ممی تم سے ملنا چاہتی ہیں پلیز ضرور آنا۔ ہم وانیال حسن کی اینکسی میں رہتے ہیں۔ سو وہاں۔" اس نے اشارے سے بتایا۔

"جی۔ جی۔ ضرور آؤں گا۔" اس کا بس نہ چلتا تھا کسی طرح یہاں سے کھسک لے دوسری طرف ماوی بولنے کی شوقین بھی بہت تھی۔

"کیا پرامس؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

"میں انتظار کروں گی۔"

جلال تو اس لڑکی کے انداز پر حیران تھا۔ سو سر ہی ہلا سکا اور خیر منانا چل پڑا۔ ماوی کو اس کی عجلت دیکھ کر گدگدی سی ہونے لگی۔

"سنو۔" اس نے شرارت سے پکارا۔ جلال کے قدم سست پڑ گئے۔

"آپ کیا [illegible]" اس نے بمشکل [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible]

جلال پر گھبراہٹ طاری ہوئی پہلی بار کسی لڑکی نے پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ وہ کمان سے نکلے تیر کی طرح بھاگا۔

ماوی کے لیے اپنے قہقہے کا گلا گھونٹنا مشکل ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"پتا ہے ممی ابھی کس سے مل کر آ رہی ہوں؟" ماوی نے واپس آ کر سنسنی پھیلانے کی کوشش کی۔ ثمینہ اس وقت بیڈ پر نیم دراز نظر کا چشمہ لگائے میگزین دیکھ رہی تھیں اس بات پر ابرو اچکا کر چشمے کے اوپر سے اسے دیکھا۔

"کس سے مل آئی ہو؟" وہ ذرا بھی متجسس نہ ہوئی تھیں۔ ماوی کو ان کے انداز میں سرسری پن دیکھ کر مایوسی ہوئی۔

"جلال سے۔" وہ اپنا لیپ ٹاپ آن کرتے ہوئے بولی۔

"جلال سے؟" ثمینہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ "جلال الدین سے؟" ماوی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تمہیں وہ کہاں ملا؟ میرا مطلب ہے تمہاری ملاقات کہاں ہو گئی؟"

"ابھی ابھی گھر کے باہر ملاقات ہوئی ہے۔"

"اس کا ایڈریس ہی لے لیتا ہادی! یا اندر ہی بلا لیتیں۔ میری بھی ملاقات ہو جاتی۔ پتا نہیں دوبارہ ایسا موقع ملے گا یا نہیں۔ میں اس لڑکے سے ملنا چاہ رہی تھی۔" ثمینہ کے انداز میں بے حد بے تابی تھی۔ ہادی نے کسی قدر حیرانی سے انہیں دیکھا اور بولی۔

"ایڈریس تو نہیں لیا لیکن وہ اسی بلاک میں رہتا ہے۔ میں نے اسے تاکید کی تھی کہ آپ ملنا چاہتی ہیں کسی وقت فرصت نکال کر گھر آئے۔ نہ بھی آیا تو مجھے یقین ہے دوبارہ راہ چلتے ملاقات ہو ہی جائے گی۔ بائے دا وے آپ کیوں اتنا کانشس ہو رہی ہیں اس کے بارے میں؟ میں نے نوٹس کیا ہے جب سے ہسپتال سے واپس آئی ہیں اسی کے بارے میں باتیں کر رہی ہیں۔"

ثمینہ پل بھر کے لیے گڑبڑا گئیں۔

"جان بچائی ہے اس نے میری۔ اتنا بڑا احسان کیا ہے۔ جب تک زندہ رہوں گی اسے یاد رکھوں گی۔ ممکن ہے اس کے بارے میں باتیں بھی کرتی رہوں۔ ویسے بھی بات ہے ہادی! مجھے وہ بچہ اچھا بھی بہت لگا ہے۔ بے حد سیدھا سادا اور معصوم سا انسان۔"

"معصوم؟" ہادی کو جلال کا چہرہ یاد آیا بلکہ چہرے سے زیادہ اس کے گھبرائے ہوئے انداز یاد آئے۔

"معصوم تو نہ کہیں ممی! بے وقوف کہیں۔ شکل سے تو بالکل بونگا سا لگتا ہے۔" وہ ہنسی۔

"کیا بونگا پن دیکھ لیا جلال میں؟ اتنا اچھا لڑکا ہے۔" ثمینہ نے تیز لہجے میں کہا انہیں جلال الدین کی برائی اچھی نہیں لگی تھی۔ "تمہاری جنریشن کا مسئلہ ہے جہاں معصومیت نظر آئی بونگے پن کا لیبل لگا دو گے۔"

"یونہی نہیں لگاتے سوچ سمجھ کر لگاتے ہیں۔" ہادی نے قطعیت سے کہا تھا۔ "مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اچھا لڑکا ہے لیکن معصومیت کا آج کل دور نہیں ہے۔ یہ زمانہ تو لڑکیاں اتنی کانفیڈنٹ ہو گئی ہیں ایسے معاملات پر گھبرا جانے والے لڑکے کیا ترقی کر سکتے ہیں۔ آپ دیکھیں۔ میری باتیں سن کر وہ کیسے گھبرا رہا تھا۔"

"اور تم نے کوئی الٹی بات کی ہو گی۔ تمہاری زبان سے تو پہلے ہی تنگ ہوں کہ اس بے چارے کو کیا کہہ آئی ہو؟"

"ارے میں نے کچھ نہیں کہا اس بھولے بادشاہ کو۔" وہ چڑ کر بولی۔ "صرف شکریہ ادا کیا تھا گھر آنے کی دعوت دی تھی اور آپ کی باتوں کی روشنی میں تھوڑی سی تعریف کی تھی اور۔ اور ہاں میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ وہ مجھے اچھا لگا ہے۔ اب آپ مجھے بتائیں اس میں ایسی کون سی بات تھی کہ وہ شرما کر بھاگ جاتا۔"

"تمہیں عقل نہیں آسکتی ہادی! ابھی نہیں آسکتی۔"

اس کا کارنامہ سن کر ثمینہ نے اپنا سر ہی پیٹ لیا تھا۔

"گھر کی مرغی دال برابر اسی کو کہتے ہیں شاید۔ میرے سارے ٹیچرز اور کلاس فیلو میری ذہانت کی تعریف کرتے ہیں لیکن آپ کو ہمیشہ یہی لگتا ہے مجھے عقل نہیں آسکتی۔" وہ خفا ہو کر بولی۔

"کیونکہ عقل اور ذہانت میں فرق ہوتا ہے۔ میری ذہین و فطین بیٹی!" ثمینہ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا لیکن ہادی نے خفگی کے اظہار کے طور پر رخ ہی موڑ لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میرے پاس ایک زبردست خبر ہے۔"

نمرہ اور تنوی اگزیمنیشن ہال سے ابھی باہر نکلی ہی تھیں کہ منتظر کھڑی عبیرہ تیزی سے ان کی طرف لپکی۔

آج انگلش کا پیپر تھا اور عبیرہ ان دونوں سے پہلے پرچہ مکمل کر کے نکل آئی تھی۔

"میرے پاس بھی ایک خبر ہے اور وہ یہ کہ میں اس پیپر میں فیل ہونے والی ہوں۔" نمرہ بسوری۔ "اتنا خراب ہوا ہے میرا کہ ابھی پاس ہونے کی امید نہیں ہے۔ میں میڈم نصرت کو بھی معاف نہیں کروں گی جو جو چیزیں میں نے چوائس میں چھوڑی تھیں وہ سب انہوں نے کوئسچن پیپر میں ڈال دیں۔" اس نے صدمے سے چور لہجے میں کہا تھا۔

"میرا پیپر تو اچھا ہوا۔ اتنا ٹف تو نہیں تھا۔" تنوی نے کہا۔ "کیوں عبیرہ!"

"ہاں واقعی۔ میرا بھی اچھا ہوا۔" پھر اس نے نمرہ سے کہا۔

"اگر تم اوٹ پٹانگ لوگوں سے دوستیاں ترک کر کے پڑھائی پہ توجہ دو تو فیل ہونے کا خدشہ ہی نہ رہے۔"

"ایں۔ تم خود کو اور تنوی کو اوٹ پٹانگ لوگوں میں شمار کر رہی ہو؟" نمرہ نے معصومیت سے پوچھا۔

"جی نہیں۔ میں عروش مرزا کی بات کر رہی ہوں۔ صرف اور صرف عروش کی۔ سمجھی؟" عبیرہ نے جل کر کہا۔

"اب عروش کہاں سے آگئی درمیان میں؟" نمرہ نے اس سے زیادہ سلگ کر کہا تھا۔

"کیونکہ میرے پاس جو خبر ہے وہ عروش سے متعلق ہی ہے۔" عبیرہ نے طنزیہ کہا۔

نمرہ اور تنوی نے بے ساختہ ایک دوسرے کو دیکھا۔

"کیا ہوا ہے عروش کو؟" نمرہ نے پوچھا۔

"اسے کچھ نہیں ہوا۔ دلچسپ بات یہ کہ اس بار اس نے کچھ کیا بھی نہیں۔ کارنامہ تو محترم سروش صاحب نے انجام دیا ہے۔"

دونوں کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"سروش؟ کون سروش؟"

"اب مت کہنا کہ تم جانتی ہی نہیں کہ سروش کون ہے۔"

عبیرہ نے [illegible] انداز لیا تھا۔

"نہیں یاد ہے تنوی! مجھے لگا تھا سروش عروش کا کزن ہے۔ میرا شک درست تھا۔ سروش وہی لڑکا ہے جو عروش کا کزن ہے اور اکثر کالج کے باہر کھڑا ہوتا ہے اور کالج کی بہت سی لڑکیاں اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ ان سے محبت کرتا ہے اور ان ہی کے لیے کالج کے باہر کھڑا رہتا ہے۔ بہرحال گیٹ کیپر نے کئی دن سے اس پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ پرسوں اس نے کسی اسٹوڈنٹ پر سلنگ کی تو گیٹ کیپر نے پکڑ کر پٹائی کر دی۔ اس پر سروش نے جیب سے چاقو نکال کر گیٹ کیپر کو زخمی کر دیا۔ کالج کے تینوں گارڈز بھی وہیں موجود تھے انہوں نے سروش کو پکڑ کر کلیریکل آفس میں بند کر دیا اور ہیڈ کلرک نے پولیس بلوالی۔ اس دوران سروش دروازہ توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے عروش کا نام لینے لگا۔ جب پولیس آئی تو سروش نے بیان دیا کہ گیٹ کیپر اس پر الزام لگا رہا ہے کیونکہ چند روز پہلے اس کی گاڑی سے اس گیٹ کیپر کو ٹکر لگ گئی تھی۔ اور وہ اسی کا بدلہ لے رہا ہے۔ جبکہ وہ تو ہر روز اپنی خالہ زاد بہن عروش کو پک اینڈ ڈراپ کرنے آتا ہے جو تھرڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہے۔ انسپکٹر نے کہا کہ عروش کو بلوائیں جب عروش وہاں پہنچی تو اس سے عروش کے بیان کی تصدیق مانگی گئی۔ تصدیق کی ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ عروش نے جاتے ہی سروش کو پہچان لیا تھا تب انسپکٹر نے عروش کو بتایا کہ سروش کی جیب سے ہیروئن برآمد ہوئی ہے اور انہیں شک ہے وہ کالج کے باہر ہیروئن کی خرید و فروخت کا کام کرتا ہے۔ سروش کو تو ظاہر ہے پولیس پکڑ کر لے گئی۔ باقی بچی عروش تو اسے پرنسپل نے وارننگ دی ہے کہ اگر دوبارہ اس کا کزن نظر آیا تو اسے عروش کی غلطی شمار کیا جائے گا۔"

"تو ... اس میں عروش کی کیا غلطی ہے؟" نمو نے جلدی سے کہا۔
"تمہیں آج تک عروش کی غلطی نظر آئی ہے؟" عبیر نے سلگ کر کہا۔
"مجھے ایک بات تو بتاؤ عبیر! جو خبر کسی کو نہیں پتا ہوتی وہ تم کو کیسے پتا چل جاتی ہے؟" نمو نے بے حد طنزیہ انداز میں پوچھا۔
"مطلب؟" عبیر نے چونک کر اسے دیکھا۔
"مطلب یہ کہ عروش کے کزن کے متعلق تم جو فرضی قصہ سنا رہی ہو اس کے بارے میں کسی اور کو تو نہیں پتا۔ کیا وجہ ہے کہ پورے کالج میں صرف تم کو ہی خبر ہو سکی؟" اس کا انداز ابھی بھی سابقہ تھا۔
"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا نمو! میں کیوں فرضی قصہ سناؤں گی۔" عبیر نے جھنجلا کر کہا تھا۔ "تمہیں پتا ہے میرے ابو کے کزن اس انسٹی ٹیوٹ کے ایگزیکٹو میں سے ہیں۔ سروش کا قصہ میں نے ان ہی سے سنا ہے اور چونکہ ایسی باتیں کسی بھی ادارے کی ساکھ کو متاثر کر سکتی ہیں اسی لیے اسٹاف کے چند لوگوں کے درمیان سے یہ بات باہر نہیں نکلی۔ انکل نے مجھے بھی تاکید کی تھی کہ کسی سے ذکر نہ کروں لیکن چونکہ مجھے تمہاری فکر رہتی ہے اسی لیے تمہیں ساری بات بتا دی۔ سوچا ممکن ہے اسی طرح تمہارے سر سے اس کی دوستی و ہمدردی کا بھوت اتر جائے۔" عبیر ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔
نمو لال چہرہ لیے اسے گھورتی رہی۔ پھر تنوی سے بولی۔
"عروش پرنسپل کی ڈانٹ سن کر ہرٹ ہوئی ہوگی۔ ہمیں تسلی دینے اس کے پاس جانا چاہیے۔"
"ڈانٹ ہی پڑی ہے قضائے الٰہی سے وفات نہیں پا گئیں عروش صاحبہ کہ تم تعزیت کرنے پہنچ جاؤ۔"
"عبیر!" تنوی نے معاملہ سلجھانا چاہا کہ دونوں ہی بے حد غصے میں آگئی تھیں۔
"تم چل رہی ہو تنوی؟" نمو نے عبیر کو نظر انداز کر کے پوچھا۔
تنوی مصیبت میں پڑ گئی۔ نمو کے ساتھ جاتی تو عبیر کو اعتراض ہوتا اور عبیر کی بات مانتی تو نمو نے خفا ہو جانا تھا۔
"ٹھیک ہے تمہاری مرضی۔" نمو نے تذبذب میں دیکھ کر سرد مہری سے کہا اور کلاس کی سمت بڑھی۔
"تم نے تو کہا تھا تم نے عروش سے دوستی ختم کر دی ہے؟" عبیر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ نمو نے گردن موڑ کر غضب ناک نظروں سے اسے دیکھا اور تیز تیز قدم اٹھاتی چلی گئی۔
"کیا ضرورت تھی تمہیں فضول کا قصہ سنانے کی؟" نمو کے جاتے ہی تنوی نے خفگی و جھنجلاہٹ کے ساتھ کہا۔ "تمہیں پتا نہیں ہے وہ عروش کے متعلق کچھ نہیں سنتی۔"
"تو پھر جھوٹ کیوں بولتی ہے کہ عروش سے دوستی ختم کر چکی ہے۔" عبیر تنک کر بولی تھی۔
"مجھے پتا تھا۔ اس نے جھوٹ بولا ہے کہ عروش سے دوستی ختم کر چکی ہے۔ جبھی میں نے سروش کے متعلق ساری بات بتائی کہ شاید اب وہ عبرت پکڑے اور عروش جیسی لڑکی سے منہ موڑ لے مگر نہیں۔ وہ نمو صاحبہ ہی کیا جن کی عقل میں کوئی بات سما جائے۔"
"نمو کو اتنا تو سمجھا چکے اب اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔" تنوی نے بیزاری سے کہا تھا۔ "ویسے بھی عبیر! کوئی غلط کام کرتے ہوئے سروش پکڑا گیا ہے۔ عروش تو نہیں۔"
"یا اللہ کس قدر احمق سہیلیاں ملی ہیں مجھے۔ تم لوگ ہیڈ لائن سن کر تفصیلات کیوں نہیں سمجھ لیتیں؟ سروش جس کا اصل نام کچھ اور ہے۔ کالج کے باہر کھڑا رہ کر جو کام کرتا تھا وہی کام عروش کالج کے اندر انجام دیتی ہے یعنی ایم اور ہیروئن کی سپلائی کا کام۔ اب آیا عقل شریف میں کچھ؟"

عبیر نے اطمینان سے اس کے سر پہ بم پھاڑ دیا تھا۔ تنوی پہلے ہی ہونق تھی اس انکشاف پر بالکل ہی ہکا بکا رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"یار اکمل! ابھی تو دروازہ جلدی بھی کھول دیا کرو۔" جلال جھنجلایا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے کمرے میں ٹی وی فل والیوم میں چل رہا تھا۔ دروازہ نیم وا ہونے کی وجہ سے آواز دروازے تک سنائی دے رہی تھی۔
"بھائی جان! میں چائے بنا رہا تھا۔" اکمل نے جلدی سے اپنی صفائی پیش کرنا چاہی۔ لیکن "بھائی جان" کا موڈ خراب تھا اسی پر الٹ پڑے۔
"کس کتاب میں لکھا ہے چائے بناتے ہوئے دروازہ نہیں کھولنا چاہیے؟ اور جھوٹ ذرا کم بولا کرو۔ اتنی اونچی آواز میں ٹی وی سنو گے تو ڈور بیل خاک سنائی دے گی۔" وہ دروازہ مکمل کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔
"آئیے۔ آئیے جناب جلال الدین صاحب! آپ کے انتظار میں تو ہم کب سے دیدہ و دل فرش راہ کیے بیٹھے ہیں۔" اسے دیکھتے ہی صوفے پر نیم دراز واثق نے نعرہ بلند کیا تھا۔ جلال ایک پل کے لیے چونکا صرف واثق ہی نہیں سعدی، جنید اور ارسل بھی موجود تھے۔ کھڑکی کی سلائیڈ ہٹی ہوئی تھی اور ٹیبل فین اسٹینڈ پر لگی تھی۔ بیڈ پر ڈرائے فروٹ کی پلیٹ رکھی تھی جس میں ڈرائے فروٹس کی چھلکیاں ہی باقی رہ گئی تھیں۔
"تم لوگ کب آئے؟" اس نے ٹی وی کا والیوم کم کرتے ہوئے پوچھا۔
"ہمیں اسی وقت جب تم ٹرک پہ کھڑے میرے حق پر ڈاکہ ڈال رہے تھے۔" سعدی نے جل کر کہا۔
"کیا؟" جلال نے اچنبھے سے کہا۔ "میں تمہارے حق پر ڈاکہ کیوں ڈالوں گا؟ خدا کا واسطہ ہے"
"میرے پیارے! کبھی اللہ والے کی نظر ہی نہیں پڑی۔" سعدی نے سابقہ انداز میں کہا۔
"اللہ! اس معصومیت پر تو مر جانے کو دل چاہتا ہے۔"
"میری جان سعدی! اس بار تو دل کی مان ہی لو۔" ارسل نے فوراً مشورہ دے ڈالا جسے سعدی نے بڑی ناپسندیدگی سے ہضم کیا۔
"مجھ سے کوئی بات نہ کرے کیونکہ میرا موڈ سخت خراب ہو چکا ہے۔"
"لیکن کیوں؟" جلال نے پوچھا۔ "تمہارا موڈ کیوں خراب ہے۔ کچھ پتا تو چلے۔"
"جب عشق کی پینگیں بڑھا رہے تھے تب تو میرا خیال نہیں آیا۔" سعدی بری طرح سلگ رہا تھا۔
جلال کو بری طرح جھٹکا لگا تھا۔
"سعدی! تیرا دماغ تو ٹھیک ہے؟"
"سعدی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ جبکہ ہم نے تو آج تک تم سے کچھ نہیں چھپایا جیسے بچے اسکول کے سارے قصے ماؤں کو سناتے ہیں۔ ویسے ہی ہم سب اپنا ہر افیئر تمہارے سامنے ڈسکس کرتے رہے ہیں اور تم ایسے گھنے میسنے ہو کر کانوں کان خبر نہیں ہونے دی۔"
ارسل نے اپنی طرف سے اسے اچھی خاصی شرم دلائی تھی۔ جلال کے سر سے گزر گیا تھا سب کچھ۔
"میری نظروں کے سامنے سے دور ہو جاؤ۔ تم دوست نہیں آستین کا سانپ ہو۔ دوستی کے نام پر دھبہ ہو۔"
سعدی نے غصے سے اوور ایکٹنگ کی حد کر دی۔

"او بھائی! لطیفے سنانا بند کرو۔" جلال نے لجاجت سے کہا تھا۔

"اتنی باتیں سنانے کے بجائے اگر تم لوگ مجھے اصل بات بتا دو تو مہربانی ہوگی۔ یہ پہیلیاں مجھ سے نہیں بوجھی جائیں۔"

"میرا بھوک سے برا حال ہے پہلے کھانے کے لیے کچھ منگوا دو کیونکہ خالی پیٹ تو تم کا اظہار بھی میں ٹھیک سے نہیں کر پاؤں گا۔" سعدی نے خفگی سے کہا۔ جلال نے گہرا سانس بھر کر اکمل کو آواز دی اور کھانا لانے کے لیے کہا۔

"جب تک کھانا نہیں آتا۔ تم مجھے اصل بات بتا دو۔"

"وہ اصل بات تو تم بتاؤ۔" سعدی نے کہا۔ "کون ہے وہ لڑکی جس سے باتیں کر رہے تھے؟ حالانکہ میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اسے پہلے میں نے دیکھا تھا اس لیے وہ تم سب کی بھابھی ہوگی۔ ہونے والی بھابھی سے "چکر" چلاتے تمہیں شرم نہیں آئی۔"

"لاحول ولا۔" جلال بری طرح جھنجلایا۔ "سعدی! ابھی سوچ سمجھ کر بھی بولا کرو۔ استغفراللہ۔ میں کیوں اپنی ہونے والی بھابھی۔ توبہ توبہ۔ تم نے اتنی گھٹیا بات سوچی بھی کیسے۔" اسے غصہ ہی آگیا۔

"بس سوچ لی۔ تمہیں تو پتا ہے میں گھٹیا باتیں سوچنے میں کتنا بڑا چیمپئن ہوں۔" سعدی پر اس کے غصے کا رتی بھر بھی اثر نہیں ہوا تھا۔

"جے ڈی کی دھوکہ دہی نے سعدی کو پاگل کر دیا ہے۔" ارسل نے اعلان کیا۔ سعدی غم و غصے کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ جلال کو ترس سا آگیا۔ نظریں کھڑکی تک گئیں۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے سعدی! میں اس لڑکی سے کوئی ایسی بات نہیں کر رہا تھا۔ جس پر تمہیں اعتراض ہو۔ تمہیں یاد ہے [illegible] ہم نے ایک خاتون کو سڑک سے اٹھا کر ہسپتال پہنچایا تھا۔ یہ لڑکی ان ہی کی بیٹی تھی۔ میرا شکریہ ادا کر رہی تھی کہ [illegible] بس اتنی سی بات تھی جس کا تم نے [illegible] بنا لیا۔"

"شاباش۔ میں ابھی بیٹی کو کھڑکی سے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا ہوں۔ اور تم اس کی اماں تک بھی پہنچ گئے۔ کیا بات ہے۔"

"چلو کوئی تو بزرگوں تک پہنچا۔ جے ڈی! اب سعدی کا رشتہ تم ہی لے کر جانا۔" جنید نے کہا۔

"اور جھڑکیاں کھا کر واپس آجانا کیونکہ سعدی کو اپنی بیٹی کا رشتہ صرف وہ دے گا جس نے بیٹی کی زندگی خراب کرنی ہو۔" واثق نے تمسخر اڑایا۔ آئید میں زبردست قہقہہ بلند ہوا تھا۔

"مجھے پتا ہے میری محبت کا راستہ صاف ہوتا دیکھ کر تم سب جل بھن گئے ہو۔ بس جے ڈی! مجھے ایسے جل ککڑوں کی ضرورت نہیں۔ آج سے صرف تم ہی میرے بہترین دوست ہو اور تب تک میرے بہترین دوست ہی رہو گے جب تک اپنی ہونے والی بھابھی سے میری دوستی نہیں کروا دیتے۔"

پچھلی باتیں بھول کر وہ جلال کے کندھے پر سوار ہو گیا۔ جلال کا دل چاہا سعدی کو ابھی بتا دے کہ وہ اس سلسلے میں اس کی کوئی مدد نہیں کرے گا مگر پھر اس بات کو کسی اور وقت پر ٹال کر واش روم میں گھس گیا۔ باہر سعدی دور بین سے چپکا اونچی اونچی تان لگا رہا تھا۔

"میرے سامنے والی کھڑکی میں۔"

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

مریم عزیز

ساحلِ حسرتِ دل

جعفر صاحب اور نوشابہ نے ملائکہ کی تربیت بے حد ناز و نعم سے کی ہے۔ ہر طرف سے ملنے والی ستائش اور توجہ نے اسے مغرور بنا دیا ہے۔ لیکن وہ بھی جعفر صاحب کی بتائی گئی حد بندیوں سے تجاوز نہیں کرتی۔ یہ چیز ملائکہ کے والدین کو مطمئن رکھتی ہے۔ اسے اپنی خواہش پر "نہ" سننے کی عادت نہیں ہے۔ ملائکہ سے چھوٹا علی ہے۔ لیکن اکلوتا ہونے کے باوجود اسے ملائکہ جیسی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ یونیورسٹی میں اس کی دوستی صرف حنا سے ہے۔ لڑکے اس سے دوستی کے متمنی ہیں، لیکن ملائکہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتی۔ حنا کا پڑوسی فراز' ملائکہ سے اظہارِ عشق کرتا ہے تو وہ اسے اہمیت نہیں دیتی۔ حنا کے اصرار پر وہ فراز کے معاملے پر سنجیدگی سے سوچتی ہے اور اسے مثبت جواب دے دیتی ہے۔ تاہم وہ اسے کہتی ہے کہ وہ فوری طور پر اپنا رشتہ نہ بھیجے۔ وہ چاہتی ہے کہ فراز مستحکم معاشی پوزیشن کے ساتھ ہی جعفر صاحب کے سامنے آئے۔

جعفر صاحب کے چچا زاد فیروز کی پرورش ان کے والدین نے ہی کی۔ نوجوانی میں ہی فیروز لندن چلے گئے اور وہیں کی لڑکی کو مسلمان کرکے شادی کی۔ جس کا شادی کے چند سال بعد انتقال ہو گیا۔ فیروز صاحب نے اپنے بیٹے ابراہیم کی تنہا پرورش کی ہے۔ دوبارہ شادی نہیں کی۔ ابراہیم دیکھنے میں بالکل غیر ملکی لگتا ہے۔ لیکن اس کی سوچ پہ مشرقی ہے۔ ابراہیم کی کلاس فیلو کیتھی اسے چاہتی ہے۔ لیکن ابراہیم اسے محض ایک اچھی "دوست" سمجھتا ہے۔ فیروز صاحب سالوں بعد اپنا کاروبار پاکستان منتقل کرنے کا فیصلہ کرکے سب کو حیران کر دیتے ہیں۔ ان کی آمد پر سب سے زیادہ جعفر صاحب خوش ہیں۔

مکمل ناول

انھیں اپنے بیٹے ابراہیم کے لیے ملائکہ پسند آئی ہے۔ وہ ابراہیم سے عندیہ لیتے ہیں تو وہ سوچنے کا وقت لیتا ہے۔ پہلی ملاقات میں حنا اور ملائکہ اسے فارنر سمجھ کر اردو میں گفتگو کرتی ہیں۔ بعد میں یہ جان کر کہ وہ اردو جانتا ہے ملائکہ کی رائے اس کے بارے میں خراب ہو جاتی ہے۔ ابراہیم فیروز صاحب کو ملائکہ کے لیے مثبت جواب دیتا ہے۔ فیروز صاحب کے دست سوال پر جعفر صاحب بغیر ملائکہ سے پوچھے ہاں کر دیتے ہیں۔ یہ صورت حال ملائکہ کو گنگ کر دیتی ہے۔ وہ فراز کو فوری رشتہ بھیجنے کا کہتی ہے۔ فراز کے گھر میں اس بات پر طوفان کھڑا ہو جاتا ہے۔ فراز کی امی فون پر ملائکہ کو خوب باتیں سناتی ہیں۔ ملائکہ اسے فراز کی کارگزاری سمجھتے ہوئے ابراہیم سے شادی کی ہامی بھر لیتی ہے۔ آناً فاناً نکاح طے پا جاتا ہے۔ نکاح کے بعد ملائکہ کو فراز کے بارے میں اصل حقیقت پتا چلتی ہے۔ فراز نے اپنا گھر چھوڑ دیا ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔ یہ جان کر محض انسانیت کے ناتے ملائکہ اسپتال جاتی ہے تو وہ اسے پرانی محبت کا شاخسانہ سمجھتا ہے۔ وہ ملائکہ سے کہتا ہے کہ وہ نکاح ختم کر دے، تاکہ وہ دونوں ایک ہو جائیں۔ ملائکہ فراز کے ٹرانس میں آجاتی۔ وہ ابراہیم سے طلاق کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس کا مطالبہ ابراہیم کو گم صم کر دیتا ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۲ دوسری اور آخری قسط

"آپ پلیز میری بات کو مائنڈ مت کرنا' یہ میری اپنی رائے ہے۔ آپ کو یہاں بلانے کی وجہ یہ ہے کہ آپ مجھے ڈائیورس (طلاق) دے دیں کیونکہ زبردستی اس رشتے کو نبھانے کا کوئی فائدہ نہیں' نہ آپ خوش رہیں گے اور نہ ہی میں۔"

ابراہیم نے ایک پل مڑ کر گہری نظروں سے اسے دیکھا اور سر اثبات میں ہلا دیا۔

سامنے کا منظر بار بار دھندلا رہا تھا۔ دو دفعہ اس کی کار کا ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا تھا۔ اس نے تھک کر گاڑی سائیڈ پر روک دی تھی۔ اس کی نظریں سامنے دور تک نظر آتی سڑک پر جمی تھیں۔ اسے نہ صرف ارد گرد بلکہ اپنے اندر بھی سناٹا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے ابھی بھی یقین نہیں آ رہا تھا جو اس نے سنا وہ حقیقت تھی۔ وہ اس سے محبت نہیں کرتی تھی' وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ اسٹیرنگ پر اس کی گرفت ایک دم بڑھ گئی تھی۔

اس نے ملائکہ کے روپ میں اپنا جو آئیڈیل بنایا تھا۔ وہ بہت بری طرح ٹوٹا تھا اور اس کی کرچیاں بہت بری طرح چبھ رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

انہوں نے دروازے پر دستک دیے بغیر بڑی آہستگی سے دروازہ کھولا تھا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر ایک ساتھ کئی بٹن آن کیے تھے۔ کمرا ایک دم روشنیوں میں نہا گیا۔ وہ جوتوں سمیت بیڈ پر اوندھا لیٹا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے حیران ہوئے اور اگلے ہی پل وہ تشویش بھرے انداز میں اس کی طرف بڑھے۔ انہوں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کا ماتھا چھوا۔ وہاں حرارت نہیں تھی۔ پھر انہوں نے بڑے پیار سے اس کے بالوں کو سہلایا تھا اور اسی پیار سے اس کا منہ چوما تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور اپنے قریب کسی کو محسوس کر کے اس نے گردن سیدھی کر کے دیکھا۔ اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر فیروز صاحب کو پھر حیرت ہوئی۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ابراہیم؟ آفس سے جلدی آ گئے؟" انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا ہاتھ تھاما۔

"کچھ نہیں بابا! بس سر میں درد ہے۔" اس نے مسکرا کر اپنا دوسرا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"کھانا کھاؤ گے؟ میں چائے بنوا کر بھجواتا ہوں۔" اس کا کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن ان کی خوشنودی کے لیے اس نے سر ہلا دیا۔

"میں دراصل تم سے یہ کہنے آیا تھا کہ شادی میں دو ماہ ہیں' یہاں تو کوئی عورت بھی نہیں جو ان چیزوں کا دھیان رکھے اور پھر کپڑے پہننے تو ملائکہ کو ہی ہیں تو میں سوچ رہا تھا تم ملائکہ کو ساتھ لے جا کر اس کی مرضی سے شاپنگ کر لیتے۔"

وہ اب خاموش نہیں رہ سکتا تھا اس نے ہمت مجتمع کر کے کہہ ہی دیا۔

"بابا! میری اور ملائکہ کی سوچ میں بہت فرق ہے۔ مجھے نہیں لگتا' ہم ایک ساتھ اچھی زندگی گزار سکتے ہیں۔ اس لیے میں نے سوچا ہے' یہ نکاح ختم کر دیا جائے۔"

انہوں نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچا تھا۔ "تم نے ایسا سوچا بھی کیسے ابراہیم! تم جانتے بھی ہو تم کیا کہہ رہے ہو؟" صدمے اور دکھ کے مارے ان کی آواز بیٹھ سی گئی تھی۔

"میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے بابا!" وہ نظریں جھکائے بہت دھیمی آواز میں بولا تھا۔

"تم کون ہوتے ہو یہ فیصلہ کرنے والے۔" وہ ایک دم کھڑے ہوئے تھے۔ "یہ رشتہ میں نے جوڑا تھا اور تم سے پوچھ کر جوڑا تھا۔ کوئی زبردستی کی تھی تمہارے ساتھ؟"

ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا بس سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"میں تو تمہارے اتنی جلدی مان جانے پر حیران تھا۔ مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔ تم کسی میں انوالو ہو۔"

"بابا!" ان کے شک نے اسے ایک بہت بڑے صدمے سے دوچار کیا تھا۔

"کیا تم نہیں جانتے' جعفر بھائی ملائکہ سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ وہ کیا میں بھی اس سے اپنی بیٹی کی طرح پیار کرتا ہوں۔ تمہاری وجہ سے اس پر داغ لگے گا' تم نے سوچا ہے' بے چاری ملائکہ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟" انہوں نے کوئی جواب دیے بغیر انہیں دیکھا کہ میرا ایک زندہ رہ سکے گا؟ کیا میں زندہ رہ سکوں گا؟" ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ ابراہیم کو بے حد تکلیف ہوئی۔ وہ ایک دم اٹھ کر ان کی طرف بڑھا۔ "او ہری رک جاؤ ابراہیم!" انہوں نے انگلی اٹھا کر اسے روکا' وہ باہر جانے کے لیے مڑے۔

"میری بچی کی زندگی برباد ہو جائے گی۔" انہوں نے سر کو جھٹکا دیا جبکہ وہ اپنے پر لگنے والے الزام پر ابھی تک حیران تھا۔ وہ کسی طور پر ان کی ناراضی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے انہیں سچ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

"بابا! میں اپنی مرضی سے نہیں کہہ رہا' ملائکہ نے مجھ سے یہ کہا ہے۔ وہ مجھ سے ڈائیورس لینا چاہتی ہے۔" دروازہ کھولتا ان کا ہاتھ رک گیا تھا۔

انہوں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ "جھوٹ بولتے ہو تم۔"

"بابا!" وہ رونے والا ہو گیا تھا۔ "آپ جانتے ہیں' میں جھوٹ نہیں بولتا۔ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔" اس کی بات انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ بے حد [illegible] نکل گئے۔ جبکہ ابراہیم دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔

پہلی بار ایسا ہوا تھا۔ اس کے باپ نے اسے ڈانٹا تھا۔ اس کا یقین نہیں کیا تھا۔ وہ ہر طرف سے گھاٹے میں جا رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ کچھ اور سوچتا۔ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور حواس باختہ عاصمہ اندر داخل ہوئی۔

"وہ بڑے صاحب کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ وہ گر گئے ہیں۔" اور وہ پاگلوں کی طرح ان کے کمرے کی طرف بھاگا تھا۔ وہ اوندھے منہ قالین پر گرے تھے اس نے دو زانو بیٹھتے ہوئے انہیں سیدھا کیا۔ ان کا رنگ خطرناک حد تک زرد ہو چکا تھا۔ جبکہ چہرے پر پسینے کے قطرے تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں جبکہ وہ سانس بھی بڑی مشکل سے لے رہے تھے۔

"بابا! بابا!" ان کا منہ تھپتھپاتے ہوئے وہ رو پڑا تھا۔

"چھوٹے صاحب! انہیں ہسپتال لے جائیں۔"

اس کے پیچھے کھڑی عاصمہ نے پریشانی سے کہا تو جیسے اسے ہوش آیا۔

"ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔" اس نے فیروز صاحب کو دونوں بازوؤں میں اٹھایا اور باہر کی طرف بھاگا تھا۔

☆ ☆ ☆

کوریڈور میں چل چل کر اس کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں اور آنکھوں سے نکلتے آنسو صاف کر کر کے آنکھیں دکھنے لگی تھیں۔ لیکن اسے اپنے اضطراب اور آنسوؤں دونوں پر کنٹرول نہیں تھا۔ فیروز صاحب کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ بروقت علاج سے جان بچ گئی تھی لیکن ابھی وہ بے ہوش تھے۔ ڈاکٹر نے اسے اکیلا دیکھ کر کسی اپنے کو بلانے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن وہ کتنی دیر خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا اور پھر سنبھل کر سر ہلا دیا۔ اسے ایک دم احساس ہوا تھا اس کی زندگی میں سب کچھ تو اس کا باپ ہی ہے ان کے بغیر اس کی زندگی کیا ہو گی اگر اسے ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ اس کی بات کا یہ ری ایکشن ہو گا تو وہ موت کو گلے لگا لیتا مگر وہ کسی قیمت پر بھی اپنے باپ کو کھونا نہیں چاہتا تھا اور کسی حال میں بھی ملائکہ کو اپنانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت اسے کوئی حل نظر نہیں آ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

صبح کے پانچ بج رہے تھے جب دروازہ بہت زور سے بجایا گیا تھا وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔ دل گھبرا کر تیز دھڑکنے لگا تھا۔ وہ ننگے پاؤں ہی دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھولتے ہی اسے علی کا چہرہ نظر آیا اس سے پہلے کہ وہ غصے سے کچھ کہتی وہ بول پڑا تھا۔

"ابراہیم بھائی کا فون تھا فیروز چاچو کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ وہ ہسپتال میں ہیں۔ ہم ہسپتال جا رہے ہیں تم بھی آ جاؤ۔"

وہ کہہ کر پلٹ گیا تھا جبکہ وہ کتنی دیر تک ہونٹ کاٹتی رہی پھر تیزی سے پلٹی۔ منہ دھو کر جلدی سے کپڑے بدل کر وہ باہر آئی تو سب لاؤنج میں کھڑے یقیناً اسی کا انتظار کر رہے تھے۔ جعفر حسین کو دیکھ کر اسے جھٹکا لگا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار اپنے باپ کو روتے دیکھا تھا اور وہیں کھڑے کھڑے اسے ادراک ہوا تھا کہ فیروز صاحب کی اس کے باپ کی زندگی میں کیا اہمیت ہے۔ ان کے باہر نکلتے ہی وہ سر جھکائے ان کے پیچھے چل پڑی تھی۔ ریسپشن سے پتا چلا کہ فیروز صاحب کو ICU سے پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا ہے۔ وہ چاروں ان کے کمرے کی طرف بڑھے تھے۔

کوریڈور میں داخل ہوتے ہی اس نے ابراہیم کو دیکھ لیا تھا۔ جو دونوں کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے دونوں ہاتھوں کو مٹھیوں کی صورت میں بھینچے ان کو ہونٹوں سے لگائے گہری سوچ میں گم تھا۔ ان چاروں کے اس کے قریب پہنچنے پر بھی اس کی توجہ میں کوئی ارتکاز نہیں آیا تھا۔ جعفر حسین نے اس کے کندھے پر ہاتھ سے دباؤ ڈالا تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ انہیں دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا تھا۔ جعفر صاحب اسے گلے لگا کر رو پڑے تھے۔

"یہ سب کیسے ہو گیا۔ میری رات کو اس سے بات ہوئی تھی تب تو بالکل ٹھیک تھا۔ اچانک کیا ہوا؟"

اس کی نظریں بے ساختہ ان کے پیچھے کھڑی ملائکہ سے جا ٹکرائیں۔ وہ بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں میں ایسا کچھ تھا کہ ملائکہ نے بے ساختہ نظریں چرا لی تھیں۔

"میں خود نہیں جانتا انکل!" جب وہ بولا تو اس کی آواز کافی بھاری تھی۔

"ہم مل سکتے ہیں؟" اس سے پوچھ رہے تھے۔

"بابا سو رہے ہیں لیکن آپ دیکھ لیں۔" جعفر صاحب کے ساتھ ملائکہ اور علی بھی اندر داخل ہو گئے تھے۔ نوشابہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی تھی۔ وہ اندر کی طرف بڑھیں تو جھجکتے ہوئے وہ بھی اندر داخل ہوا۔ فیروز صاحب جاگ رہے تھے پتا نہیں جعفر صاحب سے کیا بات ہوئی تھی کہ وہ رو رہے تھے۔ جعفر حسین سے بات کرتے ہوئے ان کی نظر دروازے میں کھڑے ابراہیم پر پڑی اور اس پر ٹھہر گئی تھی۔ ان کی نظروں کے تعاقب میں جعفر حسین نے بھی دیکھا تھا۔

"آؤ ابراہیم! یہاں آؤ۔" جعفر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلایا تو فیروز صاحب کو دیکھتے ہوئے ان کی طرف بڑھنے لگا۔

"یہ اپنے اردگرد جو لوگ دیکھ رہے ہو یہ سب تم سے بہت پیار کرتے ہیں اور یہ تمہارا ابنارلٹ سے ایک ٹانگ پر کھڑا ہے۔ دیکھو ذرا غور سے اس کی شکل ایک رات میں کیا حال ہو گیا ہے اس کا۔" انہوں نے ابراہیم کو بازو سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھا دیا۔

"اتنی محبتوں کے ہوتے ہوئے تمہیں بیمار ہونے کی سوجھی کیسے؟" وہ انہیں ڈانٹ رہے تھے جبکہ وہ اپنی دکھتی آنکھوں سے بھی سر جھکائے ابراہیم اور بھی سر جھکائے کھڑی ملائکہ کو دیکھ رہے تھے۔

"میں آپ سے کچھ مانگوں بھائی جی؟" فیروز صاحب بڑی دھیمی آواز میں بولے۔

"وہ حکم کرو فیروز!" جعفر حسین نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔

"آپ ملائکہ کی رخصتی کر دیں۔ مجھے نہیں پتا میری کتنی زندگی باقی ہے۔ میں اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے بچوں کو آباد دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں گھر میں ملائکہ کو چلتے پھرتے مسکراتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں ابراہیم کے بچوں کو اپنی گود میں کھلانا چاہتا ہوں۔" وہ ساتھ رو رہے تھے۔

جعفر حسین کے ساتھ ساتھ نوشابہ اور علی کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے جبکہ ابراہیم نے اپنی آنکھوں کو سختی سے بھینچ کر اپنے آنسوؤں کو باہر آنے سے روکا تھا۔

"فیروز! تم ان شاء اللہ سب دیکھو گے ایسی ناامیدی کی باتیں کیوں کر رہے ہو۔"

"نہیں۔ آپ ابھی فیصلہ کریں۔" وہ ضدی انداز میں بولے۔

"فیصلہ کیا جو تم کہو گے وہی ہو گا۔" ان کی نظریں ملائکہ کی طرف اٹھیں جو رو رہی تھی۔

"ملائکہ! تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو فیروز! ملائکہ کیوں اعتراض کرے گی۔ تمہاری ہی بیٹی ہے۔ نکاح تو ہو چکا ہے۔ بات رخصتی کی ہے تو تم چاہو تو ابھی ملائکہ کو ساتھ لے جاؤ۔"

اپنے باپ کی اس جذباتی محبت پر ملائکہ نے تڑپ کر باپ کو دیکھا تھا۔

"میں ملائکہ کے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔" وہ غور سے اسے دیکھ رہے تھے جو بالکل خاموش تھی۔

"ملائکہ!" جعفر حسین نے اسے پکارا تو بڑی دقت سے اس نے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"ابراہیم!" انہوں نے اب اسے پکارا تھا۔ "تمہیں کچھ کہنا ہے؟" اس کے پاس کہنے کو اب بچا ہی کیا تھا۔ پہلے ہی وہ کہہ کر بہت پچھتا رہا تھا جس کو کہنا تھا وہ ہی ہتھیار ڈال چکی تھی اس نے بھی سر نفی میں ہلا دیا۔

☆ ☆ ☆

تین دن بعد فیروز صاحب ہسپتال سے گھر آ گئے تھے اور شادی دو ہفتے بعد طے پائی تھی۔ شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ کارڈ بٹ چکے تھے۔ فیروز صاحب نے اس دن کے بعد اس موضوع پر دوبارہ اس سے بات نہیں کی تھی۔ وہ اسی میں خوش تھے کہ شادی ہو رہی تھی اور ملائکہ کی طرف سے بھی بالکل خاموشی تھی اور یہی بات اس کے لیے حیران کن تھی۔ فیروز صاحب آج کل زیادہ وقت جعفر صاحب کی طرف گزار رہے تھے۔ آج بھی وہ وہاں گئے ہوئے تھے اور اتوار ہونے کی وجہ سے وہ گھر پر تھا۔ پہلے تو وہ ٹی وی دیکھتا رہا پھر اکتا کر باہر لان میں آ گیا۔

وہ پائپ ہاتھ میں لیے پودوں کو پانی دے رہا تھا۔

جب گیٹ کھلا اور اندر داخل ہونے والی ہستی کو دیکھ کر وہ حیران ہونے سے زیادہ پریشان ہوا تھا۔

شادی میں صرف چار دن تھے اور یہ اس وقت یہاں تھی اور اس کا یہاں ہونا ضرور کسی گڑبڑ کا اشارہ تھا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی اس کے بالکل سامنے آ کر کھڑی ہو

گئی۔

"بابا گھر پر نہیں ہیں۔" اس نے کہہ کر نظریں پھر کیاریوں پر ٹکا دیں۔

"چاچو ہماری طرف ہیں۔ میں آپ سے بات کرنے آئی ہوں۔"

اس نے نہ کچھ پوچھا تھا اور نہ اس کی طرف دیکھا تھا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا۔ مجھے آپ سے شادی نہیں کرنی پھر بھی آپ نے منع نہیں کیا۔"

"آپ کو کیا لگتا ہے مجھے بہت شوق ہے آپ سے شادی کرنے کا۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ اہانت کے احساس نے ایک پل میں اس کے چہرے کا رنگ بدل دیا تھا۔ اس کے چہرے کے بدلتے رنگ کو دیکھ کر ابراہیم نے نظروں کا زاویہ بدل لیا۔

"میں نے بابا سے مکمل تو نہیں مختصر بات کی تھی۔ لیکن اتنی سی بات کا ردعمل آپ دیکھ چکی ہیں۔ مجھے اپنے بابا کی جان سے زیادہ کوئی چیز مجھے عزیز نہیں اور دوسری بات آپ آخر میرے کندھوں پہ بندوق رکھ کر کیوں چلانا چاہتی ہیں۔ یہ سوال آپ سے بھی پوچھا گیا تھا۔ آپ منع کر سکتی تھیں۔"

ملائکہ کتنی دیر دانت پر دانت جمائے اسے دیکھتی رہی۔ اسے پہلے ہی یہ شخص اچھا نہیں لگتا تھا۔ آج اور بھی برا لگنے لگا تھا۔

"میں نے آپ سے کوئی مشورہ نہیں مانگا۔ مجھے بس ڈائیورس چاہیے دیٹس اٹ۔"

"سوری آئی کانٹ ڈو دس۔" وہ بے نیازی سے بولا تو وہ تلملا اٹھی تھی۔

"You will pay for it" (تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔)

"Ok let's see" (ٹھیک ہے دیکھتے ہیں۔)

اس کی دھمکی پر وہ مسکرا کر بولا۔ وہ غصیلی نظر ڈال کر واپس مڑ گئی جبکہ اپنی بات کہنے کے بعد وہ پہلے کی نسبت مطمئن تھا۔

ڈھول پر پڑنے والی ہر تھاپ اس کے سر پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔ ایک طرف اپنی بے بسی اور بے عزتی کا احساس اور دوسری طرف فراز کا رونا تھا۔

"اگر تمہیں یہی سب کچھ کرنا تھا تو مجھے امید دلانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"تمہارا مطلب کیا ہے فراز! میں یہ سب کچھ اپنی مرضی سے کر رہی ہوں۔ اپنی غلطی مجھ پر مت ڈالو۔ اس وقت تم ہمت کر لیتے تو آج حالات بالکل مختلف ہوتے۔ نہ مجھے ناپسندیدہ انسان سے شادی کرنی پڑتی اور نہ تم یہاں رو رہے ہوتے۔"

سرخ جوڑے میں اس کا گورا رنگ دمک رہا تھا۔ فراز نے بمشکل اپنی نظریں اس کے چہرے سے ہٹائی تھیں۔

"ملائکہ پلیز! کچھ کرو۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔" اس کی التجا پر ملائکہ کے تاثرات خود بخود نرم پڑ گئے تھے۔ وہ کچھ کہنے کے بجائے اپنے ہاتھوں میں پہنی چوڑیوں سے الجھنے لگی۔

"تم نے کہا تھا وہ تمہیں ڈائیورس دینے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔" ملائکہ نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔

"میں تو خود حیران ہوں لیکن تم فکر نہ کرو۔ میں اس کے ساتھ ایسا سلوک کروں گی کہ وہ مجھے خود طلاق دینے پر مجبور ہو جائے گا۔" اس کے چہرے سے اس کا عزم صاف نظر آ رہا تھا۔ لیکن فراز کے اضطراب میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"ملائکہ! کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے تم سے محبت ہو۔"

اس کی نظروں میں ایک دم ابراہیم کی طنزیہ نظریں اور بے زار انداز آیا تھا اس کا سر بے ساختہ نفی میں ہلا تھا۔

"جو کچھ میں کہہ چکی ہوں اس کے بعد محبت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"اگر محبت نہیں تو پھر کیا وجہ ہے جو وہ تمہیں طلاق نہیں دے رہا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بدلہ لینے کے لیے تمہیں ڈائیورس نہ دے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں سب ٹھیک کر لوں گی بس تم حوصلہ رکھو اور بار بار اموشنل ہو کر مجھے بھی پریشان نہ کرو۔"

کھٹکے پر ان دونوں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا جہاں حنا کھڑی تھی۔

"نیچے رسم شروع ہونے والی ہے۔ ابراہیم بھائی آ گئے ہیں۔"

☼ ☼ ☼

آج کا دن کسی بھی انسان کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کو بھی اس دن کا بڑی بے چینی سے انتظار تھا لیکن آج جب وہ دن آ گیا تھا تو جیسے دل خوب صورت جذبات سے عاری تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہمیشہ سے زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی لیکن آج وہ والی کیفیت نہیں تھی جو نکاح والے دن تھی کیونکہ آج وہ اس کے دل کی کیفیت جانتا تھا۔ اس کی نظر غیر ارادی طور پر اپنے [illegible] فیروز صاحب پر پڑی جو [illegible] ان کا چہرہ [illegible] رہے تھے۔

اس کے ہونٹ میکانکی انداز میں مسکرائے تھے اور آخر تک وہ "سب ٹھیک ہے" والی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے بیٹھا رہا۔

رخصتی پر اس کے سوا سب ہی رو رہے تھے جن میں فیروز صاحب بھی شامل تھے۔ ہوٹل سے گھر تک کا فاصلہ اس نے یہی سوچتے ہوئے گزارا تھا کہ آگے کیا ہوگا۔ اسے کیا کرنا ہے۔ ساتھ بیٹھے وجود نے بھی اس کے وجود میں کوئی ہلچل نہیں مچائی تھی۔ گھر میں ان کا استقبال فیروز صاحب نے کیا تھا۔ ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اس نے کلاہ اتار کر صوفے پر رکھی اور صوفے پر بیٹھ کر شیروانی کے تین بٹن کھول کر گہرا سانس لیا۔

"دلہن بھابھی کے لیے کچھ لاؤں؟" عاصمہ نے بڑے اشتیاق سے ملائکہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"بیٹا! کچھ کھانا ہے آپ نے؟" فیروز صاحب کے پوچھنے پر اس نے سر نفی میں ہلایا۔

انہوں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا جہاں تھکن اور اپنوں کو چھوڑنے کا احساس صاف نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے دوسری نظر ابراہیم پر ڈالی جو آنکھیں بند کیے صوفے کی بیک سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

"ابراہیم!" ان کے پکارنے پر اس نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔

"ملائکہ کو کمرے میں لے جاؤ۔ وہ تھک گئی ہو گی۔" اس نے ایک ٹھہری ہوئی نظر ان پر ڈالی اور کھڑا ہو گیا۔

"آؤ بیٹا!" فیروز صاحب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھڑا کیا۔

"صاحب جی! ابراہیم بھائی کو کہیں دلہن بھابھی کو گود میں اٹھا کر لے جائیں۔"

"ماما۔" کے شرارتی انداز پر وہ مرے ملازمین بھی ہنسی کرنے لگے جبکہ فیروز صاحب سر جھکا کر مسکرا رہے تھے۔ لیکن جن دونوں کے لیے یہ مشورہ تھا وہ دونوں بالکل سنجیدہ تھے۔

"ابراہیم! ملائکہ کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے جاؤ۔"

ابراہیم نے اکتائی ہوئی نظر ملائکہ کے سجے ہوئے روپ پر ڈالی اور اگلے ہی پل اس کا مہندی اور انگوٹھیوں سے سجا ہاتھ تھام لیا۔ ایک کرنٹ تھا جو اس کے پورے وجود میں دوڑ گیا تھا۔ اس نے بڑے بے ساختہ انداز میں اپنا ہاتھ کھینچا لیکن اگلی طرف گرفت مضبوط تھی۔ اس نے تھوڑا سا سر اٹھا کر ساتھ چلتے ابراہیم کو دیکھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا گلاب کی دلفریب مہک نے اس کا استقبال کیا۔ اندر قدم رکھتے ہی زمین سے دیواروں تک گلاب کے پھول ہی پھول سجے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

فیروز صاحب ان کے پیچھے ہی آئے تھے۔ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیڈ پر بٹھا دیا تھا۔ انہوں نے منہ دکھائی میں اسے سونے کا سیٹ دیا تھا۔

"بیٹا! آج سے یہ تمہارا گھر ہے تم اس کی مالکن ہو۔ تمہیں اور ابراہیم کو لے کر میں نے بہت خواب دیکھے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے وہ پورے بھی ہوں۔ ابراہیم کی ماں نہیں ورنہ وہ تمہیں بہت سی باتیں سمجھاتی۔ میں تو صرف یہی کہہ سکتا ہوں۔ ہمیں اور اس گھر کو تمہاری ضرورت ہے۔ جس طرح تم جعفر بھائی کو عزیز ہو بالکل اسی طرح مجھے پیاری ہو۔"

وہ خاموشی سے اپنے پازیب کے گھنگھروں پر انگلی پھیر رہی تھی۔

"میں نے پوری کوشش کی تھی کہ تمہارا استقبال تمہارے شایان شان ہو۔ لیکن اگر کوئی کمی لگے تو بتا دو۔" اپنی اتنی پذیرائی اور ان کی محبت پر اس کی آنکھیں بھر گئی تھیں۔

"رونا نہیں ملائکہ! تم روؤ گی تو مجھے بہت تکلیف ہو گی۔" انہوں نے اس کا سر سینے سے لگا لیا۔

"ابراہیم یار! تمہاری بیوی رو رہی ہے اور تم وہاں کھڑے ہو۔ چپ کرواؤ اسے' یہ اب تمہاری ذمہ داری ہے۔" انہوں نے شرارتی انداز میں ابراہیم سے کہا تو ملائکہ نے جلدی سے آنسو صاف کیے تھے۔

"او کے بیٹا! آپ آرام کرو۔" صبح ناشتے پر ملاقات ہو گی۔ وہ اس کا ماتھا چوم کر کھڑے ہو گئے۔

"ابراہیم میری بات سنو۔" دروازے تک پہنچ کر انہوں نے ابراہیم کو آواز دی۔ وہ ان کے پیچھے باہر نکل گیا۔ ان کے باہر نکلتے ہی ملائکہ نے گہرا سانس لے کر سر اٹھایا اور سرسری انداز میں کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے نظریں سامنے جم کر رہ گئیں۔

سامنے دیوار پر اس کی نکاح کی تصویر تھی۔ تصویر اتنی خوب صورت تھی کہ کتنی دیر تک وہ خود کو ہی حیرت سے دیکھتی رہی۔ اس نے گھبرا کر نظریں ہٹالیں اور کھڑی ہو گئی۔ کھڑے ہوتے ہی نظریں سامنے دیوار پر لگے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس پر پڑیں۔

وحشت کے احساس نے اسے ایک پل میں اپنے گھیرے میں لیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے لہنگا تھام کر ڈریسنگ روم میں گھس گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ جب کمرے میں داخل ہوا۔ وہ الماری میں سے کچھ نکال رہے تھے۔ وہ منتظر نظروں سے ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

ڈبہ نکال کر انہوں نے بھرپور نظر اپنے بیٹے پر ڈالی۔ براؤن شیروانی جس پر گولڈن کام تھا میں اس کا وجیہہ سراپا بہت شاندار لگ رہا تھا۔ انہوں نے نظروں ہی نظروں میں اس کی نظر اتاری تھی۔

"میں نہیں جانتا ابراہیم! ایسی کیا بات ہوئی جو تم نے اس دن ملائکہ سے نکاح ختم کرنے کی بات کی تھی۔ حالانکہ پہلے تو تم بہت خوش تھے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں تم جھوٹ نہیں بولتے لیکن میں یہ بھی ماننے کو تیار نہیں ملائکہ ایسا کر سکتی ہے۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا وہ سر جھکائے قالین کے ڈیزائن کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی اتنی طویل خاموشی اس کی ناراضی کا اظہار تھا' اتنے مزاج آشنا تو وہ تھے ہی۔ وہ اس کے قریب آگئے۔

"شادی خوشی کا دوسرا نام ہے اور میں نے ملائکہ سے تمہاری شادی تمہاری خوشی کے لیے کی تھی۔ لیکن تم خوش نہیں لگ رہے۔ میں بہت پریشان ہوں ابراہیم! کیا میں نے کوئی غلط فیصلہ کر دیا۔" وہ اب بھی خاموش تھا۔

"اگر میں نے کچھ غلط فیصلہ کر دیا ہے تو مجھے معاف کر دو۔" انہوں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ اب کی بار اس نے تڑپ کر ان کے ہاتھ تھامے تھے۔

"میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے ابراہیم!" دو آنسو بڑی تیزی سے ان کی آنکھ سے نکلے تھے۔ "اگر ملائکہ کی کوئی بات تمہیں بری لگی ہے تو اسے معاف کر دو۔ میری خاطر اسے پیار سے سمجھاؤ۔ وہ سمجھ جائے گی۔"

"بابا! سب ٹھیک ہے۔ آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟"

"اگر سب ٹھیک ہے تو تم خوش کیوں نہیں؟"

"میں خوش ہوں بابا! صرف آپ کی بیماری کی وجہ سے کچھ ٹینس ہوں۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم اور ملائکہ ایک ساتھ خوش رہو تو میری عمر دس سال اور بڑھ جائے گی۔ تم اب جاؤ اور یہ ملائکہ کو دے دینا۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ڈبہ اسے تھمایا۔

اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"یہ رسم ہوتی ہے منہ دکھائی کی۔"

"آپ پلیز اپنی میڈیسن لے لیں۔"

"میں لے لوں گا تم جاؤ۔"

انہوں نے اس کا شانہ تھپتھپایا تو وہ باہر نکل آیا۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو وہ صاف ستھرا چہرہ لیے گلابی نائٹی میں صوفے پر بیٹھی تھی جبکہ کشن اس کی گود میں تھا۔ اسے قطعاً کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ڈبہ بیڈ پر رکھا اور ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔ دس منٹ بعد جب وہ باہر آیا تو وہ ویسے ہی بیٹھی تھی۔ اس نے ایک نظر اسے دیکھ کر بیڈ سے ڈبہ اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ آپ کے لیے۔" اس کے ہاتھ نہ بڑھانے پر اسے بولنا پڑا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ڈبہ تھام لیا لیکن کھول کر نہیں دیکھا۔ "آپ سونا چاہتی ہیں تو سو جائیں۔"

"آپ کو کیا لگتا ہے میں یہاں سوؤں گی۔" وہ جو اتنی دیر سے سب بھلانے کی کوشش میں تھا اس کا ضبط جواب دے گیا۔

"مجھے بھی کوئی شوق نہیں آپ کے ساتھ سونے کا

"مائنڈ یور لینگویج۔" وہ تلملا کر بولی۔

"میں کب سے تمہاری بد تمیزی برداشت کر رہا ہوں۔" وہ ایک دم آپ سے تم پر آیا تھا اور اس کے منہ سے تم سن کر ایک پل کے لیے وہ چپ کی چپ ہی رہ گئی اور اگلے ہی پل غصے کے مارے کھڑی ہو گئی۔

"میں نے کہا ہے آپ کو میری بد تمیزی برداشت کرنے کے لیے۔ میں نے صاف آپ کو کہا تھا میں آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ میری مجبوری کا فائدہ اٹھایا ہے آپ نے۔"

"تمہیں کیا لگتا ہے' صرف تم ہی مجبور تھیں؟ میں تم سے زیادہ مجبور تھا۔ جب بابا نے تم سے پوچھا تھا تب تم انکار کر دیتیں۔"

"میں انکار کر سکتی تو آپ کو کہتی۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا کشن غصے سے صوفے پر دے مارا۔

اب دونوں اپنی اپنی جگہ غصے میں نظریں پھیرے کھڑے تھے۔ نہ کمرے کا فسوں پھیلاتا ماحول اور نہ ان کے درمیان قائم رشتہ کوئی چیز بھی انہیں متوجہ نہیں کر پا رہی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" اسے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ چونک کر بولا تھا۔

"میں یہاں نہیں سو سکتی۔" اس کا ہاتھ ہینڈل کی

طرف بڑھا تھا جب اس نے ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر اس کا ہاتھ تھام کر رخ اپنی طرف کیا تھا۔
ملائکہ کے لیے یہ حملہ بالکل غیر متوقع تھا۔ اس سارے عرصے میں پہلی بار وہ گھبرائی تھی۔
"تمہیں شاید اپنی عزت پیاری نہیں لیکن مجھے ہے۔ باہر سب نوکر ہیں 'بابا' ہیں۔ کیوں میرا اور اپنا تماشا بنوانے پر تلی ہو۔"
اس کی نیلی آنکھیں غصہ لیے اس پر جمی تھیں۔ وہ ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ چھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔ "اگر آپ کو اپنی عزت اتنی پیاری ہے تو مجھے آزاد کر دیں۔" ابراہیم نے ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھا۔
"ٹھیک ہے۔" جب کچھ دیر بعد وہ بولا تو اس کا لہجہ بہت ٹھنڈا تھا۔ "جس طرح تم اپنے ڈیڈی سے پیار کرتی ہو، اس طرح میں بھی اپنے بابا سے بہت پیار کرتا ہوں۔ ان دونوں کے لیے یہ شادی بہت اہمیت رکھتی ہے اور ان کے لیے کچھ عرصہ تمہیں یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔ ہم دونوں کے درمیان ہزبینڈ وائف والا کوئی ریلیشن نہیں ہوگا۔ لیکن باہر سب کچھ نارمل شو کرنا ہوگا۔ مناسب وقت پر میں خود سب ختم کر دوں گا۔" کہہ کر وہ واپس بیڈ کی طرف مڑا تھا۔
"میں کارپٹ پر نہیں سو سکتا اور نہ صوفے پر میں کمفرٹ فیل کروں گا۔ اس لیے میں بیڈ پر سوؤں گا۔ تمہیں جہاں سونا ہے دیکھ لو۔"
اس نے کمبل اس کی طرف اچھالا جو اس کے قدموں میں گرا تھا۔ "لائٹ آف کر دینا۔" کہہ کر اس نے کمبل سر تک اوڑھ لیا۔ جبکہ وہ قہر آلود نظروں سے اس کی پشت کو گھورتی رہی۔ آخر کار خود ہی تھک کر اس نے کمبل اٹھایا اور صوفے پر لیٹ کر کمبل تان لیا۔ لائٹ اس نے بند نہیں کی تھی۔

☆ ☆ ☆

ولیمہ کے بعد وہ مما ڈیڈی کے ساتھ گھر آگئی۔ رسم کے مطابق ابراہیم کو بھی آنا تھا لیکن اس نے فیوز صاحب کی تنہائی کا بہانہ کر کے معذرت کر لی تھی اور اس نے شکر ادا کیا تھا۔
رات کو وہ چاروں دیر تک جاگتے رہے۔ صبح اٹھتے ہی اس نے حنا اور فراز کو فون کیا تھا۔ وہ لان میں بیٹھی کینو کھا رہی تھی جب حنا گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔
اسے دیکھ کر وہ بے اختیار خوش ہو گئی۔
"بہت پیاری لگ رہی ہو۔" اس کے گلے لگتے ہوئے حنا نے کہا تھا۔
"یہ تو میرج نہیں تھی کہ خوشی کے مارے ایک رات میں ہی میں خوب صورت ہو جاتی۔"
"کیا ابراہیم بھائی نے تمہیں کچھ کہا؟"
"تمہیں کیا لگتا ہے کوئی مجھے کچھ کہہ سکتا ہے۔"
حنا نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔
"واقعی جو تم انہیں کہہ چکی ہو۔ اس کے بعد ان کی تو بولتی ہی بند ہو گئی ہوگی۔" حنا کے طنز کا اس نے بالکل بھی برا نہیں مانا تھا۔
"سچی بات سے سب کی بولتی بند ہو جاتی ہے۔"
اس کا انداز لاپروا تھا۔
"بات سچ یا جھوٹ کی نہیں شرافت کی ہے ملائکہ وہ ایک شریف آدمی ہے۔ تمہاری خوش قسمتی یہ رہی ہے ملائکہ کہ تمہیں ہمیشہ محبت مل جاتی ہے۔ یہ ان کی شرافت ہے یا محبت کہ انہوں نے نہ تمہیں ٹارچ کیا اور نہ کوئی زبردستی ورنہ جو تم کر چکی ہو اس کے بعد کچھ بھی توقع کی جا سکتی تھی۔"
"ہاں۔ شرافت کہہ سکتی ہو لیکن محبت نہیں۔ وہ خود مجھے کہہ چکے ہیں کہ ہم میں ہسبینڈ وائف کے ریلیشن نہیں ہوں گے، صرف دنیا والوں کے لیے دکھاوا ہی کرنا ہے اور کچھ عرصہ بعد وہ خود ختم کر دیں گے۔" حنا کتنی دیر تک حیرت سے اس کا منہ دیکھتی رہی۔
"تم ڈائیورس کو کیا سمجھتی ہو کوئی مذاق؟ منہ کھولا اور ڈائیورس مانگ لی۔ قسمت سے اتنا اچھا انسان ملا ہے۔ ابھی بھی وقت ہے، ابراہیم بھائی سے ایکسکیوز کر دو ان سے کہو میں نے مذاق کیا تھا۔ مجھے یقین ہے وہ تمہیں معاف کر دیں گے۔"

ملائکہ نے نخوت سے ناک سکوڑی۔
"مجھے اس کی معافی تو کیا اس کی ہی ضرورت نہیں اور پلیز نصیحتیں کرنا بند کرو۔"
وہ ابھی کچھ اور کہنے والی تھی کہ علی کو آتا دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ وہ علی سے باتیں کر رہی تھی۔ جب ہی فراز بھی آگیا۔
"تم کہاں ہوتے ہو یار؟ نظر ہی نہیں آتے شادی میں بھی تم صرف مہندی والے دن آئے نہ شادی نہ ولیمہ پر۔ طبیعت تو ٹھیک ہے، کمزور بھی لگ رہے ہو۔" وہ واقعی کمزور لگ رہا تھا۔
"بس یار! ایم بی اے کی تیاری میں مصروف ہوں لاسٹ ٹائم پیپر نہیں دے سکا۔ ساتھ میں جاب بھی کر رہا ہوں۔"
"واہ بڑی محنتیں ہو رہی ہیں۔ لگتا ہے منڈے کا شادی کا موڈ بن رہا ہے۔" علی نے مذاق کرتے ہوئے حنا کو دیکھا۔
"ہاں بات تو یہی ہے۔" اس نے کن انکھیوں سے ملائکہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ جو جوس پیتے ہوئے ان دونوں کو ہی دیکھ رہی تھی۔
"علی! میرے ساتھ چلو مجھے کچھ کام ہے۔" حنا نے اٹھنے کے ساتھ علی کو بھی ہاتھ پکڑ کر کھڑا کیا۔
ان کے جاتے ہی فراز نے اپنا رخ ملائکہ کی طرف کیا۔
"بہت خوش لگ رہی ہو۔" اس کا انداز طنزیہ تھا جسے ملائکہ نے محسوس نہیں کیا۔ "تم نے اس سے ڈائیورس کی بات کی تھی۔"
"ہاں۔"
"پھر اس نے کیا کہا؟" فراز نے بے تابی سے پوچھا۔
"اس نے کیا کہنا تھا۔ اس نے کہا 'وہ دے دے گا مناسب وقت کا انتظار ہے۔'" وہ کندھے اچکا کر بولی۔
فراز جو کتنے دن سے خود ساختہ آگ میں جل رہا تھا بھڑک اٹھا۔
"وہ مناسب وقت کب آئے گا جب میں مر جاؤں گا۔ رخصتی سے پہلے بھی تم نے کہا تھا 'ڈائیورس وہ دے دے گا' لیکن اس نے نہیں دی پھر تم نے کہا تم شادی والے دن لے لو گی۔ لیکن اس نے پھر نہیں دی۔ اب تو شادی کو بھی چار دن گزر گئے ہیں۔ آخر وہ کیوں نہیں تمہیں ڈائیورس دے رہا؟" اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔
"کہیں اس کی نیت تو خراب نہیں ہو گئی۔ اس نے تمہیں ہاتھ تو نہیں لگایا؟" باتوں کے ساتھ اس کے چہرے سے بھی وحشت جھلکنے لگی تھی اور ملائکہ دکھ کے مارے سن ہو گئی تھی۔
"تمہیں شرم آنا چاہیے فراز، مجھ پر ایسا الزام لگاتے ہوئے۔ ابھی کسی کی اتنی جرأت نہیں ہوئی کہ مجھے میری مرضی کے بغیر ہاتھ لگا سکے۔ تم ابھی فیصلہ کرو تم نے کیا کرنا ہے۔ میں کسی قیمت پر کوئی طعنہ برداشت نہیں کر سکتی۔" وہ ابھی غصے میں آگئی تھی۔
فراز کو ایک دم اپنے لفظوں کا احساس ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر گرا لیا۔
"آئی ایم سوری ملائکہ، آئی ایم ویری سوری۔ میں ایسا کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا اور نہ سوچنا چاہتا ہوں لیکن میں کیا کروں۔ تمہاری شادی والے دن سے لے کر آج تک میں ایک عذاب سے گزر رہا ہوں۔ میں رات کو سونے لگتا ہوں تو نیند نہیں آتی۔ بار بار تمہارا چہرہ ذہن میں آتا ہے، ساتھ میں وہ شخص اور پھر یہ خیال کہ تم اس کے ساتھ ہو۔ میں کیا کروں؟" اس نے اب اپنے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑا ہوا تھا۔
"تم اتنی خوب صورت ہو کہ کوئی تمہیں اگنور نہیں کر سکتا۔ وہ تو پھر تمہارا شوہر ہے۔" ملائکہ نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔
"فراز! خود کو ٹارچر کرنا بند کرو۔ ایسا کچھ نہیں جیسا تم سوچ رہے ہو۔ میں نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔ یہی بات اسے مجھ سے دور رکھنے کے لیے کافی ہے اور جہاں تک میاں بیوی کی بات ہے، وہ ہم ایک دوسرے کو مانتے ہی نہیں۔ ڈائیورس دینا اتنا آسان نہیں کیونکہ ڈائیورس سے بہت سے لوگوں کو تکلیف ہوگی جو مجھ سے اور اس

"اسے برے ہیں۔ لیکن تم ٹینشن مت لو میں اس پر دباؤ ڈالوں گی۔"
"میں تمہیں فون کروں؟" وہ اجازت مانگ رہا تھا۔
"نہیں میں خود کرلیا کروں گی۔"
وہ کچھ دیر خاموشی سے بیٹھا رہا پھر کھڑا ہو گیا۔
"بیٹھو تو ممتا چائے لینے گئی ہے۔"
"نہیں۔ چلتا ہوں۔ تم اپنا خیال رکھنا۔"
وہ کہہ کر مڑ گیا۔ ملائکہ کی نگاہوں نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔

☼ ☼ ☼

کار ڈرائیو کرتے ہوئے وہ مکمل طور پر خاموش تھا اور یہ خاموشی پچھلے تین گھنٹے سے تھی جب وہ اور فیروز صاحب اسے لینے آئے تھے۔ وہ جانتی تھی اگر اسے واپس جانے کی خوشی نہیں تھی تو ابراہیم کو بھی اس کو لینے آنے کی کوئی خوشی نہیں۔ گھر پہنچ کر وہ کمرے میں چلا گیا تھا جبکہ وہ فیروز صاحب کے پاس ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گئی۔

رات کو بارہ بجے کے قریب جب وہ کمرے میں آئی تو وہ رائٹنگ ٹیبل پر کچھ پیپرز کے ساتھ لیپ ٹاپ کھولے بیٹھا تھا۔ اس کی موجودگی کو اس نے محسوس تو کیا تھا لیکن اسے دیکھا نہیں۔ وہ بھی اسے نظر انداز کر کے ڈریسنگ روم میں چلی گئی جب وہ واپس آئی تب بھی وہ اسی انہماک سے اپنے کام میں مصروف تھا۔

"آپ نے چاچو سے بات کی؟" وہ اس کے بالکل پیچھے آ کر اچانک بولی تو اس کا تیزی سے چلتا ہاتھ ایک دم رکا تھا۔ اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اس کے اتنے قریب کھڑی تھی کہ اس کے لباس سے اٹھنے والی خوشبو وہ محسوس کر سکتا تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جانے اسے کیا ہوا کہ وہ بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔
"کس بارے میں؟" اسے واقعی دھیان نہیں تھا۔
"ہمارے ڈائیورس کے بارے میں۔"
"اوہ۔" ابراہیم نے گہرا سانس لے کر گردن پھر موڑ لی۔ "ابھی نہیں۔"
"تو کب کریں گے؟" وہ جھنجلا کر بولی۔
"جلد ہی۔"
"جلد ہی کب؟ شادی کو بھی ہفتے سے زیادہ گزر گیا ہے۔"
"آٹھ دن ہی گزرے ہیں آٹھ سال تو نہیں۔"
"میرے لیے آٹھ دن بھی آٹھ سال کے برابر ہیں۔" وہ غصے سے بولی۔
"میں بھی اس عذاب سے جلدی نجات چاہتا ہوں۔"
ملائکہ کے سر پر لگی تلووں پر بجھی۔ "آپ نے مجھے عذاب کہا۔" ابراہیم کے ہونٹوں کو ایک مسکراہٹ نے چھوا تھا۔
"میں کام کر رہا ہوں پلیز مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔"
ملائکہ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔ پہلے آگے بڑھ کر اس نے اس کا لیپ ٹاپ بند کیا اور اس کے سامنے رکھے سارے کاغذ اٹھا کر قالین پر پھینک دیے۔ سب کچھ اتنی اچانک ہوا کہ وہ حیرت سے اس کی یہ حرکت دیکھتا ہی رہ گیا۔
"میں بہت بڑا عذاب ثابت ہوں گی۔" اسے غصے کے ساتھ رونا بھی آ رہا تھا دھمکی دے کر وہ دھم دھم کرتی صوفے تک گئی پھر واپس بیڈ تک آئی۔ کمبل اٹھایا اور صوفے میں گم ہو گئی۔ اس دوران ابراہیم اس کی حرکات دیکھ رہا تھا۔

اس نے جھک کر پیپرز اٹھائے ان کی ترتیب صحیح کر کے ٹیبل پر رکھے کھڑے ہو کر بھرپور انگڑائی لی۔ ایک شرارتی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھری۔ وہ کچھ دیر کمبل کو گھورتا رہا اگلے پل اس نے جھٹکے سے کمبل کھینچا تھا وہ ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی اور گھبرا کر اسے دیکھنے لگی۔
"یہ میرا کمبل ہے تمہارا ڈریسنگ روم میں ہے۔"
وہ کمبل لے کر لیٹ گیا وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اٹھ کر ڈریسنگ روم میں گئی۔ کمبل لا کر صوفے پر رکھا اور اس کے اوپر سے کمبل کھینچ کر قالین پر پھینکا اور خود کمبل تان کر لیٹ گئی۔ اس نے کمبل کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ ساتھ ڈر تھا کہ وہ دوبارہ کمبل نہ کھینچ لے لیکن مسلسل خاموشی تھی۔ اس نے ذرا سا کمبل ہٹا کر دیکھا۔ لائٹ بند ہو چکی تھی اور وہ لیٹ چکا تھا۔ اس نے بھی مطمئن ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ کھٹ پٹ کی آواز پر اس نے مندی مندی آنکھوں سے دیکھا وہ شلوار قمیص میں کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے کمبل چہرے سے نیچے کیا۔
"میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں تم بھی پڑھ لو۔" اسے پہلا جھٹکا اس بات پر لگا کہ وہ نماز پڑھتا ہے اور دوسرا جھٹکا کہ اس سے بھی نماز پڑھنے کو کہا تھا۔ وہ نکل چکا تھا۔ تھوڑی دیر تو وہ حیرت سے سوچتی رہی پھر سر جھٹک کر دوبارہ کمبل اوڑھ لیا۔

جب وہ واپس آیا وہ سو رہی تھی۔ وہ کچھ دیر دیکھتا رہا پھر گہرا سانس لے کر دوبارہ لیٹ گیا۔ رات کے منظر یاد آئے وہ پھر مسکرا دیا تھا۔ اس نے گردن گھما کر صوفے کی طرف دیکھا۔ اس کے بال کمبل سے باہر جھانک رہے تھے۔ [illegible] اس کا دل چاہا وہ جا کر کمبل ہٹا کر [illegible] میں کیسی لگتی ہے اور پھر خود ہی سر جھٹک کر آنکھیں بند کر لیں۔

آنکھ کھلتے ہی اس نے سب سے پہلے گھڑی کی طرف دیکھا۔ دس بج رہے تھے۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا وہ بیڈ پر نہیں تھا بستر صاف اور کمبل تہہ تھا۔ باتھ لے کر وہ لاؤنج میں آئی جہاں مکمل خاموشی تھی۔ کچن سے آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ اسی طرف مڑ گئی۔
"دلہن بھابھی آ گئیں۔" اس پر پہلی نظر عاصمہ کی پڑی تھی اس کے کہنے پر ان دونوں نے ایک ساتھ اس کی طرف دیکھا تھا۔ فیروز صاحب نے حیرت سے ایک نظر ڈال کر نظریں جھکا لیں۔ جبکہ ابراہیم کی پہلی نظر میں حیرت اور بعد میں ناگواری اتر آئی تھی۔
"گڈ مارننگ!" کہہ کر وہ فیروز صاحب کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے کالی جینز پر نیلی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔
"[illegible] آپ؟" فیروز صاحب نے اس سے پوچھا جبکہ نگاہیں مسلسل جھکی ہوئی تھیں۔ وہ اس کی طرف دیکھنے سے احتراز کر رہے تھے۔ ابراہیم نے عاصمہ کی طرف دیکھا جو بار بار چور نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ابراہیم نے ناگواری سے پلیٹ پیچھے کھسکا دی۔
"او کے بابا! چلتا ہوں اللہ حافظ۔"
وہ کسی کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل گیا۔ جبکہ وہ لاپروائی سے ناشتا کرتی رہی۔ سارا دن جلنے کڑھنے کے بعد جب وہ واپس آیا تو گھر میں مکمل خاموشی تھی۔ لاؤنج بھی خالی تھا حالانکہ جب وہ واپس آتا تھا فیروز صاحب لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہے ہوتے تھے۔ وہ کچن کی طرف گیا۔ عاصمہ بھی نہیں تھی وہ حیران ہوتا ہوا کمرے میں گیا۔ وہ بیڈ پر اوندھی لیٹی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اس کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ ابھی بھی صبح والے حلیے میں تھی۔
"بابا کہاں ہیں؟"
"ڈیڈی کی طرف گئے ہیں۔"
"اور عاصمہ؟" کوٹ اتارتے ہوئے اس نے پوچھا۔
"پتا نہیں۔" وہ کہہ کر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ تو صوفے پر بیٹھ کر اس نے بغور اسے دیکھا۔
"جتنے دن تم یہاں ہو اس طرح ڈریس اپ مت ہوا کرو۔" ملائکہ نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔
"میں شروع سے ہی ایسے کپڑے پہنتی ہوں۔"
"میں نے تو پہلے بھی تمہیں ایسے کپڑوں میں نہیں دیکھا۔"
"اسے آپ اتفاق بھی کہہ سکتے ہیں۔" وہ چینل بدلتے ہوئے بولی۔
"جو بھی ہے گھر میں بابا ہیں۔ میل سرونٹ ہیں۔ اچھا نہیں لگتا۔"
"آئی ڈونٹ کیئر۔ اب میں یہ دیکھوں کہ نوکروں کو کیا اچھا لگتا ہے کیا نہیں۔ میں اپنے گھر بھی یہی پہنتی تھی۔ ڈیڈی نے مجھے کبھی منع نہیں کیا اور چاچو نے بھی

مجھے کچھ نہیں کہا پھر آپ کو کیا پرابلم ہے۔ بائی دے وے آپ لندن سے آئے ہیں یا لالو کھیت سے؟" آخر میں اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا۔

"بے شک میں لندن سے آیا ہوں لیکن میری سوچ مختلف ہے۔ میرے خیال میں لباس انسان کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ عورت چھپانے کی چیز ہے دکھانے کی نہیں جبکہ یہ لباس آپ کو نمایاں کرتا ہے۔ گھر میں اگر غیر مرد نہ ہوں تو ٹھیک ہے۔"

ملائکہ آنکھیں پھاڑے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ انگریز ماں کی اولاد تھا۔ لندن میں پلا بڑھا تھا۔ اس کے خیال میں تو اسے بہت عیاش "ماڈرن ٹائپ" ہونا چاہیے تھا لیکن اس کے تو عجیب روپ سامنے آ رہے تھے۔ پہلے نماز اور اب یہ بھی لیکچر۔

"یہ ڈریس چینج کرلو۔"

"سوری۔ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ مجھے جو اچھا لگتا ہے۔ میں وہی کروں گی۔ آپ کو اگر اعتراض ہے تو مجھے گھر سے نکال دیں۔"

ابراہیم نے بے اختیار گہرا سانس لیا اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔ جتنا بے بس وہ خود کو محسوس کر رہا تھا۔ اتنا زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔ تب بھی نہیں جب اس کی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی اس کے لیے سزا بن گئی تھی۔ ملائکہ اس کے لیے حلق میں پھنسی ہوئی ہڈی بن چکی تھی۔ جسے وہ نہ اگل سکتا تھا نہ نگل سکتا تھا۔ ہر وہ چیز جو اس کے لیے ناپسندیدہ تھی وہ اسے کرتی تھی۔ اپنے لیے اس نے جس طرح کی لڑکی کو سوچا تھا۔ ملائکہ کو دیکھ کر وہ خاکہ مکمل ہوا تھا لیکن ملائکہ کو اپنا کر اسے جان کر وہ بہت بری طرح ٹوٹا تھا۔ اس نے مرد ہو کر ساری زندگی بہت صاف گزاری تھی اور جو بیوی ملی تھی۔ اس کے دل میں کوئی اور تھا۔ اس نے کیتھی جیسی پرخلوص لڑکی سے جو صرف اس سے محبت کرتی تھی شادی نہیں کی کیونکہ وہ مسلمان نہیں تھی اور ملائکہ جو مسلمان تھی اس نے اسے کبھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے کیتھی پر ملائکہ کو ترجیح دی تھی۔

شادی کو کافی دن گزر گئے تھے۔ شروع کے کچھ دن وہ گھر رہی پھر صبح اس کے آفس جانے کے بعد گھر سے نکلتی رات کو واپس آتی تھی۔ اس نے اس دن کے بعد اسے کسی چیز سے نہیں روکا تھا۔

اس دن وہ گھر آیا تو حیرت انگیز طور پر ملائکہ گھر پر تھی اور کھانے پر اسی کا انتظار ہو رہا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ملائکہ کمرے میں چلی گئی جبکہ وہ چائے کا کپ لے کر فیروز صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔

"مجھے لگتا ہے۔ تم ابھی بھی مجھ سے ناراض ہو۔" ان کے اداس لہجے پر وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔

"ملائکہ والی بات سے۔" ابراہیم نے گہرا سانس لیا۔

"بیٹا! ملائکہ بری لڑکی نہیں۔ اس میں بچپنا زیادہ ہے۔ کچھ لاڈ پیار نے اسے ضدی بنا دیا ہے۔"

"میں جانتا ہوں بابا! لیکن یہ سب آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔" وہ ملائکہ کے موضوع پر اب کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"کیونکہ میں محسوس کر رہا ہوں۔ تم دونوں ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے رہتے ہو۔ صرف دو ماہ ہوئے ہیں تمہاری شادی کو۔ ایسا لگتا ہے جیسے بیس سال گزار چکے ہو تم دونوں۔ وہ سارا دن جعفر بھائی کی طرف گزار آتی ہے۔ تم سارا دن آفس رہتے ہو۔ پہلے میری وجہ سے جلدی آجاتے تھے۔ اب وہ بہانہ بھی نہیں رہا۔ نئے شادی شدہ جوڑوں میں تو اتنا پیار ہوتا ہے تم دونوں میں وہ بے تکلفی وہ محبت نظر کیوں نہیں آتی؟" ان کے سوال پر وہ سٹپٹا کر رہ گیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں بابا!"

"تو پھر کیسی بات ہے؟" وہ بغور اسے دیکھ رہے تھے۔

"تم دونوں ہنی مون کے لیے کب جا رہے ہو؟" ایک اور دھماکا کیا تھا انہوں نے۔ وہ ہونقوں کی طرح انہیں دیکھنے لگا۔

"بیٹا! میں نے ہنی مون کے لیے کہا ہے۔ تم مجھے ایسے دیکھ رہے ہو جیسے میں نے تمہیں کوئی سزا سنا دی ہو۔"

"یہ سزا سے کم تو نہیں۔" وہ دل میں بولا۔

"بابا! ابھی پلان نہیں کیا۔"

"تو کرو نا! ملائکہ سے پوچھو اسے کہاں جانا ہے۔"

"جی!" وہ صرف یہی بول سکتا تھا۔

"اور اب میں اکیلے رہ رہ کر بور ہو گیا ہوں۔ کچھ میری بھی فکر کرو۔" وہ شرارتی انداز میں اسے دیکھنے لگے۔

"کیا بابا؟" وہ بے دھیانی میں پوچھنے لگا۔

"یار کوئی پوتا پوتی بھی تو آنا چاہیے۔" اسے زبردست اچھو لگا تھا اور فیروز بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔

"ابراہیم! تم نے شرمانے میں لڑکیوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔" اس نے کپ ٹیبل پر رکھ دیا اور کھڑا ہو گیا۔

"بابا! اب سو جائیں۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔" وہ کہہ کر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کل رات سے فیروز صاحب کی طبیعت خراب تھی۔ نزلے کے ساتھ بخار تھا۔ دس بجے کے قریب اس نے گھر فون کیا۔ فون عاصمہ نے اٹھایا تھا۔ فیروز صاحب کی طبیعت کا پوچھ کر اس نے ملائکہ کا پوچھا اور جو اس نے سنا وہ اس کا دماغ گھمانے کے لیے کافی تھا۔ وہ گھر نہیں تھی۔

وہ فون بند کرتے ہی کھڑا ہو گیا۔ سارا رستہ اس کا دماغ کھولتا رہا۔ لاپروائی کی کوئی حد ہوتی ہے۔ گھر پہنچ کر وہ سیدھا فیروز صاحب کے کمرے میں گیا تھا۔ وہ سو رہے تھے۔ وہ کچھ لمحے کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ پھر باہر نکل آیا۔ وہ لاؤنج میں پہنچا جب وہ داخلی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کی طرف بڑھا اور اس کا بازو تھام کر گھسیٹتے ہوئے اسے کمرے میں لایا تھا۔ شاک کے مارے وہ نہ بول سکی اور نہ ہی ہاتھ چھڑا سکی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ وہ اب غصے سے اسے گھور رہا تھا۔

"تم انتہائی بدتمیز، ضدی اور خود پسند لڑکی ہو۔ جسے اپنے علاوہ کسی کی پروا ہی نہیں۔ تم جانتی بھی ہو بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اگر تم ایک دن باہر نہ جاتیں تو کیا قیامت آجاتی۔ میرے بابا ہونے کے علاوہ تمہارے بھی وہ کچھ لگتے ہیں اسی رشتے سے ان کی پروا کر لیتیں۔ جب سے تم سے ملا ہوں سوائے تکلیف کے تم نے مجھے دیا کیا ہے۔ جتنی دیر یہاں ہو تب تک اپنے بوائے فرینڈ سے ملنا بند کرو۔"

وہ اتنی دیر سے خاموشی سے اسے سن رہی تھی، آخری بات اسے تیر کی طرح لگی تھی۔

"اف۔ بہت بول چکے آپ۔ میں چپ ہوں اس کا مطلب یہ نہیں جو آپ کا دل کرے۔ آپ بولتے جائیں۔ پہلی بات تو یہ کہ میں ڈاکٹر کو چھوڑ کر چاچو کی میڈیسن لینے گئی تھی۔ راستے میں ٹائر پنکچر ہو گیا اور دوسری بات یہ اب مجھے یہاں نہیں رہنا۔ میں اپنے ڈیڈی کے پاس جا رہی ہوں۔"

وہ ڈریسنگ روم کی طرف بڑھی تھی۔ ابراہیم جیسے ایک دم ہوش میں آیا۔ جب اندر آیا وہ الماری سے کپڑے نکال رہی تھی۔

"تم کہیں نہیں جاؤ گی۔" اس نے غصے سے سامنے کھڑے ابراہیم کو دیکھا۔ لیکن کپڑے نکالنے نہیں چھوڑے تھے۔ ابراہیم نے آگے بڑھ کر سارے کپڑوں کو اٹھا کر دوبارہ وارڈروب میں پھینکا۔ اس کے قریب رکھا ہینڈ بیگ بھی اندر پھینکا۔ وارڈروب لاک کر کے اس نے چابی اپنے کوٹ میں ڈال لی۔

"اگر کمرے سے بھی باہر قدم رکھا تو بہت برا ہو گا۔" اس کے ساتھ کبھی کسی نے اس طرح کا سلوک نہیں کیا تھا۔ وہ ابھی تک ساکت کھڑی تھی۔ اس کے ساکت وجود میں حرکت دروازہ بند ہونے کی آواز سے ہوئی تھی۔ وہ باہر آیا تو عاصمہ دروازے کے قریب کان لگائے کھڑی تھی۔ اس نے ناگواری سے اسے دیکھا تو وہ گھبرا کر اسے دیکھنے لگی۔

"میں چائے کا پوچھنے آئی تھی۔"

"نہیں چاہیے۔ بابا کے لیے سوپ لے آؤ۔" وہ ان کے کمرے میں آیا تو وہ اٹھ چکے تھے۔ اسے دیکھ کر

مسکرانے لگے۔

"اب کیسی طبیعت ہے بیٹا؟"

"ٹھیک ہوں یار! ذرا سا بخار ہی تو ہے۔ وہ بھی اب اتر گیا ہے۔ تم جلدی کیوں آ گئے اور ملائکہ کہاں ہے۔" ملائکہ ذکر وہ گول کر گیا۔

"پاپا! آپ کو بھوک لگی ہے۔"

"ہاں یار، کچھ کھلا دو۔"

"عاصمہ! سوپ لے آؤ۔" اس نے عاصمہ کو آواز دی، وہ پیچھے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی، فوراً اندر آ گئی۔

"تم جاؤ۔" ٹرے تھام کر اس نے کہا تھا۔ جتنی دیر وہ سوپ پیتے رہے، وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔

"میں اب سوؤں گا تم بھی آرام کرو اور ملائکہ کو تھینکس بولنا، سارا دن اس نے میرا بڑا خیال رکھا۔"

اس نے کچھ چونک کر انہیں دیکھا لیکن وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ چکے تھے۔ وہ لائٹ آف کر کے باہر آ گیا۔ عاصمہ، کوارٹر میں جا چکی تھی۔ لائٹ آف کر کے وہ کمرے میں آیا تو کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ لائٹ آن کرتے ہی نظر بے ساختہ صوفے کی طرف گئی وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ ڈریسنگ روم سے کپڑے بدل کر باہر آیا۔ تب بھی وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ پانچ منٹ تک اس کا انتظار کرتا رہا لیکن تب بھی کوئی آواز نہیں آئی تو وہ اٹھ کر باتھ روم کے دروازے کے پاس آیا۔ اس نے ہلکا سا بجایا، کوئی جواب نہیں، اس نے ہینڈل پر ہاتھ مارا، دروازہ کھل گیا۔ اندر کوئی نہیں تھا۔

اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے کمرے کو گھورتا رہا اور وقت ضائع کیے بغیر وہ باہر کی طرف بھاگا تھا۔ اس کا اندیشہ صحیح ثابت ہوا تھا۔ پورچ میں اس کی کار نہیں تھی، اسے دیکھ کر چوکیدار کھڑا ہو گیا تھا۔

"بی بی کہاں گئیں؟"

"جی پتا نہیں۔"

"کتنی دیر ہو گئی؟"

"پندرہ منٹ۔"

"ٹھیک ہے گیٹ کھولو۔"

اس نے عجلت میں کہہ کر کار کی طرف دوڑ لگائی۔ مین روڈ پر آ کر اس نے جعفر حسین کے گھر کا نمبر ملایا تھا۔ وہاں بیل ہو رہی تھی مگر کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔ وہ ایک دم بہت پریشان ہو گیا۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے علی کا نمبر ملایا۔

"علی! ملائکہ تمہاری طرف ہے؟" چھوٹتے ہی اس نے پوچھا تھا۔

"جی بجو ادھر ہی ہیں۔" علی نے جواب دیا۔ کتنی دیر بعد اس کے تنے ہوئے اعصاب معمول پر آئے تھے۔ اس نے گہرا سانس لیا۔

"خیریت تو ہے؟"

"ہاں۔ میں آ رہا ہوں۔" اس نے موبائل بند کر کے کار کی اسپیڈ بڑھا دی۔

علی کمرے میں آیا تو وہ تکیہ سر پر رکھے لیٹی تھی۔

"بجو!" اس نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اسے پکارا، اس نے تکیہ پیچھے کر کے اسے دیکھا۔

"تم ابراہیم بھائی کو بتائے بغیر آ گئی ہو؟" اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

"تم سے کس نے کہا؟"

"ان کا فون آیا تھا۔"

"اور تم نے بتا دیا میں یہاں ہوں۔"

"تو کیا نہ بتاتا؟" وہ حیرت سے پوچھنے لگا۔

"ہاں کیونکہ مجھے اب وہاں نہیں جانا۔" وہ پریشانی سے اسے دیکھنے لگا۔ "تمہارا اور ابراہیم بھائی کا کوئی جھگڑا ہوا ہے؟"

"ہاں اور کیوں، کیسے، ان سب کے بارے میں مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔ ڈیڈی نے میری شادی کروا کر مجھے گھر سے نکال دیا۔ میں جیوں یا مروں، کسی کو کوئی مطلب نہیں۔ مجھے اس جہنم میں بھیج کر خود سیر سپاٹوں میں مصروف ہو گئے ہیں۔"

تب ہی دروازہ کھلا اور میرا کا چہرہ نظر آیا۔

"ابراہیم بھائی آئے ہیں۔"

"انہیں یہاں بھیج دو۔"

"علی! میں ان سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی اور نہ میں واپس جاؤں گی۔" اس نے انگلی اٹھا کر اسے متنبہ کیا۔ تب ہی دروازہ کھلا تھا۔ اسے دیکھ کر ملائکہ نے غصے سے منہ موڑ لیا۔ جبکہ علی بڑے تپاک سے ابراہیم سے ملا تھا۔

"کیا ہوا ابراہیم بھائی! کوئی جھڑپ ہو گئی کیا؟" ابراہیم نے ایک نظر اسے دیکھا جو مستقل منہ موڑے ہوئے تھی۔

"کچھ نہیں یار! پاپا کی طبیعت خراب تھی میں اپ سیٹ تھا۔ بس غصے میں کچھ ڈانٹ دیا۔ یہ ناراض ہو کر یہاں آ گئیں۔"

"ڈانٹا۔" اس نے غصے سے دہرایا۔ "انہوں نے میری انسلٹ کی ہے۔"

"مگر آپ بجو! اتنی سی بات پر کوئی گھر سے آ جاتا ہے۔"

"شٹ اپ علی! تم میرے معاملے میں مت بولو۔ مجھ سے اب تک کبھی کسی نے ایسے بات نہیں کی۔ میں ڈیڈی کے آنے تک یہیں رہوں گی۔ اب آپ دونوں میرے کمرے سے نکل جائیں۔" علی نے ناگواری سے بہن کو دیکھا۔ ابراہیم کے ساتھ اس طرح کا سلوک اسے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"علی پلیز! اگر تم مائنڈ نہ کرو تو میں ملائکہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔" وہ چیخی، لیکن علی باہر نکل گیا تھا۔ ابراہیم نے ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بغور اسے دیکھا۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تمہیں ڈائیورس دے دوں۔" ملائکہ اسے دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ "وکیل سے پیپرز تیار کروانے میں کچھ دن لگیں گے۔ اتنے دن تمہیں میرے ساتھ رہنا ہوگا، مجبوری ہے۔" وہ کندھے اچکا کر بولا۔

وہ کتنی دیر جانچتی نظروں سے اسے دیکھتی رہی، جبکہ وہ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔

"میں گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

اس کے جاتے ہی وہ فتح مندی کے احساس سے مغلوب ہو کر کھل کر مسکرائی تھی۔

"میرے سامنے اچھے اچھوں کو گھٹنے ٹیکنے پڑتے ہیں، تم کیا چیز ہو ابراہیم فیروز!" وہ بیڈ سے اتر آئی تھی۔

"کاش میں یہ قدم پہلے اٹھا لیتی، وہ ملول کی اذیت سے تو بچ جاتی، خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔"

وہ گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے سوچ رہی تھی، گاڑی کے پاس ابراہیم علی کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ اس کو آتا دیکھ کر ابراہیم خاموش ہو گیا۔ علی نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی، جس کا مطلب تھا وہ ناراض ہے، اس نے بھی پروا نہیں کی، وہ جانتی تھی آنے والے وقت میں اس کے فیصلے سے بہت سے اپنے ناراض ہونے والے ہیں۔

✿ ✿ ✿

اس دن کے بعد ابراہیم جو تھوڑی بہت اس سے بات کر لیتا تھا۔ اس نے وہ بھی چھوڑ دی۔ لیکن اس نے دوبارہ کوئی [illegible] نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ بھی ابراہیم تھا۔ اس نے ابراہیم کو وکیل سے بات کرتے ہوئے سنا تھا اور اسے اندازہ ہو گیا کہ اس نے اس دن جو طلاق دینے کی بات کی تھی، وہ اس پر عمل کر رہا ہے، ویسے بھی اسے اس کے ساتھ رہتے تین ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا اور اسے ناپسند کرنے کے باوجود اسے اس بات کا اقرار تھا کہ وہ بہت شریف انسان ہے، جو کچھ اندیشے اسے ابراہیم کو لے کر تھے، وہ بھی ختم ہو گئے تھے۔

وہ یہ خوش خبری فراز کو سنانا چاہتی تھی، لیکن اس کا موبائل آف تھا۔ اس نے حنا کو فون کیا تھا۔

"تم زندہ ہو۔" اس کی آواز سنتے ہی حنا چیخی تھی۔

"زندہ ہوں تو بول رہی ہوں، میں نے تو تمہارا افسوس کرنے کے لیے فون کیا تھا۔"

"شٹ اپ۔ میں نے کتنی دفعہ فون کیا، تم ہی دستیاب نہیں ہوتیں۔"

سوری یار! فون میں گڑبڑ تھی، تم سناؤ پھر ہی لگا لینا

تھا۔"

"میں تو تمہاری طرف آنے کا سوچ رہی تھی لیکن وہ مما کی کزن آگئیں اپنے بیٹے کے ساتھ اور خیر سے پسند بھی کر گئیں۔"

"واقعی!" حنا کی اطلاع پر وہ بے ساختہ خوش ہو گئی۔ "شکر ہے تم بھی ٹھکانے لگو گی ورنہ میں سوچ رہی تھی کہ میں دوسری شادی بھی کر لوں گی اور تم ایک منگنی بھی نہیں کروا سکیں۔" اس کی بات سن کر حنا خاموش ہو گئی تھی۔

"ہیلو!" مسلسل خاموشی پر ملائکہ کو بولنا پڑا۔

"تم ابھی تک وہیں اٹکی ہو۔"

"فراز کہاں ہے؟ میں کتنے دن سے اس کا موبائل ٹرائی کر رہی ہوں۔"

"وہ ملتان گیا ہے اپنی فیملی کے ساتھ۔ صالحہ کی ممی کی طبیعت خراب ہے۔"

ملائکہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ "اس نے مجھے بتایا بھی نہیں۔"

"ایک تو وہ ایمرجنسی میں گیا ہے دوسرا شاید تم نے اسے فون سے منع کیا تھا مجھے کہہ گیا تھا تمہیں بتا دوں۔"

"ہوں!" وہ بے خیالی میں بولی۔

"تم بتاؤ کیا حال ہے؟"

"کچھ نہیں۔ آج ڈیڈی، ممی کی دعوت کی تھی۔ پرسوں ڈیڈی، چاچو، ممی اور علی عمرہ کرنے جا رہے ہیں؟"

"مبارک ہو تم نہیں جا رہیں۔"

حنا کے پوچھنے پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ "مجھے کسی نے پوچھا ہی نہیں۔"

"چلو کوئی بات نہیں، تم اپنے ہزبینڈ کے ساتھ جانا۔" حنا کے کہنے پر وہ ہنس پڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ فیروز صاحب کی پیکنگ کر کے آئی تو ابراہیم اس کا ہی منتظر تھا۔

"اپنی پیکنگ کر لو، صبح ہماری فلائٹ ہے اسلام آباد کی۔" اس نے چونک کر ابراہیم کو دیکھا۔

"اسلام آباد لیکن کیوں؟"

"مجھے وہاں ضروری کام ہے، دوسرا پرسوں پاپا اور انکل بھی چلے جائیں گے، نوکروں کو کل سے چھٹی دے دی ہے، مجھے وہاں پتا نہیں کتنے دن لگتے ہیں تم اکیلی کہاں رہو گی؟" وہ اب بیڈ پر بالکل اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔

"مجھے اسلام آباد نہیں جانا، میں حنا کی طرف چلی جاؤں گی۔"

"کسی دوست کے گھر جا کر رہنا برا لگتا ہے اور دوسرا میں سیٹ کنفرم کروا چکا ہوں اور ویسے بھی وہاں لائرز سے بھی ملنا ہے۔"

آخر میں اس نے اسے لالچ دیا تو وہ چپ ہو گئی۔ واقعی اکیلے رہنا تو ذرا مشکل تھا اور پھر کچھ دنوں کی بات تھی۔ تفریح ہی ہو جائے گی۔ اس نے سوچا اور مطمئن ہو گئی۔

اسلام آباد ایئرپورٹ پر اترتے ہی ٹھنڈی ہوا نے ان کا استقبال کیا تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر وہ غائب دماغی سے باہر دیکھنے لگی۔ اور چونکی تب جب ٹیکسی رکی۔ اس نے چونک کر باہر دیکھا۔ وہ کوئی نئی آبادی تھی، کہیں کہیں مکان تھے، وہ بھی ایک مکان کے آگے کھڑے تھے۔ ابراہیم اتر چکا تھا، وہ بھی حیرت کے ساتھ اتری۔ ٹیکسی ڈرائیور نے دونوں ٹرالی نکال کر دروازے کے آگے رکھیں۔ ابراہیم اسے کرایہ دے کر اس کی طرف مڑا۔

"یہ کون سی جگہ ہے۔ ہم تو ہوٹل میں رکنے والے تھے۔"

"ہاں وہاں بکنگ نہیں ہو سکی، یہ میرے فرینڈ کا گھر ہے۔"

وہ لاک کھولتے ہوئے بولا۔ دروازہ کھول کر وہ ٹرالی تھام کر اندر داخل ہو گیا جبکہ وہ ابھی تک ناسمجھی کی کیفیت میں تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک چھوٹا سا لیکن صاف ستھرا کمرہ تھا جس میں صوفہ اور ٹی وی تھا۔ ابراہیم دائیں طرف بنے کمرے میں داخل ہوا تو وہ بھی اس کے پیچھے چلی گئی وہ یقیناً "بیڈ روم تھا۔ کمرے کے بائیں طرف ڈبل بیڈ اس کے سامنے ڈریسنگ ٹیبل، دائیں طرف دیوار گیر الماری اور کمرہ ختم۔ وہ پریشانی سے ہر چیز دیکھ رہی تھی۔ ٹرالی رکھنے کے بعد وہ جوں ہی مڑا اس کی نظر ملائکہ پر پڑی، جو دروازے کے بیچوں بیچ حیران پریشان کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔

"گھر پسند آیا؟" ملائکہ نے اسے ایسے دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔

"یہ گھر ہے یا ڈربہ، میرا تو دم گھٹ رہا ہے۔" اسے واقعی لگ رہا تھا اس کا سانس بند ہو رہا ہے، وہ واپس لاؤنج میں نکل آئی، ابراہیم اس کے پیچھے آیا تھا۔

"میں یہاں نہیں رہ سکتی، آپ مجھے واپس بھیج دیں۔"

وہ صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ابھی تو یہ بتاؤ جس تمہیں پسند آئے یا نہ آئے، رہنا تو یہیں ہے۔" [illegible] تم ٹی وی دیکھو میں ذرا کھانے کا انتظام کر کے آتا ہوں۔"

وہ کہہ کر باہر نکل گیا تو اس نے ایک بار پھر تفصیلی نظریں دوڑائیں، ان دو کمروں کے علاوہ تیسرا کمرہ کوئی نہیں تھا، وہ ابھی جس جگہ پر کھڑی تھی وہ چھوٹا سا کچن تھا جو شروع ہونے سے پہلے ختم ہو جاتا تھا۔ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

ذہنی اور جسمانی طور پر اتنی تھک چکی تھی کہ کب اس کی آنکھ لگی اسے پتا ہی نہیں چلا۔ جب وہ واپس آیا تو وہ صوفے پر ٹانگیں سمیٹے سو رہی تھی۔ وہ بریانی پلیٹوں میں ڈال کر لاؤنج میں آ گیا۔ اس نے سرسری سی نظر اس کے سوئے وجود پر ڈالی اور کچھ لمحوں کے لیے اس کی نظریں جیسے اس پر ٹھہر سی گئیں۔ وہ سوتی ہوئی کتنی معصوم لگتی تھی اور جب جاگتی تھی تو ان آنکھوں اور زبان سے کتنے شعلے نکلتے تھے جو صرف اس کے لیے نکلتے تھے اور اسے ہی جھلساتے تھے۔

اس نے اگر اپنی زندگی میں کسی لڑکی سے محبت کی تھی تو وہ یہ تھی اور اگر کسی سے نفرت کی تھی تو بھی یہ تھی۔ اس نے ٹی وی کا والیوم فل کر دیا۔ وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔ اس نے ناسمجھی سے اچانک اٹھنے کی وجہ تلاش کی۔ نظریں سامنے بیٹھے ابراہیم پر رک گئیں جو پورے انہماک سے بریانی کھانے میں مصروف تھا۔ بریانی کی خوشبو نے اس کی بھوک چمکا دی تھی۔ اس نے للچائی نظروں سے گرم بھاپ اڑاتی بریانی کو دیکھ کر ابراہیم کو دیکھا۔ لیکن وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ خود سے کہنا اس کو اپنی بے عزتی کے مترادف لگا تھا اور بھوک بھی لگی تھی۔

"کھانا کھا لو کہ باقاعدہ انویٹیشن دینا ہو گا۔" اس کے انداز نے اسے غصہ چڑھا دیا۔

"مجھے بھوک نہیں۔" ابراہیم نے ٹی وی سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا اور کندھے اچکا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ پیپسی کا گلاس لے کر واپس آیا تو وہ اسی طرح بیٹھی تھی۔

"رات کو کھانا لیٹ ملے گا اور گھر میں کچھ بھی نہیں [illegible] کھانے کے بجائے بریانی کھا لو کافی مزے کی ہے۔" وہ پیپسی پیتے کے ساتھ بڑے غور سے اسے بھی دیکھ رہا تھا۔

اسے واقعی بہت بھوک لگی تھی۔ اس نے پہلی بار ضد کو پس پشت ڈال کر پلیٹ اٹھائی۔

اس کو چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ شام کے ساتھ سردی بھی بڑھ رہی تھی۔ وہ پلیٹ ٹیبل پر رکھ کر بیڈ روم میں آئی تو وہ بڑے مزے سے بیڈ کے درمیان پھیل کر لیٹا تھا۔ وہ بیٹھنے کے لیے جگہ ڈھونڈنے لگی۔ وہاں صوفہ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ نیم وا نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

"پلیٹیں دھو آئی ہو؟" اس کی بات سن کر وہ اچھل پڑی تھی۔

"اس میں حیران ہونے والی کیا بات ہے؟"

"میں نے کبھی برتن نہیں دھوئے۔" وہ اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"یہاں تمہیں بہت سے ایسے کام کرنے ہوں گے جو تم نے پہلے نہیں کیے۔ مجھے دس بجے ایک کلائنٹ سے ملنے جانا تھا۔ دس بجے میرا بریک فاسٹ ریڈی ہونا چاہیے۔ یہاں صرف دو کمرے ہیں جن کی صفائی بھی تمہیں کرنی ہے' وہ بھی جھاڑو سے' اس میں باتھ روم بھی شامل ہے۔ میں دوپہر کو تین بجے آؤں گا' کھانا بھی تمہیں تیار کرنا ہے اور رات کو بھی۔"

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اب تک تو اسے صدمے سے بے ہوش ہو جانا چاہیے تھا' لیکن وہ صحیح سلامت کھڑی تھی۔

"آپ کو کیا لگتا ہے' میں ایسا کچھ کروں گی۔" وہ غصے سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"مجھے لگتا نہیں' مجھے یقین ہے' تم یہ سب کرو گی۔" وہ بستر پر سکون انداز میں بولتا ہوا دوبارہ لیٹ گیا۔

"یہ سب کچھ کرتی ہے میری جوتی۔ میں نے آرام سے ایک دو باتیں کیا مان لیں' آپ نے مجھے اپنی بیوی ہی سمجھ لیا ہے۔" وہ غصے میں بلا سوچے سمجھے بول گئی تھی اور ابراہیم کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ غصے میں بھی وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی' اس نے پہلی بار ابراہیم کو اس طرح کھل کر ہنستے دیکھا تھا۔

"میں سمجھا نہیں۔ تم میری بیوی ہی ہو۔"

"میں آپ کو پہلے ہی بتا چکی ہوں' میں آپ کی بیوی نہیں۔" وہ غصے سے مٹھیاں بھینچ کر بولی۔ "میں اب بالکل یہاں نہیں رہوں گی۔ مجھے یہاں ڈیڈی اور چاچو سے دور لا کر آپ کیا سمجھ رہے ہیں' مجھے ڈرا سکتے ہیں۔" وہ اپنے ہینڈ بیگ کی تلاش میں نظریں دوڑاتے ہوئے بولی۔

وہ جو چت لیٹا تھا کروٹ بدل کر بڑی دلچسپی سے اس کی حرکات دیکھنے لگا۔ ہینڈ بیگ کھول کر اسے جھٹکا لگا تھا۔ کرنسی اور موبائل دونوں غائب تھے۔ اس نے پاگلوں کی طرح سارا بیگ کھنگال ڈالا اور اگلے ہی پل اس نے سارا بیگ الٹ دیا۔ وہاں کچھ ہوتا تو نکلتا۔ اس نے بڑی بے یقینی سے ابراہیم کی طرف دیکھا۔

"میرے روپے' میرا موبائل آپ نے نکالا ہے؟" اس نے مسکرا کر سر ہلایا تھا۔

"آپ نے مجھے چیٹ کیا ہے۔" وہ اب بھی بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ایک کے بعد دوسرا پھر تیسرا آنسو اس کی آنکھ سے نکلا تھا۔ وہ کتنی دیر خاموشی سے آنسو بہاتی رہی' وہ اسی طرح لیٹا اسے دیکھتا رہا۔ اس نے چپ نہیں کروایا تھا۔ پھر اس نے آنسو صاف کیے اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں جا رہی ہوں۔" اس کی اطلاع پر ابراہیم نے کچھ نہیں کہا تھا۔ بس دوبارہ سونے والی پوزیشن میں چلا گیا تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکلی' لیکن ایک اور جھٹکا اس کا منتظر تھا۔ دروازہ اس کی قسمت کی طرح بند تھا۔ وہ وہیں بیٹھ کر زور زور سے رونے لگی۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا' وہ کبھی زندگی میں اس طرح اور اتنا زیادہ روئی ہو۔ اسے روتے ہوئے دس منٹ گزر گئے تھے۔ اب تو آنسو بھی خشک ہو گئے تھے اور ہچکی بندھ گئی تھی' جب ابراہیم کمرے سے نکل کر اس کے سامنے دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔

"یہاں سے باہر نکلنے کا اور کسی سے رابطہ کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ یہاں مالک میں ہوں' اگر تمہیں یہاں سے جانا ہے اور مجھ سے آزادی حاصل کرنی ہے تو جتنے دن ہم یہاں ہیں' تمہیں وہی کرنا ہو گا جو میں کہوں گا۔" وہ اب دوزانو ہو کر اس کے بالکل سامنے بیٹھ گیا تھا۔

"اگر تم صحیح سلامت یہاں سے جانا چاہتی ہو تو میری ہر بات ماننا ہو گی۔" اس نے بڑی مشکل سے دکھتی پلکوں کو اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اس کے بہت قریب بیٹھا اپنی نیلی آنکھیں اس پر گاڑے بیٹھا تھا۔ اسے اپنی بے بسی پر ایک بار پھر بہت رونا آیا تھا۔

ابراہیم نے ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو صاف کیے' اسے جیسے کرنٹ لگا تھا۔ اس نے جھٹکے سے اس کا ہاتھ پیچھے کیا' لیکن ابراہیم کا ردعمل اس کی توقع کے برعکس تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ مضبوطی سے تھاما تھا۔

"میرے ساتھ رہنے کی ایک کنڈیشن یہ بھی ہے تو بدتمیزی' جتنی بدتمیزی میں نے برداشت کرنا تھی کر لی ہے۔ اب اور نہیں۔ اب اٹھ جاؤ اور ایک اچھی لڑکی کے طور طریقے اختیار کرو۔"

اس نے اسے بازو سے پکڑ کر زبردستی کھڑا کیا۔

"یہاں سے مارکیٹ دور ہے' میں کچھ دن کا سامان اٹھا لے آتا ہوں۔ میرے آنے تک برتن دھلے ہوں' اور ہاں۔" وہ جاتے جاتے مڑا۔ "کوئی الٹی سیدھی حرکت مت کرنا' تمہیں ہی نقصان ہو گا۔"

باہر نکلتے ہی اس نے دروازہ لاک کر دیا تھا۔ وہ کتنی دیر وہیں کھڑی رہی' لیکن سردی اتنی زیادہ تھی کہ وہ اپنی جگہ سے ہلنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ کمرے میں آ کر اس نے سب سے پہلے موبائل کی تلاش شروع کی' بیڈ کے نیچے میٹرس کے نیچے الماری میں جو بالکل خالی تھی' وہ نڈھال ہو کر بیڈ پر گر گئی۔ وہ اب تک ابراہیم کو بہت آسان لے رہی تھی۔ سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا تھا۔ ابراہیم کا یہ روپ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

"تو کیا وہ اس سے بدلہ لے رہا ہے؟" وہ چھت کو گھورتے ہوئے سوچنے لگی۔ ذہن میں اس کی ابھی ابھی کی ہوئی باتیں گونجنے لگیں تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ اسے سازش کے تحت یہاں لے کر آیا تھا۔ اور وہ اس سازش کا شکار ہو چکی تھی۔ وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں چلتی ہوئی اس کچن نما ڈربے میں آ گئی تھی' دو پلیٹیں' دو گلاس اور دو چمچے تھے' لیکن ان کو صاف کرتے ہوئے بھی وہ رو پڑی۔

"ڈیڈی!" اس نے بے ساختہ انہیں یاد کیا تھا۔

ایک گھنٹے بعد وہ واپس آیا تھا' چیزوں سے لدا پھندا شاپرز لا کر اس نے کچن کے کاؤنٹر پر رکھے' وہ اس کے پیچھے آئی تھی۔

"گڈ! برتن صاف ہو گئے؟" وہ سنک دیکھ کر بولا۔ "لیکن ایک غلطی ہے' نیکسٹ ٹائم برتن دھو کر ان کو پہلے تولیے سے خشک کرو' پھر انہیں رکھو۔"

ملائکہ نے بے زاری سی نظر اس پر ڈالی۔ "مجھے ان کاموں کی عادت نہیں ہے۔"

"جانتا ہوں۔ اپنی وجہ سے یہ گروسری ہے۔ اس شاپر میں ویجی ٹیبل ہیں' اس میں میٹ اور یہ فروزن کباب ہیں' ان کو صرف فرائی کرنا ہے۔ کل مجھے گوشت کھانا ہے۔"

ملائکہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا' لیکن پھر خود ہی کل کی کل دیکھی جائے گی سوچ کر منہ بند کر لیا۔

"مرغا لایا ہوں' تمہیں پسند ہے؟" اس نے صرف پوچھا تھا' جواب جاننے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ایک پیس پلیٹ میں نکال کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ایک کپ چائے ملے گی؟" ملائکہ نے ایک خاموش نظر اس پر ڈالی اور کچن میں آ گئی۔ ابھی اس نے قہوے کے لیے پانی رکھا تھا' جب وہ اس کے پیچھے آ گیا۔

"میں نے سوچا پتا نہیں چائے بنانی بھی آتی ہے یا نہیں۔" اس کے طنز کو ملائکہ نے خون کے گھونٹ کی طرح پی لیا تھا۔ وہ اب شیلف سے ٹیک لگائے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"مجھے چائے بنانی آتی ہے۔" اسے مسلسل وہاں کھڑا دیکھ کر وہ جھنجلا کر بولی۔

"وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔ مجھے ڈر ہے' کہیں مجھ سے جان چھڑانے کے لیے تم اس میں زہر نہ ملا دو۔"

"کاش!" وہ زیر لب بولی۔

چائے کے دوران ان دونوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ صوفے پر نیم دراز تھا۔ ریموٹ اس کے سینے پر رکھا تھا۔ اس نے غور سے اسے دیکھا' اس کی آنکھیں بند تھیں۔ شاید وہ سو گیا تھا۔ رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں اور سر دونوں بھاری ہو رہے تھے۔ وہ کپ دھو کر کمرے میں آ گئی' نرم بستر پر لیٹ کر گرم کمبل لیتے ہی جیسے سکون ملا تھا۔ وہ ابھی کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی' صرف سونا چاہتی تھی اور کچھ دیر بعد ہی وہ گہری نیند میں تھی۔

★★★

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب پیاس کا احساس ہوا تھا' بے چین ہو کر اس نے کروٹ بدلی تو ہاتھ کسی چیز

سے نکر آیا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا کمرے میں پہلی نائٹ بلب کی روشنی میں نظر آتا ابراہیم کا چہرہ اس کے بے حد قریب تھا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ بے ساختہ تھی۔ دوسری طرف ابراہیم ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔

"کیا ہوا؟" اس نے ہاتھ بڑھا کر بٹن آن کیا۔ وہ بیڈ سے اتر چکی تھی اور گہرے سانس لیتے ہوئے ابراہیم کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا جسم ہلکے ہلکے کانپ رہا تھا۔ وہ خود نہیں جانتی تھی ڈر کے مارے یا سردی کے مارے۔

"کیا ہوا ہے؟" وہ اب بھی اس کے چیخنے پر حیران تھا۔

"آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔"

"سو رہا ہوں۔"

"لیکن یہاں کیوں؟"

"پھر کہاں سوؤں؟" وہ سارے جہان کی معصومیت لیے اس سے پوچھ رہا تھا۔

"آپ وہاں صوفے پر سو رہے تھے۔"

"مجھے وہاں ڈر لگ رہا تھا۔" اور ملائکہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اسے تنگ کر رہا ہے۔

"دیکھیں پلیز، یہ مذاق کا وقت نہیں۔ میرے سر میں درد ہے۔ مجھے نیند بھی آرہی ہے' آپ باہر جا کر سوئیں۔"

"میرا ابھی اس وقت مذاق کا کوئی موڈ نہیں میں پہلے بھی بتا چکا ہوں مجھے بیڈ کے علاوہ نیند نہیں آتی' دوسرا یہاں ایک ہی کمبل ہے۔" وہ دوبارہ لیٹ گیا۔

"سردی بہت زیادہ ہے' تم نے سوئٹر بھی نہیں پہنا' بیمار ہو جاؤ گی' یہاں آجاؤ میرے پاس۔" اس کو پاس بلاتے ہوئے اس کا لہجہ بہت نرم ہو گیا تھا۔

اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی' لیکن وہ نروس ہو گئی۔

"میں سب سمجھ رہی ہوں۔" وہ جب بولی تو اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ "پہلے مجھے دھوکے سے یہاں لائے' ہوٹل میں کمرہ ہو گا' لیکن مجھے تنگ کرنے کے لیے آپ مجھے اس ڈربے میں لے آئے میں اس جیل سے نکل نہ جاؤں۔ آپ نے میرے پیسے اور موبائل نکال لیا باہر جاتے ہیں تو ڈور لاک کر جاتے ہیں۔ مجھے کھانا بنانا نہیں آتا میں نے کبھی برتن نہیں دھوئے' لیکن آپ یہ سب کچھ مجھ سے کروانا چاہتے ہیں اور اب..." اس نے انگلی سے بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔

آنسوؤں کا اتنا غلبہ تھا کہ اگلا جملہ منہ میں ہی رہ گیا۔ وہ مزید بات کیے بغیر باہر نکل آئی۔ لاؤنج میں آکر وہ صوفے پر بیٹھ گئی اور ٹانگیں سمیٹ کر ٹھوڑی ان پر ٹکا دی۔ نہ جسم پر سوئٹر تھا اور نہ گرم شال' سردی کے مارے اس کے دانت بجنے لگے تھے۔

کافی دیر وہ خود پر ضبط کرتی رہی' اسے امید تھی وہ اسے منانے ضرور آئے گا' لیکن کتنی دیر گزرنے کے باوجود وہ نہیں آیا۔ تو اس کے آنسو نکل آئے' اس کو لگ رہا تھا وہ بس مرنے والی ہے' تب ہی روتے ہوئے اس کی نظر ہیٹر پر پڑی۔

بڑی مشکل سے وہ اپنی اکڑتی ٹانگوں کو حرکت دے کر کچن تک آئی تھی' ماچس لے کر وہ ہیٹر کے پاس آئی۔ ہیٹر جلا کر وہ اس کے بالکل قریب بیٹھ گئی۔ چہرہ اس نے بالکل ٹانگوں میں چھپا لیا تھا۔ تب ہی دور سے اذان کی آواز آنے لگی اور پھر اس نے کمرے سے کھڑبڑ کی آواز سنی جس کا مطلب تھا وہ نماز کے لیے اٹھ گیا ہے۔ دس منٹ بعد اس نے دروازہ کھلنے اور قدموں کی آواز سنی جو اس کے بالکل قریب آکر رک گئی تھی۔

"اندر جا کر سوؤ۔"

اس کے کہنے پر بھی نہ وہ ہلی تھی نہ سر اٹھایا تھا۔

"میں تم سے کہہ رہا ہوں۔" اس نے اسے بازو سے تھام کر کھڑا کیا۔ ایک دم کھڑے ہونے سے اس کی چیخ نکل گئی تھی۔ تکلیف کے احساس سے اس کی آنکھ سے آنسو نکل آئے تھے۔

"جانور ہیں آپ۔"

"جانور دیکھے ہیں کبھی قریب سے؟" اس نے ایک دم اسے دونوں بازوؤں کے گھیرے میں لے کر خود سے قریب کر لیا تھا۔ اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر رکھ کر اسے دھکا دے کر پیچھے کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کوشش میں وہ کچھ اور قریب چلی گئی تھی۔

"جو کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ انسان نہیں ہوتے۔"

"یہ بات میری آنکھوں میں دیکھ کر کہو۔" اس کے برعکس وہ بڑے رومانٹک موڈ میں کہہ رہا تھا۔

"مجھے آپ کی آنکھیں سخت ناپسند ہیں۔" وہ دائیں طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"لیکن مجھے تو تمہاری آنکھیں بہت پسند ہیں۔" اس نے بہت نرمی سے اس کی آنکھوں کو چوما تھا۔

یہ سب اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ وہ بے اختیار اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ وہ ایک بار پھر اس کے چہرے پر جھکا تھا' لیکن اب کی بار وہ پورا زور لگا کر اس کے حصار سے نکلی تھی۔

"ڈونٹ ٹچ می۔ آئی ہیٹ یو۔" وہ بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ جبکہ وہ ہونٹ بھینچے بند دروازے کو دیکھتا رہا۔ بڑی زور سے دروازہ بجایا گیا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی تھی۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے دروازے کو دیکھا۔ دروازہ مسلسل بج رہا تھا۔ اس کی مسلسل مزاحمت پر اسے اٹھ کر دروازہ کھولنا پڑا۔ وہ دروازہ کھول کر سائیڈ پر ہو گئی تھی۔ اس نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ پر وہ جانتی تھی وہ غصے میں ہے۔

اس نے جا کر پہلے اپنے کپڑے نکالے اور باتھ روم میں گھس گیا۔ کافی دیر بعد وہ باہر نکلا تھا۔

"مجھے باہر جانا ہے۔ جلدی سے بریک فاسٹ ریڈی کرو۔" وہ حکم دے کر باہر نکل گیا۔ جبکہ وہ اپنے کپڑے لے کر باتھ روم میں گھس گئی۔

گرم پانی سے نہانے کے بعد وہ ایک دم تر و تازہ ہو گئی تھی۔ جب وہ باہر آئی۔ وہ خود کچن میں کچھ کرنے میں مصروف تھا۔ لگتا تھا باہر جانے کی کچھ زیادہ جلدی تھی۔ آہٹ پر اس نے مڑ کر دیکھا اور اس پر نظر پڑتے ہی وہ پورے کا پورا گھوم گیا تھا۔

"میں نے تمہیں منع کیا تھا۔ یہ کپڑے مت پہنا کرو۔" اس نے انگلی اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کیا۔ جس نے جینز کے اوپر سوئٹر پہن رکھا تھا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا میں ایسے کپڑے ہی پہنتی ہوں اور مجھے یہ ہی اچھے لگتے ہیں۔"

"مجھے اچھے نہیں لگتے۔ جاؤ اور بدل کر آؤ۔"

ملائکہ نے ایک نظر اسے دیکھا اور صوفے پر جا کر بیٹھ گئی جس کا مطلب تھا نہیں۔

ابراہیم نے دانت پر دانت جما کر اسے دیکھا اور کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ملائکہ کا خیال تھا وہ کچھ بولے گا' ڈانٹے گا' طنز کرے گا' لیکن وہ کچھ کہے بغیر کمرے میں چلا گیا تھا۔ کچھ دیر تو وہ بیٹھی رہی' پھر تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اندر گئی تھی۔ اس کا بیگ بیڈ پر کھلا پڑا تھا اور آدھے سے زیادہ کپڑے غائب تھے وہ تیزی سے چلتی ہوئی آگے بڑھی۔ دھواں اور جلنے کی بو باتھ روم سے آرہی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی۔

باتھ روم کے دروازے کے آگے وہ ساکت ہو گئی تھی۔ اس کے سارے کپڑے آگ کی لپیٹ میں راکھ ہو رہے تھے۔ جبکہ وہ بڑے اطمینان کے ساتھ آگ کے شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔ جب سب کچھ راکھ میں تبدیل ہو گیا تو وہ اس کی طرف مڑا۔

"اب پہن کر دکھاؤ۔" اس کا انداز چیلنج کرتا ہوا تھا۔ اس نے بازو سے پکڑ کر اسے سائیڈ پر کیا اور باہر نکل گیا۔

دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تھی' جس کا مطلب تھا وہ جا چکا ہے۔ وہ بے جان ہوتی ٹانگوں کے ساتھ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ خوف کے احساس نے اسے بالکل مفلوج کر دیا تھا۔ اتنا ڈر اس نے زندگی میں کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

آج تک وہ یہی سمجھتی رہی وہ بہت بہادر ہے' لیکن وہ تو بہت کمزور تھی' بزدل تھی۔ اس کی بہادری اس کے باپ کی طاقت اور محبت تھی' جتنا بھی کہتی تھی اسے ہمیشہ محبت ملی تھی' شاید اس لیے اس کو کبھی احساس نہیں ہوا تھا کہ ٹھکرائے اور سخت رویے کا احساس کیا ہوتا ہے؟

اسے وہ سارے لوگ یاد آرہے تھے جن کے رشتے

اس نے سعدی معمولی نقص نکال کر ریجیکٹ کیے تھے۔ جس طرح اس نے آج اس کے کپڑے جلائے ہیں اگر اس کو جلا دیا تو؟" اس نے بے ساختہ دونوں ہاتھوں سے اپنے بازوؤں کو چھوا جیسے خود کو صحیح سلامت ہونے کا یقین کر رہی ہو۔ اگر وہ ہمیں اسے چھوڑ کر چلا جائے وہ یہاں گھٹن سے مر جائے تو اس کی لاش اٹھانے والا بھی کوئی نہیں ہوگا" اس نے بے ساختہ جھرجھری لی تھی۔

"ڈیڈی!" اس نے بے ساختہ انہیں آواز دی تھی۔

"کیا ڈیڈی مجھے بھول گئے ہیں۔ انہوں نے ایک دفعہ بھی مجھے فون نہیں کیا۔" وہ خود سے باتیں کرنے لگی تھی "لیکن میرا فون بھی تو اس کے پاس ہے۔" اس نے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا۔

ابراہیم کا یہ روپ اس کے لیے بہت پریشان کن تھا۔ یہ تو وہ سمجھ گئی تھی وہ ایک سازش کے تحت اسے لے کر آیا تھا اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے اور اب وہ مکمل طور پر اس کے رحم و کرم پر تھی۔ وقت اور حالات کا تقاضا یہی تھا۔ وہ جو کہے وہ وہی کرے۔ اس کے غصے کو ہوا دے کر خود کو نقصان پہنچانے کے مترادف تھا۔

اس نے گہرا سانس لیا۔

"مجھے ذرا یہاں سے نکلنے دو ابراہیم! پھر تمہیں بتاؤں گی میں چیز کیا ہوں۔"

وہ ابھی کچن میں کھڑی سوچ ہی رہی تھی "کیا پکائے" جب دروازہ کھلا اور وہ اندر آیا تھا۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ دو بج رہے تھے۔ وہ سیدھا کچن میں ہی آیا تھا۔ صاف ستھرا کچن اس بات کا ثبوت تھا کہ کچھ بھی نہیں پکا۔ اس نے ملائکہ کی طرف دیکھا تو وہ گھبرا کر جلدی سے بولی۔

"میں سوچ رہی تھی کیا پکاؤں۔"

"میں کوشش کرتا ہوں غصہ نہ کروں، لیکن تم کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں۔"

"آئی ایم سوری۔" وہ سر جھکا کر بولی تو ابراہیم نے سر افسوس سے ہلایا اور کل کے لائے ہوئے شاپرز دیکھنے لگا۔

"اگر کھانا نہیں پکانا تھا تو پہلے بتا دیتیں۔ میں کچھ لے آتا۔ صبح ناشتا بھی نہیں کیا، اتنی بھوک لگی ہے۔" اسے واقعی کافی بھوک لگی تھی۔

"میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔ مجھے واقعی کھانا پکانا نہیں آتا۔ ڈیڈی کو میرا کام کرنا پسند نہیں تھا۔" اس نے بڑے فخر سے اطلاع دی۔

"میں جانتا ہوں، انہوں نے ہی تم کو بگاڑا ہے۔ لوگ بیٹیوں کو کھانا پکانا، گھر بنانا سکھاتے ہیں۔ لیکن انہوں نے تمہیں صرف بدتمیزی کرنا سکھایا ہے۔" وہ ایپرن پہنے کڑاہی چولہے پر رکھے جانے کیا کر رہا تھا۔ اس کی بات پر اسے حسب عادت غصہ تو بہت آیا تھا لیکن کچھ دیر پہلے خود کو دیے ہوئے لیکچر کے پیش نظر خاموش ہو گئی پھر ہمت کر کے اس نے وہ الفاظ ترتیب دیے جو وہ پچھلے چند گھنٹوں سے سوچتی رہی تھی۔

"آئی ایم سوری۔"

ابراہیم نے مڑ کر اسے دیکھا۔ "فار واٹ؟"

"میں نے رویہ ... کیا ہے، میں نے واقعی آپ کو بہت تنگ کیا ہے اور میں اس کے لیے بہت شرمندہ ہوں۔"

ابراہیم نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔ "لگتا تو نہیں کہ تم شرمندہ بھی ہو سکتی ہو۔"

وہ کچھ کر رہا تھا، وہ دل ہی دل میں تلملائی تو بہت تھی، لیکن اس نے خود سے وعدہ کیا تھا خود کو پر سکون رکھے گی۔

"میں تو سمجھا تھا کہ یہ معرکہ کافی لمبا ہوگا، لیکن تم نے تو بڑی جلدی ہار مان لی، یہ تو ابھی ٹریلر تھا، مووی تو ابھی باقی ہے۔"

"یہ سب جو ہوا وہ ٹریلر تھا؟" اس نے بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھا تو وہ محظوظ ہونے والی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھنے لگا۔

"آپ اب کیا کرنے والے ہیں؟" اس نے ایسے پوچھا جیسے وہ بتا ہی دے گا۔

"دیکھو ایسا جو تم نے سوچا بھی نہیں ہوگا۔" اس کی باتوں سے ملائکہ کو خطرے کی بو آئی تھی۔ اس نے دوبارہ سے خود کو خوشامد کے لیے تیار کیا۔

"اگر کوئی سوری کرے تو اسے معاف کر دینا چاہیے۔" ابراہیم نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔

"چلو تم اتنا فورس کر رہی ہو تو میں تمہیں معاف کر دیتا ہوں۔"

"تھینک یو۔" وہ ایک دم بچوں کی طرح خوش ہو کر بولی۔ ابراہیم پوری طرح اس کی طرف گھوم گیا تھا۔

"آج تو تم مجھے حیران کرنے پر تلی ہو۔" وہ غور سے اسے دیکھنے لگا۔

"اب آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے تو پھر پلیز مجھے گھر بھیج دیں۔"

"اوہ!" ابراہیم کی اوہ کافی معنی خیز تھی۔ "اچھا تو یہ سب گھر جانے کے لیے ہو رہا ہے۔"

"نہیں۔ میں سچ میں سوری کر رہی ہوں۔"

"سوری کا مطلب دوستی ہوتا ہے، اگر دوستی ہو گئی ہے تو گھر جانے کی کیا ضرورت ہے، یہیں انجوائے کرتے ہیں، مری میں برف باری ہو رہی ہے وہاں چلتے ہیں۔"

ملائکہ کچھ دیر اسے دیکھ کر اپنے ضبط کا امتحان لیتی رہی۔

"میں ڈیڈی، مما، علی، چاچو سب کو بہت مس کر رہی ہوں۔"

اب سچ میں اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"لیکن ابھی لاہور جانے کا فائدہ نہیں، وہ ابھی واپس نہیں آئے۔"

"کوئی بات نہیں، مجھے گھر بھی یاد آ رہا ہے۔"

اب کی بار ابراہیم کھل کر مسکرایا تھا۔

"تم فیصلہ کر لو کون زیادہ یاد آ رہا ہے، گھر یا گھر والے؟"

"دونوں۔" اب آنسو اس کی آنکھوں سے باہر آ گئے تھے۔

سلا دیتا ہوا ابراہیم کا ہاتھ ایک پل کے لیے رکا تھا، پھر وہ سر جھٹک کر دوبارہ کھیرا کاٹنے لگا۔

"یہاں کیا مسئلہ ہے، یہ بھی گھر ہے۔" ملائکہ نے روتے ہوئے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"یہ گھر ہے، مرغی کا ڈربہ بھی اس سے بڑا ہوتا ہوگا، میرا یہاں دم گھٹتا ہے، نہ میں باہر جا سکتی ہوں، نہ کسی سے فون پر بات کر سکتی ہوں، نہ اپنی مرضی سے کپڑے پہن سکتی ہوں اور مجھے آپ سے ڈر لگتا ہے۔ کل آپ نے میرے کپڑے جلائے ہیں، کل اگر آپ نے مجھے جلا دیا تو؟"

ابراہیم نے حیرت سے اسے دیکھا، لیکن وہ روتے ہوئے بولتی جا رہی تھی۔

"یہاں کوئی میرا نہیں، کوئی مجھ سے پیار نہیں کرتا، آپ بھی نہیں۔"

وہ اکثر جعفر صاحب سے کوئی بات منوانے کے لیے ایسے ہی بولتی تھی، ابھی بھی وہ بے دھیانی میں بھول گئی کہ سامنے جعفر حسین نہیں ابراہیم فیروز ہے، اس نے جذباتی بلیک میلنگ کی تھی۔ لیکن سامنے والا واقعی جذباتی ہو گیا تھا۔ اس نے چھری پلیٹ میں رکھی اور سیدھا اسی کی طرف آ گیا۔

"کس نے کہا، میں تم سے پیار نہیں کرتا۔ اتنا تو تمہارا خیال رکھتا ہوں، دیکھو تمہارے لیے کھانا بھی بنا رہا ہوں۔" اس کے قریب بیٹھتے ہوئے دایاں بازو پھیلا کر اس نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

ملائکہ کو اس مظاہرے کی بالکل امید نہیں تھی۔ اس نے تھوک نگل کر سر جھکا لیا۔ رات کا منظر ایک بار پھر نظروں میں گھومنے لگا۔ آنکھوں پر کوئی لمس پھر جاگنے لگا تھا۔

"میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں، تم نے کبھی موقع ہی نہیں دیا کہ میں تمہیں بتا سکوں۔"

اس کے گرد اس کی گرفت مزید سخت ہو گئی تھی، وہ نہیں جانتی تھی وہ طنز کر رہا ہے یا تنگ، لیکن وہ بری طرح پھنسی تھی۔ اس کی چال اس پر ہی بھاری پڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی حرکت کرتا اور اس کے جواب میں وہ کوئی ردِ عمل دکھاتی۔ اس کا فون بجا تھا۔

اس کے گرد پھیلا بازو ہٹ گیا تھا۔ ملائکہ کی کب سے رکی ہوئی سانسیں بحال ہوئی تھیں۔ وہ فوراً اس سے پیشتر اٹھ کر کچن میں گئی اور اس کا چھوڑا ہوا سلاد کاٹنے لگی۔

وہ انگلش میں بات کر رہا تھا' جس کا مطلب تھا فون لندن سے تھا۔ وہ بھی اس کے کسی چہیتے دوست کا' کیونکہ بڑی مسکراہٹ اور خوش مزاجی سے بات ہو رہی تھی۔

وہ بات کرتے کرتے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اگر وہ غصہ کرتی تھی تو وہ زیادہ غصے میں آجاتا تھا' اگر وہ آرام سے بات کرتی تو وہ پیار پر اتر آتا تھا۔ اسے بہت کوشش کے باوجود یہاں سے فرار کا راستہ نظر نہیں آیا تھا۔ وہ ابھی مزید سوچ ہی رہی تھی جب وہ اسے آتا دکھائی دیا۔

"مجھے ایئرپورٹ جانا ہوگا' میری فرینڈ آرہی ہے۔"

"فرینڈ۔ یعنی نئی مصیبت۔" اس نے دل میں دہرایا۔

"تم کچھ پکاؤ گی؟"

"کیا پکاؤں؟" وہ کچھ دیر پرسوچ انداز میں برتن کو دیکھتا رہا پھر اچانک بولا۔

"تم رہنے دو' میں باہر سے کچھ لے آؤں گا۔ اگر ہو سکے تو میرا انتظار کرنا' لیکن اگر مجھے دیر ہو گئی اور تمہیں بھوک لگی تو میں نے پاستا بنایا ہے' وہ کھا لینا اور ہاں کوئی شلوار قمیص پہن لینا۔"

"سارے کپڑے تو جلا دیے ہیں' اب کیا پہنوں؟" اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دیا۔

"صرف جینز شرٹ جلائی تھیں۔ شلوار قمیص تو تھیں اور تمہیں شاپنگ بھی کروا دوں گا اور ہاں۔" وہ دو قدم چل کر اس کے بالکل مقابل آگیا تو وہ بے ساختہ پیچھے ہٹی تھی' لیکن اس نے ہاتھ تھام کر اسے دوبارہ قریب کر لیا۔

"جو شکایت رہ گئی ہے' وہ رات کو بتانا۔ اب تو دوستی ہو گئی ہے نا!"

اس نے شہادت کی انگلی اس کے گال پر پھیری تھی اور اس کا گال تھپک کر باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی اس نے پہلے اپنا دایاں گال رگڑا تھا۔

"شیطان۔ میں اسے جتنا بے ضرر اور شریف سمجھتی رہی یہ تو اتنا ہی تیز ہے۔ یا اللہ! کب اس قید سے آزادی ملے گی۔"

اس نے سر اٹھا کر فریاد کی تھی۔ کچھ دیر تو وہ ٹی وی دیکھتی رہی' پھر بیزار ہو کر ٹی وی آف کر دیا اور بیڈ روم میں آگئی۔ بہت کروٹیں بدلنے کے بعد آخر اسے نیند آگئی تھی اور جب اس کی آنکھ کھلی' سارا کمرہ اندھیرے میں ڈوبا تھا۔

اس نے اٹھ کر لائٹ جلائی' گھڑی سات بجا رہی تھی۔ وہ چار بجے کا گیا ہوا تھا' اب سات بج رہے تھے۔ آنے والا ہوگا' یہی سوچ کر اس نے الماری کھولی' اندر دو ہی جوڑے تھے۔ اس نے فیروزی قمیص جس پر سفید دھاگے کا کام تھا اور سفید ٹراؤزر کا انتخاب کیا۔ کپڑے بدل کر اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا' بالوں کو برش کر کے اس نے یوں ہی کھلے چھوڑ دیے' لپ اسٹک پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا' لیکن پھر رک کر خود کو دیکھا۔

"کیا ضرورت ہے میک اپ کی؟" اس نے سوچا اور آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ زیور کا اسے خاص شوق نہیں تھا۔ شروع سے اس کے گلے اور کانوں میں ڈائمنڈ کا نیکلس اور ٹاپس تھے۔ اس نے انہیں ہی رہنے دیا تھا' وہ کچن میں آگئی۔ تھوڑا پاستا پلیٹ میں نکالا اور صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگی۔ پاستا واقعی مزے کا تھا۔ پاستا بھی ختم ہو گیا تھا۔ ٹی وی دیکھ دیکھ کر بھی وہ بور ہو گئی۔ اب نو بج رہے تھے' وہ ابھی بھی نہیں آیا تھا۔

"کہیں وہ مجھے چھوڑ کر بھاگ تو نہیں گیا۔" اچانک اس خیال کے آتے ہی وہ پریشان ہو کر کھڑی ہو گئی' فون بھی نہیں تھا کہ وہ پتا کر سکتی وہ کہاں ہے۔ اب وہ ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو وہ دروازے کے آگے ہی کھڑی تھی۔

سب سے پہلے ابراہیم اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرالی بیگ تھا۔ اس کے پیچھے ایک لڑکی داخل ہوئی تھی۔

"She is my friend Kathireen
and she is malika"

(یہ میری دوست کیتھرین ہے اور یہ ملائکہ ہے۔)

ابراہیم کے تعارف پر اس نے غور سے ابراہیم کو دیکھا' جو اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ تعارف ایسا ہونا چاہیے تھا۔

"یہ میری بیوی ملائکہ ہے اور یہ کیتھرین ہے' دوست' صرف دوست..." لیکن اس نے کہا' "یہ ملائکہ ہے اور یہ میری دوست..."

اس کے ادھورے تعارف کے باوجود کیتھی بڑے تپاک سے اس سے ملی تھی۔ اس کے گلے ملنے کے بعد اس نے اس کا گال چوما تھا۔ وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ اس کو دیکھ کر کیا ردعمل ظاہر کرے' جب وہ دوبارہ بولی۔

"نائس ٹو میٹ یو۔"

"سیم ہیئر۔" آخر اسے مسکرا کر کہنا پڑا۔

"She is really pretty"

اس کی تعریف پر ابراہیم نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا' جو اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کے دیکھنے پر ملائکہ نے نظریں ہٹا لیں۔ وہ دونوں صوفے پر جا بیٹھے تھے' جبکہ وہ وہیں کھڑی تھی۔ کیتھی نے ہی اسے آواز دے کر بلایا تھا۔ وہ دونوں ٹو سیٹر پر بیٹھے تھے' جبکہ وہ سنگل صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ اس نے کبھی کسی لڑکی کو اتنے غور سے نہیں دیکھا تھا' کیونکہ وہ شروع سے ہی اپنی ذات کے غرور میں مبتلا تھی' لیکن آج کچھ مختلف تھا۔ ایک تو وہ لڑکی خوب صورت تھی' دوسرا اس کی موجودگی میں ابراہیم نے اسے بالکل فراموش کر دیا تھا۔ جو وہ چاہتی تھی اس لحاظ سے تو اچھا تھا کہ وہ اسے اگنور ہی کرے' کیونکہ جب وہ اس کی طرف متوجہ ہوتا تھا تو اسے اچھا نہیں لگتا تھا' لیکن اب جب وہ اسے اگنور کر رہا تھا تو بھی اسے برا لگ رہا تھا۔ وہ دونوں اپنے مگن انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔ اسے پہلی بار اپنے تیار نہ ہونے کا افسوس ہوا تھا۔

ابراہیم نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا جو بہت غور سے کیتھی کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔

ابراہیم کے کھنکارنے پر اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

"اب تم اسے گھورتی ہی رہو گی یا کچھ خاطر تواضع بھی کرو گی۔"

اس کا مطلب تھا وہ مسلسل اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اسے شرمندگی تو بہت ہوئی' لیکن ظاہر کرنا بھی اس کی شان کے خلاف تھا۔

"آپ مجھے نظر لگائیں گی۔" اپنی طرف مسلسل غصے سے دیکھتا پا کر وہ شرارت سے بولا' تو وہ حسب عادت تپ گئی تھی۔

"آپ لوگ اتنے خوب صورت نہیں کہ میں آپ لوگوں کو دیکھوں۔" اس نے ابراہیم سے نظریں ہٹا کر کیتھی کو دیکھا' جو ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا' وہ اردو نہیں سمجھتی۔

"چلو تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں' ورنہ اپنی خوب صورتی پر مجھے کوئی شک نہیں اور کیتھی بھی بلاشبہ بہت خوب صورت ہے۔"

"تو اسے ہی دیکھتے رہیں' منع کس نے کیا ہے۔"

وہ [illegible] کچن میں آگئی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" اس کے یوں اٹھ کر جانے پر کیتھی نے پریشانی سے ابراہیم کو دیکھا تو اس نے مسکرا کر اسے تسلی دی۔

"تم بیٹھو۔ میں آتا ہوں۔" وہ اٹھ کر اس کے پیچھے کچن میں آیا تھا۔

"کیا بنا رہی ہو؟" ملائکہ نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"آپ نے خود تو کہا تھا۔ آپ آتے ہوئے کچھ لے آئیں گے۔" ابراہیم نے ہونٹ سیٹی کے انداز میں سکیڑے تھے۔

"باہر تو بہت سردی ہے۔" اس نے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑتے ہوئے کہا اور کچن سے باہر آگیا۔ اس نے پتا نہیں کیتھی سے کیا کہا تھا' وہ بھی کھڑی ہو گئی۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔"

"نہیں۔ باہر بہت ٹھنڈ ہے۔ تم ملائکہ کے پاس رکو' میں پندرہ منٹ میں آتا ہوں۔" وہ کہہ کر تیزی

سے باہر نکل گیا۔
کیتھی اس کے پاس آگئی۔ وہ اپنے لیے چائے بنا رہی تھی۔

"میں تمہاری کوئی مدد کروں؟" اس کے پوچھنے پر ملائکہ نے مسکرا کر سر نفی میں ہلا دیا۔

"چائے لوگی؟"

"نہیں۔ میں کافی پیتی ہوں۔" ملائکہ اس کے لیے کافی بنانے لگی تو اس نے منع کر دیا۔

"میں خود بنا لوں گی۔" ملائکہ نے بھی اصرار نہیں کیا اور کافی کا جار اور مگ اس کے سامنے رکھ دیے۔

"مجھے تم سے ملنے کا بہت شوق تھا۔" وہ کافی پھینٹتے ہوئے ملائکہ سے کہہ رہی تھی، ملائکہ نے اس کی طرف دیکھا۔

"لاسٹ ٹائم جب ابراہیم لندن گیا تو اس نے تم سے نکاح کے بارے میں بتایا اور وعدہ کیا کہ وہ رخصتی پر ضرور بلائے گا" لیکن میں اور رچرڈ انتظار ہی کرتے رہے۔ کچھ دن پہلے اس نے میل کر کے بتایا کہ شادی ہو گئی۔ رچرڈ تو اس سے ناراض ہے، برا تو مجھے بھی لگا تھا، لیکن میں اس سے ناراض نہیں ہو سکتی۔ اس لیے پاکستان آ گئی۔ سوچا اس سے مل بھی لوں گی اور سرپرائز بھی ہو جائے گا۔"

اس کی چائے بن گئی تھی اور کیتھی کی کافی بھی تیار تھی۔ وہ دونوں ٹی وی لاؤنج میں آ گئیں۔

"آپ ابراہیم کو کب سے جانتی ہیں؟" صرف بات کرنے کے لیے اس نے سرسری انداز میں عام سا سوال کیا تھا۔

"جب ہم اتنے سے تھے۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ "پہلے ابراہیم ہمارے نیکسٹ ڈور میں رہتا تھا، پھر آنٹی کی ڈیتھ کے بعد یہ لوگ شفٹ کر گئے، میں، رچرڈ اور ابراہیم اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں اکٹھے رہے۔ ان فیکٹ ابراہیم مجھے اتنا پسند تھا کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔"

ملائکہ نے چونک کر اسے دیکھا، لیکن وہ اپنے دھیان میں ہی تھی۔

"لیکن میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے تم سے شادی کر لی۔" تب اس نے نظریں اٹھا کر ملائکہ کو دیکھا۔

"ہمارے درمیان بہت بڑا فرق تھا، مذہب کا فرق، مجھے شاید وہ اس لیے انکار کر رہا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس کی خاطر مسلمان ہونے کو بھی تیار ہوں۔"

ملائکہ دم سادھے اسے سن اور دیکھ رہی تھی۔

"لیکن..." ملائکہ نے محسوس کیا، اس کا لہجہ اور آنکھیں دونوں نم ہوئی ہیں، لیکن اگلے ہی پل وہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگی۔

"لیکن اس نے تم سے شادی کر لی اور وہ اپنی کمٹمنٹ کا بہت پکا ہے، مجھے تم سے بہت جلن بھی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے گاڈ سے پوچھا تھا کہ کیا کوئی مجھ سے زیادہ بھی ابراہیم کو چاہ سکتا ہے، کیا وہ لڑکی مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے۔ تب سے مجھے تمہیں دیکھنے کا شوق تھا۔ میں نے کئی بار ابراہیم سے کہا کہ مجھے تمہاری تصویر بھیجے، لیکن ہر بار وہ ٹال جاتا تھا۔ صرف تمہیں دیکھنے کے لیے یہاں تک آئی اور میں نے دیکھا۔ تم واقعی بہت خوب صورت ہو، لیکن یہاں بات خوب صورتی کی نہیں، محبت کی شدت کی ہے، مجھے لگتا ہے ابراہیم کی محبت تمہارے لیے میری محبت سے زیادہ ہے، جو اسے میری محبت نظر نہیں آئی۔"

اس نے کافی کے مگ کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

ملائکہ کو اپنے کانوں سے دھواں نکلتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے کانوں نے جو سنا اس کا دماغ ان لفظوں کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ اسے یوں ساکت دیکھ کر کیتھی کو اپنے لفظوں کا احساس ہوا تھا۔

"تمہیں شاید برا لگا، لیکن یہ صرف میری فیلنگز تھیں، ابراہیم کی نہیں۔ ڈونٹ وری، میں ابراہیم سے صرف دوست کی حیثیت سے ملنے آئی ہوں اور پلیز، تم ابراہیم سے کوئی بات مت کرنا، ورنہ وہ مجھ سے ناراض ہو جائے گا اور میں اس کی ناراضی برداشت نہیں

کر سکتی۔"

ملائکہ نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔ دروازے کا لاک کھلا تھا جس کا مطلب تھا، وہ آ گیا ہے۔ کچن میں جاتے ہوئے اس نے ملائکہ کو بھی آواز دی تھی۔ اس کا لال اور قد، وہ دونوں بوجھل ہو گئے تھے۔

اس کی لائی ہوئی چیزیں وہ ڈشوں میں ڈال رہی تھی، وہ سب چائنیز فوڈ تھے۔ دونوں کے قہقہے اسے کچن میں سنائی دے رہے تھے۔

"یہاں تو وانت ہی اندر نہیں جا رہا ہے، موصوف کے۔" وہ وانت کچکچا کر بولی۔ ڈائننگ ٹیبل تو تھی ہی نہیں، اس نے سب چیزیں لے کر صوفوں کے درمیان میں پڑی ٹیبل پر رکھ دیں۔

"او مائی گاڈ! ابراہیم، تمہیں یاد تھا، مجھے کیا کیا پسند ہے؟"

"اس میں بھولنے والی کیا بات تھی۔" وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا اور نہ چاہتے ہوئے وہ پھر اپنا موازنہ کیتھی کے ساتھ کرنے لگی۔

وہ یقین سے کہہ سکتی تھی کہ ابراہیم نہیں جانتا ہوگا اسے کھانے میں کیا پسند ہے۔ وہ یہ بات جانتی تھی، اسے یہ خیال کیوں آیا تھا۔

وہ چپ چاپ پلیٹ گود میں رکھے انہیں دیکھ اور سن رہی تھی، وہ ایسے باتوں میں مگن تھے جیسے کوئی تیسرا وہاں موجود ہی نہ ہو۔

"تمہیں کم از کم بتانا تو چاہیے تھا کہ تم لاہور میں نہیں۔"

"اور تمہیں پاکستان آنے سے پہلے بتانا چاہیے تھا۔"

"میں تمہیں سرپرائز دینا چاہ رہی تھی۔ گھر کا ایڈریس تھا میرے پاس۔ وہاں پہنچی تو پتا چلا گھر پہ کوئی نہیں، تمہیں فون کیا، ٹکٹ کنفرم کروائی اور پھر یہاں۔" وہ مسکرا کر تفصیل بتا رہی تھی۔

"تم کسی ہوٹل میں کیوں نہیں ٹھہرے؟"

بس ایسے ہی، تھوڑا چینج کا موڈ تھا اور ملائکہ کا موڈ تھا ہم دونوں کچھ دن اکیلے ساتھ ساتھ رہیں۔" اس

نے ایک بار پھر بات کرتے ہوئے شرارت سے اسے دیکھا۔ تو اس نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

"تم دونوں میں بہت پیار لگتا ہے۔"

کیتھی کی بات پر ابراہیم نے قہقہہ لگایا تھا جبکہ وہ پہلو بدل کر رہ گئی۔

"ابراہیم! مجھے کسی ہوٹل میں ڈراپ کر دو۔"

"وہ تو میں کروں گا، لیکن سوری کیتھی! یہاں صرف ایک ہی بیڈ روم ہے اور وہ بھی ہم یہاں کمفرٹیبل (آرام دہ) فیل نہیں کر رہے۔ اس لیے میں تمہیں یہاں Stay (قیام) کرنے کو بھی نہیں کہہ سکتا۔"

"اس کے آرام کا کتنا خیال ہے اور میں جو یہاں بے آرام ہو رہی ہوں۔" اس نے تفصیلی نظروں سے دونوں کو گھورا۔

"میرا خیال ہے، ملائکہ زیادہ باتیں نہیں کرتی۔"

"اس کو نہ ہی چھیڑا جائے تو اچھا ہے۔" یہ بات اس نے اردو میں کہی تھی، جس کا مقصد صرف ملائکہ کو ستانا تھا۔

"کیا کہا تم نے؟"

"کچھ نہیں، چلو، تمہیں چھوڑ دوں۔"

"ملائکہ! تم بھی چلو۔" وہ ملائکہ سے کہہ رہی تھی۔

"تو اس او کے، آپ جاؤ۔"

"او کے، تو پھر کل ملاقات ہوگی۔"

"ابراہیم! مجھے کل شاپنگ بھی کرنی ہے۔" وہ اس کے ساتھ جاتے ہوئے اسے کہہ رہی تھی۔

باہر نکلتے ہی دروازہ لاک ہو گیا تھا اور وہ ایک بار پھر قید ہو گئی تھی۔

دو گھنٹے بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔ اس کو غصہ تو بہت تھا، لیکن وہ خاموشی سے ٹی وی دیکھتی رہی، حتیٰ کہ وہ اس کے سامنے صوفے پر آ کر بیٹھ گیا، لیکن اس نے اسکرین سے نظریں ہٹا کر اسے نہیں دیکھا تھا۔ جوتے اتارنے کے بعد اس نے صوفے سے ٹیک لگا کر اسے دیکھا اور کتنی ہی دیر دیکھتا رہا، حتیٰ کہ اسے ہی اس کی

نظروں سے الجھن ہونے لگی۔ اس نے ٹانگیں سیدھی کر کے مخمل پر رکھ لیں۔ اس کے اٹھنے کا ارادہ دیکھ کر وہ بول پڑا۔
"تمہیں کیتھی کیسی لگی؟"
"آپ کی دوست ہے، آپ کو اچھی لگتی ہے، کیا یہ کافی نہیں؟" ابراہیم نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا اور سر ہلایا جیسے اس کی بات سے اتفاق کر رہا ہو۔
"ٹھیک کہا۔ واقعی وہ مجھے اچھی لگتی ہے۔ کافی ہے۔"
ملائکہ نے غصے سے اسے دیکھا، جو مزید ریلیکس ہو کر بیٹھ گیا تھا۔
"میں کل کیتھی کے ساتھ شاپنگ کے لیے جا رہا ہوں، تم چلو گی؟"
"مجھے کوئی ضرورت نہیں کباب میں ہڈی بننے کی۔ اس نے آپ کو کہا شاپنگ کروانے کو، مجھے انوائیٹ نہیں کیا، ویسے تو آپ کو گوارا نہیں، مجھے جیل سے رہائی لے تو پھر کیوں شاپنگ کی آفر کر رہے ہیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔
"کباب میں ہڈی کا کیا مطلب ہے؟"
اس کے پوچھنے پر اس نے غصے میں ریموٹ مخمل پر پھینکا اور جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ ابھی وہ تین قدم چلی تھی جب اس کا ہاتھ اس کی گرفت میں تھا۔ ایک جھٹکا لگا تھا، اسے سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا اور وہ اس کی گود میں تھی اور اس کے گرتے ہی اس کے گرد بازوؤں کا حلقہ سخت ہو گیا تھا۔
"یہ کیا بدتمیزی ہے؟"
"یہ تمہیں بدتمیزی لگ رہی ہے، خود ہی تو گری ہو۔" اس نے پورا زور لگا کر خود کو چھڑانا چاہا تھا لیکن ناکام رہی تھی جبکہ وہ پوری محویت سے اس کے سرخ چہرے کو دیکھ رہا تھا۔
"چھوڑیں مجھے۔" ناکام ہو کر اس نے اپنی کوشش ترک کر دی تھی۔
"تم ہر وقت چھوڑنے کی بات کیوں کرتی ہو؟" اس کی ذومعنی بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

اس نے غصے سے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔
"تم یوں میرے اتنے قریب بیٹھی ہو، کیا بتاؤں مجھے کتنا اچھا لگ رہا ہے۔" بازو کا حلقہ کچھ اور سخت ہو گیا تھا۔
ملائکہ نے ذرا سی گردن گھما کر اسے دیکھا۔ "اگر آپ نے مجھے نہ چھوڑا تو میں آپ کو کاٹ لوں گی۔"
"اچھا!" اس کی دھمکی سن کر وہ کافی محظوظ ہوا تھا۔ "چلو تمہاری خوشی اسی میں ہے تو یہی سہی، کہاں کاٹو گی؟"
ملائکہ کا بس نہیں چل رہا تھا کیا کر ڈالے، اس نے بڑے زور سے مکا اس کے کندھے پر مارا، لیکن الٹا اپنا ہاتھ ہی دکھ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے اثرات دیکھ کر اس نے ایک ہاتھ اس کے گرد سے ہٹا کر اس کا ہاتھ مٹھی میں دبا لیا۔
"جب میں تمہیں چھوڑ کر گیا تھا تب تو تم نارمل تھیں، پیچھے سے کیا کوئی بھوت دیکھ لیا۔ ہماری دوستی ہو گئی تھی، تمہیں یاد ہے یا میں یاد کراؤں؟"
اس نے کیتھی کے چکر میں وہ بھول گئی تھی، یہاں سے نکلنے کے لیے اس نے کس طرح اپنی انا کو پس پشت ڈال کر اس سے معافی مانگی تھی۔ ابراہیم غور سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔
"ہم لاہور واپس کب جا رہے ہیں؟"
"جب تم کہو۔" ملائکہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔
"کل۔"
"کل تو ممکن نہیں، کیتھی کو سیر بھی تو کروانی ہے اور چار دنوں تک پاپا اور انکل بھی آ جائیں گے۔"
"انہوں نے ایک بار بھی فون نہیں کیا۔"
"ان کا فون تو روز آتا ہے۔" اب کے ملائکہ کی حیرت حد سے زیادہ تھی۔
"انہوں نے میرا نہیں پوچھا؟"
"روز پوچھتے ہیں۔" وہ پرسکون انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بول رہا تھا۔ "میں نے خود تم سے بات نہیں کروائی، مجھے پتا تھا کہ کسی ایک سے بھی بات ہو گئی تو تم تو گئیں میرے ہاتھ سے۔"

ملائکہ کو شدید غصہ آیا تھا، وہ ایک جھٹکے سے خود کو اس کے حلقے سے آزاد کر کے بولی تھی۔ "آپ کیا سمجھتے ہیں، آپ ساری عمر مجھے یہاں قید کر کے رکھ سکتے ہیں۔ چار دن بعد ڈیڈی، چاچو واپس آ جائیں گے پھر دیکھنا میں کیا کرتی ہوں۔"
غصے سے اس کی آواز کانپنے لگی تھی۔
"بس یہی سننا چاہتا تھا میں۔" وہ اٹھ کر اس کے مقابل آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ "صبح معافی مانگنے کا جو ڈھونگ تم نے کیا تھا، تم کو کیا لگتا ہے، مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ ڈراما کیوں ہو رہا ہے۔ مسز ملائکہ بلکہ گریٹ مسز ملائکہ کسی سے معافی مانگیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اب تم دیکھتی جاؤ میں تمہارے ساتھ کیا کرتا ہوں۔"
وہ دھمکی دے کر اندر چلا گیا تھا جبکہ وہ مٹھیاں بھینچے کتنی دیر یوں ہی کھڑی رہی۔ صبح سے اب تک وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ اس نے ابراہیم کو قائل کر لیا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ الٹا وہ اسے سمجھا رہا ہے۔ اسے اندر گئے پندرہ منٹ ہو گئے تھے۔ اور وہ جانتی تھی کہ وہ باہر نہیں آئے گا۔ اسے ہی اندر جانا ہوگا، جب وہ اندر داخل ہوئی تو وہ جائے نماز بچھائے نیت باندھ رہا تھا۔
وہ بیڈ پر جا کر بیٹھ گئی اور اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی، منہ پر ہاتھ پھیر کر اس نے جائے نماز تہہ کی تو وہ بول پڑی۔
"آپ ایک منافق انسان ہیں۔" وہ جو جائے نماز رکھنے لگا تھا ایک دم پلٹا۔
"جو انسان جھوٹ بولتا ہو اور دھوکے سے کسی کو قید کرے، کسی مجبور انسان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے تنگ کرے، اسے آپ مسلمان تو نہیں کہہ سکتے۔ آپ کو کیا لگتا ہے، آپ کی یہ نمازیں قبول ہوں گی۔"
وہ شروع سے جذباتی تھی، جو منہ میں آتا تھا وہ کہہ دیتی تھی، یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ ابراہیم کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور جب وہ بولا تو اس کا لہجہ بھی دہکتا ہوا تھا۔
"اپنے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ تم مسلمان کہلانے کے لائق ہو؟ اس کا انداز ایسا لگتا ہے کہ تم مسلمان ہو، صرف اس لیے کہ تم مسلمان کے گھر پیدا ہوئی ہو۔ میں نے تمہیں کبھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔ لباس بھی تم نے اپنا دیکھا ہے، جس میں پردہ نام کو نہیں۔"
"آپ!"
"شٹ اپ! میری بات سنو۔ کون سا جھوٹ بولا ہے میں نے تم سے، کون سا دھوکہ دیا ہے میں نے تم کو، دھوکہ تو تم نے دیا ہے۔" وہ درمیان کا فاصلہ سمیٹ کر اس کے سامنے آ گیا۔
"اس چہرے نے دھوکہ دیا ہے مجھے۔" اس نے دائیں ہاتھ میں اس کا چہرہ پکڑا تھا۔ "اس معصوم چہرے کے پیچھے کتنا مکار دماغ ہے کوئی مجھ سے پوچھے۔"
ملائکہ نے اس کی کلائی کو پکڑ کر جھٹکا دیا تو اس نے چہرہ چھوڑ کر اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا۔
"تم خود کو مجبور کہتی ہو، مجبور تو میں تھا۔ تم جانتی تھیں میں بابا سے کتنا پیار کرتا ہوں۔ تم جانتی تھیں بابا تمہیں کتنا پسند کرتے ہیں۔ تم خود مسلمان ہوتی ہو جو کسی کے نکاح میں ہو اور کسی اور کے خواب دیکھتی ہو۔"
اس نے غصے سے اسے دھکا دیا، وہ لہرا کر بیڈ پر گری تھی لیکن اگلے ہی پل وہ تڑپ کر اٹھی تھی۔
"مجھ پر الزام لگانے سے پہلے آپ اپنے گریبان میں منہ ڈالیں۔ میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا۔ میں آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اور یہ جو آپ کی سہیلی لندن سے آپ کی محبت میں یہاں تک آ گئی ہے اسے کیا کہیں گے۔ اس نے خود کہا ہے وہ آپ سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ آپ کے لیے مسلمان ہونے کو تیار تھی۔ وہ اس حد تک آ گئی کوئی تو وجہ ہوگی۔ مجھ سے باتیں کر رہے ہیں۔ خود پتا نہیں کتنا منہ کالا کر چکے ہیں۔"
"ملائکہ!" وہ اتنی زور سے چیخا کہ وہ اپنی جگہ سے ہل کر رہ گئی۔ "اب اگر تم نے ایک لفظ بھی بکواس کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

"آپ سے برا کوئی ہو بھی نہیں سکتا اور میں ایک دفعہ نہیں ہزار دفعہ کہوں گی آئی ہیٹ یو۔"

آگے کا لفظ اس کے منہ میں ہی رہ گیا۔ اتنا بھاری ہاتھ اس کے بائیں گال پر پڑا تھا کہ وہ اوندھے منہ بیڈ پر گری تھی۔ کتنے لمحوں کے لیے تو وہ ہل ہی نہیں سکی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس نے بڑی بے دردی سے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا اور اپنے مقابل کھڑا کیا۔

"یہ تو مجھے کچھ عرصے میں اندازہ ہو گیا تھا کہ تمہیں تمیز بالکل نہیں۔ بے جا لاڈ پیار نے تمہیں خراب کر دیا ہے لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ زبان کے ساتھ تمہاری سوچ بھی اتنی گندی ہے۔ میں کیا ہوں میرا کردار کیا ہے۔ میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"

وہ بالکل ساکت کھڑی اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ جو نیلی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑے لفظوں کی آگ برسا رہا تھا۔

"اس میں ایک آزاد سوچ والے ملک میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا لیکن میری تربیت ایک عورت اور نیک عورت نے کی۔ میری ماں عیسائی تھی لیکن جب وہ مسلمان ہوئی تو دل سے ہوئی۔ اس نے مجھے بتایا۔ اللہ کیا ہے۔ اللہ کو کیا پسند ہے۔ کیا ناپسند؟ کیا چیز جنت میں لے کر جاتی ہے اور کیا چیز دوزخ کی طرف۔ میرے ملک میں عورت کی وہ عزت نہیں جو اسلام نے عورت کو دی۔ میری ماں نے مجھے عورت کی عزت کرنا سکھایا جیسی میری ماں تھی۔ ان کو دیکھ کر عورت کی عزت کرنے کو دل کرتا تھا۔ دوسری عورت جس کو میں جانتا ہوں وہ کیتھی ہے۔ بے شک وہ عیسائی ہے۔ لیکن بہت سی لڑکیوں سے بہتر ہے۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے انکار کر دیا اور اب میں پچھتا رہا تھا میں نے ایسا کیوں کیا۔"

کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں سن ہو گئی تھیں لیکن اس میں حرکت کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

"بابا نے مجھ سے کہا ملائکہ میرا خون ہے ملائکہ کا خیر اس نیک مٹی سے اٹھا ہے نیک ماں کی گود میں اس نے پرورش پائی ہے۔ میں نے ساری زندگی صاف ستھری گزاری۔ میں نے سوچا میری بیوی بھی میری جیسی ہوگی لیکن میری بیوی نکاح کے بعد کہتی ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ تم اندازہ کر سکتی ہو اس تکلیف کا۔" اس کی انگلیاں اس کے بازو میں کھب گئی تھیں۔ درد کے احساس نے اس کی آنکھیں نم کر دی تھیں۔

"تم مجھ سے ڈائیورس لینا چاہتی ہو۔ مجھے بھی تمہیں ساتھ رکھنے کا کوئی شوق نہیں۔ میں بابا کی وجہ سے مجبور ہوں۔ انہیں تم میں کوئی غلطی نظر نہیں آتی۔ سب کو تم سے پیار ہے کوئی نہیں چاہتا۔ تمہیں تکلیف ہو لیکن تم اتنی خود پسند ہو کہ تمہیں اپنے علاوہ کوئی نظر نہیں آتا۔ میں تمہیں ضرور آزاد کروں گا۔ لیکن تب جب تمہارا غرور، تمہاری اکڑ ٹوٹ کر میرے قدموں میں گرے گی۔ سمجھ میں آیا۔"

آخری دو لفظ اس نے اس کی آنکھوں میں بغور دیکھتے ہوئے کہے اور اس کے بازو سے ہاتھ ہٹائے اور وہ کٹی ہوئی شاخ کی طرح زمین پر گری تھی۔ ابراہیم نے اسے گرتے دیکھا تھا لیکن وہ اسے اٹھانے کے لیے نہیں مڑا تھا۔ اس کا دایاں گال بری طرح سلگ رہا تھا لیکن وہ روئی نہیں تھی۔ اس تھپڑ سے زیادہ اس کے لفظوں نے اس کے احساسات منجمد کر دیے تھے۔

کبھی کسی نے اس سے سخت الفاظ میں بات نہیں کی تھی لیکن اس نے نہ صرف اس سے نفرت کا اظہار کیا تھا بلکہ تھپڑ مار کر اس نفرت کا مظاہرہ بھی کر دیا تھا۔

کمرے سے باہر نکل کر کتنی ہی دیر وہ غائب دماغی سے لاؤنج کی دیواروں کو دیکھتا رہا اور پھر گھر سے ہی باہر نکل گیا۔

رات کا ایک بج رہا تھا۔ بادلوں نے آسمان کو ڈھک رکھا تھا۔ بارش کی وجہ سے موسم کافی سرد تھا اور وہ سویٹر سے بے نیاز سنسان سڑک پر چلتا جا رہا تھا۔ اس کو اتنا غصہ تھا کہ باہر کا موسم بھی اس پر اثر انداز نہیں ہو رہا تھا۔ آج تو اس نے حد ہی کر دی۔ سیدھا اس کے

کردار پر ہی حملہ کر دیا تھا۔ "میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔"

سردی اب اتنی بڑھ گئی تھی کہ ناک سے پانی نکلنے لگا تھا تب ہی اس کا موبائل بج اٹھا تھا۔ اس نے جیب سے موبائل نکالا اسکرین پر نظر آنے والا نمبر سعودیہ کا تھا۔ اس نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔

"ہیلو ابراہیم!" دوسری طرف فیروز صاحب تھے۔

"السلام علیکم بابا!"

"وعلیکم السلام۔ جیتے رہو۔"

"کیسے ہو؟ ملائکہ کیسی ہے؟"

"سب ٹھیک ہے بابا!"

"تمہاری آواز کیوں بھاری ہو رہی ہے۔"

"سردی کی وجہ سے۔" اب تو اسے لگ رہا تھا اس کی آواز بھی کانپ رہی ہے۔ "آپ کب آ رہے ہیں؟"

"پرسوں کی فلائٹ ہے۔ آج کتنے دن ہو گئے ہیں ابراہیم ملائکہ سے بات نہیں ہوئی۔ اس سے تو بات کرواؤ۔"

"بابا! وہ سو رہی ہے۔" دوسری طرف کچھ لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ "بابا! میں کل آپ کی بات کرواؤں گا۔"

"تم روز ایسا ہی کہتے ہو۔ جعفر بھائی بھی پریشان ہیں۔ صرف علی سے ہی وہ بات کرتی ہے۔"

"بابا! پریشانی والی کیا بات ہے۔ پرسوں آپ آ ہی رہے ہیں ویسے میں کل بات کرواؤں گا۔"

"چلو ٹھیک ہے اب تم بھی سو جاؤ، پاکستان میں بھی تین بج رہے ہیں۔"

"جی!" اس نے اللہ حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ غصہ ٹھنڈا ہوا تو دماغ نے بھی کام کرنا شروع کر دیا۔ اسے ایک دم احساس ہوا کہ اسے گھر سے نکلے بھی دو گھنٹے ہو چکے ہیں۔ جس طرح کی وہ جذباتی ہے اور جس طرح کی حالت میں وہ اسے چھوڑ کر آیا ہے وہ کچھ بھی کر سکتی ہے وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا گھر کی طرف بڑھنے لگا آدھے گھنٹے کا راستہ اس نے پندرہ منٹ میں طے کیا تھا گھر پہنچنے تک اس کا سانس پھول گیا تھا۔ لاک کھول کر اندر داخل ہوا تو لاؤنج کی لائٹ جل رہی تھی۔

اس نے ڈرتے ڈرتے بیڈ روم کا دروازہ کھولا۔ اندر ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی اس نے اطمینان بھرا سانس لیا اور چلتا ہوا بیڈ کے قریب آ گیا۔ جہاں وہ سکڑی سمٹی لیٹی تھی۔ کمبل بھی اس کے اوپر نہیں تھا۔ وہ اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ سائیڈ لیمپ آن کیا تو منظر کچھ اور واضح ہو گیا وہ کروٹ کے بل لیٹی تھی۔ بالوں نے اس کے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس نے آہستگی سے ہاتھ اس کے بالوں کی طرف بڑھایا اور بہت نرمی کے ساتھ بال پیچھے کیے۔ اس کے سفید گال پر چار انگلیوں کے نشان بہت واضح تھے۔ اس کا دایاں ہاتھ خود بخود مٹھی کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر وہ اس کے اوپر جھکا تھا لیکن پھر ایک دم سیدھا ہو گیا۔ کمبل اس کے اوپر ڈالا اور لائٹ آف کر کے خود دوسری طرف کروٹ لے لی۔

☆ ☆ ☆

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو نو بج رہے تھے۔ اس نے بے اختیار موبائل اٹھا کر دیکھا۔ وہ الارم لگانا بھول گیا تھا۔ ایک الارم نہ لگانے اور دوسرا دیر سے سونے کی وجہ سے اس کی فجر کی نماز قضا ہو گئی تھی۔ اس نے افسوس سے گہرا سانس لیا اور بے دھیانی سے چھت کو دیکھنے لگا پھر جیسے چونک کر دائیں طرف دیکھا وہ اب بھی سو رہی تھی۔

وہ کتنی ہی دیر اسے دیکھتا رہا پھر ایک دم کل کی باتیں یاد آئیں تو اس نے نظروں کے ساتھ رخ بھی پھیر لیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

باتھ لے کر جب وہ باہر نکلا تو وہ تب بھی سو رہی تھی وہ کچن میں آ گیا۔ ٹرے میں دو فرائی انڈے، چار سلائس، ایک جگ جوس۔ دو گلاس رکھے اور جب وہ اندر داخل ہوا تو وہ اٹھ چکی تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے دوبارہ کمبل کو کھینچنا شروع کر دیا۔

وہ جا کر اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھ گیا اور اپنے اور اس کے درمیان ٹرے رکھ دی۔ اس نے ایک بار بھی ابراہیم کی طرف نہیں دیکھا جبکہ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، اس نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر ناشتے پر مرکوز کیں۔ اس نے آدھا ناشتا بھی کر لیا تھا لیکن وہ اسی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھی۔

"ناشتا کر لو۔" آخر کار اسے کہنا ہی پڑا لیکن وہ اسی طرح ساکت بیٹھی رہی۔ اس نے ناشتہ ختم کر لیا تھا۔ جوس کا آخری گھونٹ لے کر اس نے دوبارہ اسے کہا۔

"ملائکہ! ناشتا کر لو۔" لیکن پہلے کی طرح کوئی رسپانس نہیں ملا تھا۔

جتنے عرصے سے وہ اسے جانتا تھا اس نے اسے ضدی ہی پایا تھا۔

"تم اتنی ضدی کیوں ہو؟" اس نے کچھ جھنجلا کر کہا تھا اور ٹرے اٹھا کر باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے قریب کھڑے ہو کر موبائل اس کی طرف بڑھایا تھا۔ اس کی بے ساختہ سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں۔

"علی کا فون ہے۔" اس نے جھپٹنے کے انداز میں فون پکڑا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ اچانک زندہ ہو گئی ہو۔

"ہیلو بجو! کیسی ہو؟" کتنی دیر بعد کسی اپنے کی آواز سنی تھی۔ "بجو آپ سن رہی ہو؟" اس کی مسلسل خاموشی پر وہ زور سے بولا۔

"آ گئی تمہیں میری یاد۔ کسی نے پتا کرنے کی کوشش کی۔ میں زندہ ہوں یا مر گئی ہوں۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو بجو! اللہ نہ کرے۔ تمہیں کچھ ہو۔"

"کہاں ہیں ڈیڈی مما! انہوں نے ایک دفعہ بھی مجھے فون نہیں کیا۔ وہ مجھے بھول گئے ہیں۔"

"ایسا ہو سکتا ہے بجو کہ ڈیڈی اور مما تمہیں بھول جائیں۔ وہ جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں، پہلی دعا تمہارے لیے مانگتے ہیں۔"

اب کی بار وہ کچھ نہیں بولی تھی بس آنسوؤں میں روانی آ گئی تھی۔

"ہم تمہیں بھولے نہیں تھے۔ روز ابراہیم بھائی سے بات ہوتی تھی۔ ہمیں تسلی تھی ابراہیم بھائی تمہارے ساتھ ہیں اور ہم سے زیادہ تمہارا خیال رکھتے ہوں گے۔" اس کی نظریں بے ساختہ سامنے اٹھیں جہاں وہ دونوں ہاتھ ٹراؤزر کی جیبوں میں ڈالے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ڈیڈی کہاں ہیں؟" اس نے اس پر سے نظریں ہٹا کر علی سے پوچھا۔

"ڈیڈی، مما، چاچو نماز پڑھنے گئے ہیں۔ میں بھی بس جا رہا تھا کہ ابراہیم بھائی کا فون آ گیا۔"

"تم کب آ رہے ہو؟"

"کل آ رہے ہیں۔ تب تک تم بھی لاہور پہنچ جاؤ گی۔"

"اچھا نہیں۔" وہ مایوسی سے بولی۔

"ابراہیم بھائی کو فون دو۔" اس نے منہ دوسری طرف پھیر کر موبائل والا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ فون لے کر اس نے کان سے لگایا۔

"علی! ابھی کوئی بات نہیں... وہ اداس ہے۔ بس..." وہ بات کرتے کرتے باہر نکل گیا جبکہ وہ دوبارہ لیٹ گئی۔ علی سے بات کر کے اسے کافی سکون ملا تھا۔

"صرف کل تک کی بات ہے۔" اس نے خود کو تسلی دی تھی۔

اسے یونہی لیٹے کافی دیر گزر گئی تھی جب اس نے ابراہیم کی آواز کے ساتھ کیتھی کی آواز سنی تھی۔

"یہ کب آئی؟" وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی اور گھورنے کے انداز میں دروازے کو دیکھنے لگی۔ اب باتوں کے ساتھ قہقہوں کی آواز بھی آ رہی تھی۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ اس کو ایک دم شدید بھوک کا احساس ہوا۔ کمزوری کی وجہ سے چکر الگ آ رہے تھے۔ وہ بڑی مشکل سے چکراتے سر کے ساتھ اٹھی۔ بھوک کے علاوہ کوئی احساس تھا جو اسے باہر جانے کے لیے اکسا رہا تھا۔ چادر کو اپنے ارد گرد اچھی طرح لپیٹ کر وہ باہر آئی

تھی۔ وہ دونوں بالکل سامنے بیٹھے تھے۔ اس پر دونوں کی نظر ایک ساتھ پڑی تھی اور اس کو دیکھتے ہی وہ دونوں خاموش ہو گئے تھے۔ سب سے پہلے کیتھی مسکراتی ہوئی اس کی طرف آئی تھی۔

"کیسی ہو ملائکہ؟ ابراہام نے بتایا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے کہہ رہی تھی۔

ملائکہ کا اس کی شکل بھی دیکھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ جبراً بھی نہیں مسکرا سکی۔ بہت آہستگی سے اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے الگ کیا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" روکھائی سے کہہ کر وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔ کیتھی نے حیرت سے ابراہیم کی طرف دیکھا۔ وہ کچن کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں وہ گئی تھی۔ کیتھی اس کے پیچھے گئی تھی۔

"ملائکہ! میں تمہاری ہیلپ کروں۔"

"نو تھینکس۔ میں اپنا کام کر سکتی ہوں۔" وہ اپنے لیے چائے کا پانی رکھتے ہوئے روکھائی سے بولی۔

"کیتھی! تم ادھر آؤ۔" ابراہیم کی آواز پر وہ ایک حیران اور پریشان نظر اس پر ڈال کر ابراہیم کی طرف گئی۔

"کیا ملائکہ مجھ سے ناراض ہے؟" کیتھی کی آواز اس نے صاف سنی تھی۔

"چھوڑو اسے، وہ ایسی ہی ہے آدم بیزار۔" ابراہیم کی بات پر اس نے غصے سے فرائی پین چولہے پر رکھا تھا۔ آئل ڈال کر وہ پلیٹ لینے کے لیے مڑی تو اسے جلنے کی بو آئی تھی۔ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پیچھے مڑی تو آگ اس کے پیچھے سے نکل رہی تھی۔ وہ بری طرح چیخنے لگی تھی۔ وہ دونوں اس کے بارے میں ہی بات کر رہے تھے چیخ سن کر کچن کی طرف بھاگے۔ اس کی چادر میں آگ لگی تھی۔ گھبراہٹ میں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کیا کرے۔ ابراہیم نے ایک دم آگے بڑھ کر اس کی چادر کھینچی تھی۔ اب وہ جوتے سے آگ بجھا رہا تھا۔

آگ بجھانے کے بعد اس نے ملائکہ کی طرف دیکھا جو خوف زدہ نظروں سے اپنی چادر کی راکھ دیکھ رہی تھی۔ اس کا جسم ہلکے ہلکے کانپ رہا تھا۔ ابراہیم نے بے اختیار آگے جا کر اسے ساتھ لگا لیا۔ اس کے خوف میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسی طرح کانپ رہی تھی۔ "تم ٹھیک ہو؟" ابراہیم نے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور کتنی دیر غائب دماغی سے اسے دیکھتی رہی پھر ایک دم اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے دھکا دیا۔

"ہاتھ مت لگائیں مجھے، نہ میرے قریب آئیں۔ نفرت ہے مجھے آپ سے۔"

وہ کہہ کر بھاگنے کے انداز میں کمرے کی طرف بڑھی تھی۔ ابراہیم کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے تھے۔ کیتھی نے پریشانی سے ابراہیم کی طرف دیکھا۔ ملائکہ نے جو کچھ کہا تھا وہ اردو میں تھا۔ وہ کچھ تو نہیں سکی لیکن اتنا سمجھ گئی تھی۔ اس نے کچھ ایسا کہا ہے جو اسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ وہ خاموشی سے چلتا ہوا صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

کیتھی کچھ دیر کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر چل کر اس کے قریب بیٹھی۔ اس کے قریب بیٹھنے پر بھی وہ یونہی بیٹھا رہا تو اس نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے متوجہ کیا۔

"کیا بات ہے ابراہام! ملائکہ کیوں اپ سیٹ ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنی بند مٹھی کو دیکھ رہا تھا۔

"ابراہام!" اب اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا چہرہ اپنی طرف موڑا تھا۔ "کیا ہوا ہے؟" اس کے پوچھنے پر وہ پھٹ پڑا تھا۔

"عذاب مول لے لیا ہے میں نے اس سے شادی کر کے۔ مجھے تکلیف دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔"

"ابراہام! تم اس سے محبت کرتے تھے؟" کیتھی حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

"محبت!" وہ جو کہہ رہا تھا ایک دم چپ ہوا تب ہی اس نے دروازے میں ملائکہ کی جھلک دیکھی تھی۔ "محبت کا لفظ بھی اس کے لیے استعمال کرنا محبت کی توہین ہو گا۔" وہ

ایک عذاب ہے۔ جو پاپا کے کہنے پر میں نے اپنی زندگی میں داخل کر لیا۔ پاپا کے کہنے پر میں نے اس سے شادی کی اور اب تک پاپا کی وجہ سے یہ رشتہ سنبھالنے کے لیے مجبور ہوں اگر پاپا نہ ہوتے تو کب کا اسے اپنی زندگی سے نکال چکا ہوتا۔"

اور ملائکہ جو چائے لینے کے لیے باہر نکلنے والی تھی اس کی باتیں سن کر وہیں ساکت ہو گئی تھی۔ کسی سے نفرت کرنا کتنا آسان ہوتا ہے لیکن اپنے لیے کسی کی نفرت سہنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔

"میں تو سمجھتی رہی تم اپنی میرڈ لائف سے بہت خوش ہو۔" کیتھی سر جھکائے دھیمی آواز میں بولی۔

ابراہیم نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔ "کبھی کبھی مجھے لگتا ہے، مجھے تمہاری بددعا لگی ہے کیونکہ میں نے تمہاری سچی محبت کی قدر نہیں کی تھی۔"

کیتھی اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔ "ایسا کبھی مت سوچنا ابراہیم! میں تمہیں بددعائیں دوں گی۔ میں تو آج بھی تم سے اتنی محبت کرتی ہوں کہ تمہاری خوشی کی دعا کرتی ہوں۔" وہ کچھ نہیں بولا تھا۔

ملائکہ نے دیوار سے ٹیک لگا لی۔

"پھر تم نے کیا سوچا ہے؟" کچھ دیر بعد اس نے کیتھی کو کہتے سنا تھا۔

"کیا سوچنا ہے۔ اس نے مجھ سے ڈائیورس مانگی ہے اور میں اسے دوں گا۔ میں زبردستی کا قائل نہیں۔ یہ رشتہ چاہت کا ہے اور وہ ہمارے درمیان نہیں۔"

"ابراہیم! کیا تمہاری زندگی میں میرے لیے کوئی جگہ ہے؟"

کیتھی کے سوال پر ملائکہ کی ساری حسیات الرٹ ہو گئی تھیں۔ ابراہیم نے ایک نظر سامنے دروازے کو دیکھ کر کیتھی کو دیکھا۔

"تم ہمیشہ سے میرے لیے بہت اہم رہی ہو کیتھی! چاہے ایک دوست کی حیثیت سے سہی۔ تم بے شک ایک آئیڈیل لڑکی ہو میں ابھی تک خود کو اس صدمے سے باہر محسوس نہیں کر پایا لیکن میں جب بھی شادی کے بارے میں سوچوں گا تو وہ لڑکی تم ہی ہو گی۔"

"آئی لو یو ابراہیم!" کچھ دیر بعد اس نے کیتھی کی خوشی سے بھرپور آواز سنی تھی۔ ابراہیم کی آواز نہیں آئی تھی۔

"چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔" کچھ دیر بعد اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی تو ایک دم باہر نکلی تھی۔

✡ ✡ ✡

گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تھی۔ کیتھی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا ہوا؟" اس نے کوئی جواب دیے بغیر گاڑی واپس موڑی تھی۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے اندیشے کے عین مطابق دروازہ کھلا تھا اور وہ اندر موجود نہیں تھی۔ اس نے بے اختیار اپنا دایاں ہاتھ دیوار پر دے مارا۔ پتا نہیں کیسے وہ دروازہ لاک کرنا بھول گیا تھا۔ وہ باہر کی طرف بھاگا۔ باہر بارش شروع ہو گئی تھی۔ وہ بارش سے بچتا ہوا تیزی سے کار تک پہنچا وہ جتنی تیزی سے کار چلا سکتا تھا اس نے چلائی تھی۔ کیتھی پریشانی سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ مین روڈ پر آ کر اس نے گاڑی روکی اور باہر نکل گیا۔ کیتھی پریشانی سے اسے بارش میں بھیگتا دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک ٹیکسی کو روکا اب کھڑکی پر جھکا ڈرائیور سے کچھ کہہ رہا تھا پھر وہ گاڑی کی طرف آیا اور کیتھی کی طرف کا دروازہ کھولا۔

"کیتھی آئی ایم سوری۔ میں تمہیں ہوٹل نہیں چھوڑ سکتا۔ تم ٹیکسی سے چلی جاؤ۔ میں بعد میں تم سے ملتا ہوں۔"

اس کے ہر انداز سے بے چینی ظاہر ہو رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے ابراہیم؟ تم پریشان کیوں ہو؟"

"میں نے کہا نا کیتھی! تم جاؤ۔" وہ زور سے بولا تو کیتھی کچھ دیر دکھ سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر ناراضی سے تیزی سے چلتی ہوئی ٹیکسی میں جا کر بیٹھ گئی۔ وہ جانتا تھا اسے اس طرح نہیں بولنا چاہیے تھا لیکن اس وقت وہ خود کو کسی بھی قسم کے کنٹرول سے بالاتر محسوس کر رہا تھا۔ اس نے گاڑی واپس گھر کی طرف موڑی۔ وہ ساتھ ساتھ ارد گرد کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔

تیز بارش کی وجہ سے باہر کا منظر دھندلا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ملائکہ کہاں گئی ہے۔ اس نے شیشے کے باہر دیکھنے کی کوشش کی جہاں آبادی نہیں درختوں کے گھنے جھنڈ تھے۔

چیخ کی آواز پر اس کے قدم بے ساختہ بریک پر پڑے تھے۔ وہ تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ دوبارہ چیخنے کے ساتھ کراہنے کی آواز بھی آئی تھی اور آواز کا تعین کرتے ہوئے وہ اس طرف بھاگا تھا۔ چیخنے کی آواز رونے میں بدل گئی تھی اور اس کے قدموں میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ راستہ ڈھلوان کی صورت اختیار کر رہا تھا۔ تیز بارش کی وجہ سے وہ مکمل طور پر بھیگ چکا تھا اور کیچڑ کی وجہ سے پاؤں الگ پھسل رہے تھے۔

"ملائکہ!" اسے ڈھونڈنے میں ناکام ہو کر اس نے اسے آواز دی تھی۔

وہ ابراہیم اور کیتھی کے پیچھے بھاگی تھی اور غیر ارادی طور پر دروازہ کھولا تھا اور دروازہ بیچ کھل گیا تھا۔ وہ کتنی دیر کھلے دروازے کو دیکھتی رہی اور اگلے ہی لمحے وہ سوچے سمجھے بغیر باہر کی طرف بھاگی تھی۔ باہر تیز بارش ہو رہی تھی اس نے صرف شال لے رکھی تھی۔ کوئی منزل نہیں تھی لیکن اس نے کوئی پروا نہیں کی وہ بس بھاگتی جا رہی تھی۔ اسے دور سے گاڑی کی ہیڈ لائٹ دکھائی دی تھیں۔ وہ سڑک کے درمیان جا کر کھڑی ہو گئی۔

گاڑی ایک جھٹکے سے اس کے قریب آ کر رکی تھی۔

"او لڑکی! مرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو کوئی اور گاڑی دیکھو۔ خودکشی کے لیے ہماری گاڑی ملی تھی۔" پسنجر سیٹ پر بیٹھا آدمی کھڑکی سے سر نکال کر بولا وہ بھاگ کر اس طرف گئی۔

"دیکھیں پلیز میں بہت پرابلم میں ہوں۔ مجھے بس اسٹاپ تک چھوڑ دیں۔"

وہ آدمی جو کچھ دیر پہلے غصے سے بول رہا تھا۔ اب بالکل خاموش تھا۔ ملائکہ نے قدرے غور سے اسے دیکھا اور اگلے ہی لمحے ڈر کر پیچھے ہٹی۔ وہ شخص بے حد گہرے رنگ کا مالک تھا۔ چہرے پر جا بجا زخموں کے نشان چہرے کو مزید بھیانک بنا رہے تھے اس کی بڑی بڑی سوجی آنکھیں۔ اس کو پیچھے ہٹتے دیکھ کر گاڑی کے پچھلے دروازے کھلے اور دو کم و بیش اسی سائز کے شخص نکلے وہ الٹے قدم پیچھے ہٹی تھی۔

"پکڑو اسے۔" اس کا بھاگنے کا ارادہ دیکھ کر وہ آدمی چیخا اور وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر بھاگی تھی۔ قدموں کی آواز اس کے قریب آتی جا رہی تھی وہ ایک دم بائیں طرف مڑی اور درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو گئی۔ بارش کی وجہ سے وہاں پھسلن تھی۔ پتا نہیں اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا تھا یا پھسلا تھا۔ وہ اوندھے منہ گری اور لڑکھڑاتی ہوئی نیچے کی طرف گرنے لگی۔ اس کے منہ سے دل خراش چیخ نکلی تھی۔ چیخ کی آواز سن کر وہ دونوں آدمی چونکے تھے اس سے پہلے وہ اس کی طرف بڑھتے انہوں نے ایک کار کو کچھ دور رکتے دیکھا۔ وہ دونوں واپس بھاگے۔

پتا نہیں کہاں کہاں چوٹ لگی تھی لیکن سارے جسم سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اٹھنے کی کوشش میں وہ پھر گر گئی۔ درد کی شدت سے وہ ایک بار پھر چیخی تھی اس کے سارے کپڑے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو آنکھوں کے سامنے کیا جو زخمی تھے۔ بے بسی اور درد کے احساس سے وہ اونچی آواز میں رونے لگی۔ اس نے روتے ہوئے خوف زدہ نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لیا وہ دونوں کسی وقت بھی آ سکتے تھے۔

صبح سے اس نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ کمزوری کی وجہ سے پہلے ہی چکر آ رہے تھے۔ رہی سہی کسر زخموں نے پوری کر دی تھی۔ اسے اپنی موت بہت قریب نظر آ رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں اپنوں کے چہرے گھومنے لگے تھے۔ ڈیڈی میری لاش دیکھ کر بہت روئیں گے اور مما علی چاچو اور ابراہیم وہ ابھی اس ہوم تک پہنچی تھی جب اس کو لگا اس نے ابراہیم کی آواز سنی ہے۔ وہ کیوں آئے گا۔ اس نے شکر تو کیا ہو گا مجھ سے جان چھوٹی۔

اس نے ایک بار پھر اپنا نام سنا تھا اور اب کی بار وہ وہم
نہیں لگا تھا۔

"ابراہیم!" وہ پورا زور لگا کر چیخی تھی۔ بھاگتے
قدموں کی آواز قریب آرہی تھی۔ اس نے پورا زور لگا
کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھ نہ سکی۔ بند ہوتی
آنکھوں کے سامنے اس نے اسے اپنے قریب آتے
دیکھا تھا۔

ابراہیم کو دیکھ کر دل نے جو اطمینان محسوس کیا تھا'
وہ خود بھی حیران ہو گئی تھی۔

"اوہ مائی گاڈ!" اس کے قریب دوزانو بیٹھتے ہوئے
اس نے بے اختیار کہا تھا۔ دل تو چاہ رہا تھا' وہ تھپڑ
لگائے لیکن اس کی حالت اتنی قابل رحم ہو رہی تھی کہ
وہ چپ کا چپ رہ گیا۔

"تم چل سکتی ہو؟" ابراہیم کے پوچھنے پر اس نے
بڑی مشکل سے سر نفی میں ہلایا تھا۔ وہ کھڑا ہو کر اسے
دیکھنے لگا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے اس کے قریب سے
بھی نفرت کا اظہار کیا تھا اور اس کی یہ حالت بھی اس
وجہ سے تھی کہ وہ اس سے دور جانا چاہتی تھی تو وہ کیسے
اس کے قریب جاتا۔ ٹھیک اسی وقت وہ بھی کچھ دیر
پہلے کے اپنے الفاظ کو سوچ رہی تھی۔

اس کو یوں نڈھال دیکھ کر اس نے اپنی انا کو پیچھے
رکھا اور جھک کر اسے اٹھایا۔ وہ اسے بازو کے گھیرے
میں لے کر چل رہا تھا لیکن صاف محسوس ہو رہا تھا'
اسے چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ جبکہ اس کا سر اس
کے سینے سے لگا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ اسے صرف
اس کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی۔ بارش اب بھی ہو
رہی تھی۔ وہ بہت مشکل سے گاڑی تک پہنچا تھا۔
گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اس نے ملائکہ کو اندر
بٹھایا اور ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔

وہ پہلی بار اسلام آباد آیا تھا۔ اسے ان کچھ دنوں میں
کچھ راستے ہی یاد ہوئے تھے۔ ہسپتال کہاں ہے' وہ
نہیں جانتا تھا بارش اور رات کی وجہ سے سڑکیں
سنسان تھیں اور دکانیں بھی بند تھیں۔ راستے میں
اسے ایک میڈیکل اسٹور کھلا نظر آیا تھا' اس نے
گاڑی اسٹور کے آگے روک دی۔ کاؤنٹر کے پیچھے
کھڑے لڑکے سے اس نے ہسپتال کے بارے میں
پوچھا اور یہ سن کر کہ ہسپتال ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر
ہے۔ وہ بری طرح مایوس ہوا تھا بینڈیج و ڈیٹول' کاٹن
پین کلر لے کر وہ واپس گاڑی میں آ گیا۔ کار اس نے
کرائے پر لی تھی۔ رات کو واپس کرنی تھی لیکن اب
ایک تو بارش کی وجہ سے اور دوسرا ملائکہ کی حالت کی
وجہ سے یہ ممکن نہیں تھا۔

گھر پہنچ کر اس نے کار سائیڈ پر پارک کی اور پچھلا
دروازہ کھول کر ملائکہ کو آواز دی۔ لیکن اس میں کوئی
حرکت نہیں ہوئی۔ اس نے آگے کی طرف جھک کر
اس کا بازو پکڑا اور کھینچ کر اسے بٹھایا۔ وہ نیم بے ہوشی
کی کیفیت میں تھی۔ بڑی دقت سے اس نے اسے کار
سے نکالا اور لاک کھول کر وہ اسے سیدھا بیڈ روم میں
لے گیا۔

بیڈ پر لٹا کر اس نے اسے دیکھا۔ اس کے سارے
کپڑے کیچڑ سے بھرے ہوئے تھے اور گیلے بھی تھے۔

"ملائکہ!" اس نے جھک کر اس کا گال تھپتھپایا۔
"ملائکہ!" اس نے زور سے آواز دی۔ کچھ دیر بعد اس نے
بمشکل آنکھیں کھولیں۔

"کپڑے چینج کرلو۔" اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔
دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔

"چلو شاباش! ہمت کرو' کپڑے چینج کیے بغیر تم سو
نہیں سکتیں۔" اس نے بازو سے پکڑ کر اسے بٹھایا۔

"مجھے نیند آرہی ہے۔" وہ واقعی سونے کے موڈ
میں تھی۔

"اگر تم نہیں اٹھیں تو میں خود تمہارے کپڑے
بدل دوں گا۔"

اس کی دھمکی واقعی کارگر ثابت ہوئی تھی۔ اس کی
نہ صرف آنکھیں کھل گئی تھیں بلکہ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی
تھی۔ وہ اس کے بیگ سے کپڑے نکال رہا تھا۔

"باتھ لے لو پھر میں تمہارے زخموں پر بینڈیج کر
دیتا ہوں۔" وہ بمشکل چل کر باتھ روم تک پہنچی تھی۔

"ڈور لاک نہ کرنا۔"

"کیوں؟" اس نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

"اگر تم اندر بے ہوش ہو گئیں تو کون نکالے گا۔"

گرم پانی سے نہانے کے بعد سکون تو ملا تھا لیکن ایسا
لگ رہا تھا۔ سارے زخم ہرے ہو گئے ہیں' زخموں پر
مرچیں سی لگنے لگی تھیں۔

جب وہ باہر آئی تو کمرے میں ہیٹر لگا تھا۔ بیڈ شیٹ
بیڈ پر نہیں تھی بیڈ پر کھانے کی ٹرے تھی جبکہ وہ خود
نہیں کہاں تھا۔ وہ بیڈ پر جا کر بیٹھ گئی جب وہ شاور لے کر
اندر داخل ہوا۔ اس نے بھی کپڑے بدل لیے تھے۔

"تم نے کھانا شروع نہیں کیا۔" اس نے پہلی بار
غور سے ابراہیم کو دیکھا۔ اس کے اتنے برے سلوک
کے باوجود وہ اس کا کتنا خیال رکھ رہا تھا۔ اسے یوں غور
سے دیکھتے پا کر وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ تو
اس نے اس پر سے نظریں ہٹا کر ٹرے پر ٹکا دیں۔ کھانا
دیکھ کر اس کی بھوک چمک اٹھی تھی۔

نوالہ توڑنے میں اسے تکلیف تو ہوئی لیکن وہ ضبط
کر گئی۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ وقتاً فوقتاً اس پر بھی نظر
ڈال رہی تھی۔ جو نماز پڑھ رہا تھا۔ کتنا سکون تھا اس کے
چہرے پر۔ اس نے پہلی بار غور کیا تھا۔ وہ بہت خوب
صورت تھا۔ اور پہلی بار ہی اسے یہ احساس بھی ہوا تھا
کہ وہ اس کا تھا۔ اس کے سلام پھیرنے پر اس نے
نظروں کا زاویہ بھی بدل لیا۔ وہ جائے نماز سمیٹ چکا تھا
وہ کھانا ختم کر کے ٹرے رکھنے کے لیے کھڑی ہوئی تو وہ
اس کے پاس آ گیا۔

"تم رہنے دو۔" اس نے اس کے ہاتھ سے ٹرے
لے لیا۔

"کھانا بہت اچھا تھا۔ آپ کو کوکنگ کا کافی شوق لگتا
ہے۔"

پتا نہیں کیوں اس کا دل چاہ رہا تھا اس سے بات
کرے۔ ابراہیم نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"یہ شوق نہیں مجبوری ہے۔ چائے پیو گی؟"

"میں بناتی ہوں۔" ابراہیم نے کچھ حیران ہو کر
اسے دیکھا۔ پھر سر جھٹک کر باہر نکل گیا تو اس نے بیڈ
کراؤن سے ٹیک لگا لی۔ آج پہلی بار ابراہیم کے ساتھ
اسے عجیب سے تحفظ کا احساس ہو رہا تھا۔

آہٹ پر اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ ٹرے لیے
اندر داخل ہو رہا تھا جو کام اس کے تھے' وہ ابراہیم کر رہا
تھا۔ شرمندگی اور دکھ سے اس کی آنکھیں نم ہوئی
تھیں۔ اس کی نم آنکھیں دیکھ کر وہ پریشان ہوا تھا۔

"کیا ہوا' درد ہو رہا ہے؟" اس کا سر جھک گیا تھا اس
کی عظمت کے آگے۔ اس کے آنسوؤں میں روانی آ
گئی۔ ابراہیم کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر گہرا سانس لے کر
بولا۔

"میں جانتا ہوں۔ تم کیوں رو رہی ہو۔" ملائکہ نے
نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"میں نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ تمہیں تکلیف دوں
لیکن میں نے تمہیں تکلیف دی۔ تم نے مجھے بتایا
تھا۔ تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں تو مجھے تم سے
شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔" وہ اب کاٹن پر ڈیٹول
لگا رہا تھا۔ "لیکن پاپا کی وجہ سے میں مجبور ہو گیا تھا۔"
وہ اب اس کا ہاتھ پکڑ کر ڈیٹول لگا رہا تھا۔ زخم پر
ڈیٹول لگتے ہی اس نے بے ساختہ سسکاری لی تھی۔

"سوری۔" وہ زخم پر پھونک مارتے ہوئے بولا۔

"تم نے کس طرح مجھے تنگ کیا۔ میں تمہیں سال
بدلہ لینے کے لیے نہیں لایا تھا جب میں نے علی کو بتایا
تھا کہ تم ڈائیورس چاہتی ہو تو اس نے کہا کہ آپ اتنی
جلدی نہ کریں۔ شاید وقت تمہارے خیالات بدل
دے۔ پھر میں نے بھی سوچا کہ اگر ہم دونوں ساتھ
رہیں تو..." وہ جانے کیا کہنے جا رہا تھا خاموش ہو گیا۔

ملائکہ پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے لگا تھا تم مجھے ناپسند کرتی ہو۔ لیکن مجھے
اندازہ ہوا کہ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو اتنی نفرت کہ مجھ
سے دور جانے کے لیے تم نے خود کو مصیبت میں ڈال
لیا۔"

وہ اس کی طرف دیکھ کر بات نہیں کر رہا تھا۔

"میں نہیں چاہتا تھا میری وجہ سے تمہیں کچھ ہو'
میں نے کل کی سیٹیں کنفرم کروائی ہیں۔ کل جاتے ہی
میں وکیل سے بات کر کے پیپرز تیار کروالوں گا۔ اب

مزید تمہیں مجھے برداشت نہیں کرنا پڑے گا۔" اس نے گہرا سانس لے کر بات ختم کی اور ٹرے کی طرف دیکھا۔

"چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔" اس نے ٹھنڈی چائے کو دیکھ کر کہا۔ "تم یہ میڈیسن کھا لو۔" اس نے سائیڈ ٹیبل سے ٹیبلٹ اور پانی کا گلاس اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

"میں نے اگر تمہیں ہرٹ کیا ہو تو میں اس کے لیے بہت شرمندہ ہوں۔" ملائکہ نے اب کی بار اس کے چہرے کی طرف نہیں دیکھا۔ اس کے ہاتھ سے گلاس اور ٹیبلٹ لے لی۔ جتنی دیر اس نے دوائی نہیں کھائی اتنی دیر وہ کھڑا رہا۔

"محبت نہ ملے تو بدقسمتی ہوتی ہے لیکن محبت کو پا کر کھو دینا اس سے بڑی بدقسمتی ہوتی ہے۔" وہ کہہ کر باہر نکل گیا تھا۔ جبکہ وہ ابھی تک اس کے آخری جملے میں اٹکی تھی۔

"اس نے ایسا کیوں کہا؟ کیا اس نے محبت کو پا کر کھو دیا۔ کیا اس نے ابراہیم کو کھو دیا۔" اس نے نفرت دی تو بدلے میں اسے نفرت ہی ملنا تھی۔ وہ کتنی دیر بند دروازے کو دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

صبح جب وہ اٹھی تو اس کا پہلو خالی تھا بغیر شکن بستر ظاہر کر رہا تھا۔ وہ اندر نہیں آیا تھا۔ وہ چکراتے سر کے ساتھ بمشکل اٹھی۔ اسے بخار بھی محسوس ہو رہا تھا شاید رات کی بارش اپنا اثر دکھا گئی تھی۔ وہ منہ دھو کر کپڑے بدل کر جب لاؤنج میں آئی تو خالی لاؤنج اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس نے کچھ حیرت سے اطراف میں نظریں دوڑائیں۔ تب ہی اس کی نظر ٹیبل پر رکھے اپنے موبائل اور کرسی پر پڑی تھی۔ وہ حیران ہوتی ہوئی آگے بڑھی۔ موبائل آن کر کے اس نے ٹائم دیکھا دن کے بارہ بج رہے تھے۔

"وہ کہاں گیا ہو گا؟" وہ پریشان ہو کر ہاتھ میں پکڑی چیزوں کو دیکھنے لگی۔ کچھ دن پہلے وہ ان چیزوں کے غائب ہونے پر پریشان ہوئی تھی۔ آج ان کی موجودگی اس کے لیے پریشانی کا باعث تھی۔ وہ دوبارہ کمرے میں آئی اور دھک سے رہ گئی۔ اس کا بیگ بھی غائب تھا۔

وہ کتنی دیر دروازے کا ہینڈل تھامے گم صم کھڑی رہی۔ اس نے سر نفی میں ہلایا۔

"نہیں۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی لاک گھماتے ہی وہ کھل گیا تھا۔ اگر دروازہ نہ کھلتا تو اچھا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ ایک جادو اثر لمحہ اس کو ایک عجیب سے حصار میں مقید کر گیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا اندر داخل ہو رہی تھی۔ آج بارش تو نہیں تھی لیکن دھند نے سامنے کے منظر کو دھندلا دیا تھا۔ گھر کی چار دیواری کے باہر کی دنیا کتنی خوفناک ہے اس کا اندازہ اسے کل ہو گیا تھا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔

"وہ بدلہ لینے کے لیے مجھے یہاں لے کر آیا تھا اور بدلہ لینے کے لیے چھوڑ کر بھی جا سکتا ہے۔" دل ایک ہی نکتے پہ اٹکا ہوا تھا۔

اسے انتظار کرتے ایک گھنٹہ ہو گیا تھا۔ اسے بھوک بھی لگی تھی۔

اس سے پہلے وہ کچھ کھانے کے لیے اٹھتی۔ لائٹ چلی گئی۔ کمرہ گھپ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ وہ پریشانی سے آنکھیں پھاڑے اندھیرے میں دیکھنے لگی۔ اندھیرے میں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بھوت اس کے ارد گرد ناچ رہے ہوں۔ اس نے اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا تب ہی دروازے پر بڑے زور کی دستک ہوئی تھی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ ڈرتے ڈرتے دروازے کی طرف بڑھی۔ کوئی دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے خوف زدہ نظروں دروازہ دیکھ کر اپنی حفاظت کے لیے کسی چیز کی تلاش کی تھی تب ہی دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا تھا۔ اس کے منہ سے دل خراش چیخ نکلی تھی اندر داخل ہوتا ابراہیم اور اس کے پیچھے آتی کیتھی نے حیرت سے اسے دیکھا جو آنکھیں بند کیے مسلسل چیختی جا رہی تھی۔ ابراہیم گھبرا کر اس کی طرف بڑھا۔

"ملائکہ!" اس نے اسے کندھوں سے پکڑ کر زور سے آواز دی تھی۔ وہ یکدم چپ ہو گئی۔ اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور ابراہیم پر نظر پڑتے ہی وہ اس کے سینے سے لگ کر زور زور سے رونے لگی۔ ابراہیم کے لیے اس کا یہ ردعمل بالکل غیر متوقع تھا۔

"آپ مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟" ابراہیم کے لیے یہ دوسرا جھٹکا تھا۔ ابراہیم نے اسے دونوں ہاتھوں سے تھام کر خود سے الگ کیا۔ وہ دور تو ہو گئی تھی لیکن اس نے اس کا سویٹر نہیں چھوڑا تھا۔

"میں کیتھی کو لینے گیا تھا۔" اس کے کہنے پر ملائکہ جیسے ہوش میں آئی۔ اس نے پہلے چونک کر ابراہیم کا چہرہ دیکھا اور پھر اس کے ساتھ کھڑی کیتھی کو جو بہت عجیب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی جن میں اس کے لیے اس کے اس جذباتی ردعمل کے لیے ناپسندیدگی صاف نظر آ رہی تھی۔ سویٹر پر اس کی گرفت پہلے ڈھیلی اور پھر ختم ہوئی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور تم سو رہی تھیں اس لیے میں نے تمہیں جگایا نہیں۔ کیا ہوا تم رو کیوں رہی تھیں؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں ایئرپورٹ کے لیے نکلنا ہے تین بجے فلائٹ ہے۔"

ملائکہ نے ایک بار پھر کیتھی کی طرف دیکھا وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ پہلے دن کی نسبت آج وہ اسے بہت مختلف لگی تھی۔ اس کی آنکھوں کے رنگ شاید اس لیے بدلے تھے کہ ابراہیم نے اسے ان دونوں کی ناکام ازدواجی زندگی کے بارے میں بتا دیا تھا یا اس کی آنکھوں میں ابراہیم کو پا لینے کی آس تھی۔

"تم نے ناشتا کیا؟" ابراہیم کے سوال پر وہ غائب دماغی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ "اگر یہ مجھ سے نفرت کرتا ہے تو اس کو میری اتنی فکر کیوں ہے۔" اس کے مسلسل خود کو دیکھنے پر ابراہیم حیران ہوا تھا۔ آج تو وہ اسے حیران کرنے پر تلی تھی۔

"ابراہیم ہمیں ایئرپورٹ جانا ہے۔" ان دونوں کو یوں ایک دوسرے کو دیکھتا پا کر کیتھی نے ناگواری سے ٹوکا تھا۔

ان دونوں نے ایک ساتھ کیتھی کو دیکھا تھا۔

"میں اپنا بیگ لے گیا تھا تم نے جو سامان رکھنا ہے رکھ لو۔" وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ مزید کوئی بات کیے بغیر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ جب وہ ٹرالی لے کر باہر آئی وہ دونوں دروازے کے پاس ہی کھڑے تھے۔ اسے دیکھ کر ابراہیم نے بیگ لینے کے لیے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا بیگ پکڑنے کے لیے بڑھا اس کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے اس کے ہاتھ سے ٹکرایا تھا۔ ابراہیم نے چونک کر اسے دیکھا۔

"تمہیں تو بخار ہے۔" اس نے کہنے کے ساتھ غور سے اس کا چہرہ دیکھا جس کا چہرہ اور آنکھیں دونوں سرخ ہو رہے تھے۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر کار کی طرف بڑھ گئی۔

راستے میں ابراہیم اور کیتھی ہی باتیں کرتے رہے۔ ابراہیم آگے تھا جبکہ وہ دونوں پیچھے بیٹھی تھیں۔ کیتھی سے بات کرتے ہوئے وہ بار بار اسے بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے کار سے باہر دوڑتے نظاروں کو دیکھنے میں مصروف تھی۔ فلائٹ ٹائم پر تھی اس لیے انہیں انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اسے اچانک کیتھی بری لگنے لگی تھی۔ ابھی بھی وہ جس طرح ابراہیم کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی اس کا دل چاہ رہا تھا اسے کوئی منتر آتا ہو اور وہ ایک پل میں اسے ابراہیم کے پہلو سے نظروں سے غائب کر دے اور کیتھی تو پہلے ہی کہہ چکی تھی کہ اسے اس سے حسد محسوس ہوتا ہے پہلے تو کوئی پردہ تھا لیکن ابراہیم نے وہ پردہ بھی ختم کر دیا تھا۔ اب تو وہ اسے اپنے اور ابراہیم کے درمیان دیوار ہی سمجھ رہی ہو گی۔ اسے کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ ملی تھی۔ جہاز اس وقت آسمان کی بلندیوں پر تھا۔ وہ بڑے غور سے بادلوں کو گزرتے دیکھ رہی تھی جب اچانک ابراہیم نے اس

کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"شاید یہ ہمارا ایک ساتھ آخری سفر ہو۔" اس نے ایک دم سر گھما کر اسے دیکھا۔ وہ اس کے اتنے قریب تھا کہ اس کی سانسیں اسے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھیں۔ لیکن اس نے منہ چھو پیچھے کیا تھا اور نہ ہی نظریں ہٹائی تھیں۔

"میں تم سے ایک چیز کے لیے ایکسکیوز کرنا چاہتا ہوں میں عورت کی بہت عزت کرتا ہوں اور کسی بھی عورت پر ہاتھ اٹھانا بہت بڑا گناہ سمجھتا ہوں۔ اس دن پتا نہیں کیسے میرا ہاتھ اٹھ گیا۔ میں اس کے لیے بہت شرمندہ ہوں۔ میں جانتا ہوں تم مجھ سے نفرت کرتی ہو لیکن کوشش کرنا کہ تم مجھے معاف کر سکو۔"

وہ اب بھی اس کے اتنے ہی قریب تھا اور اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔

"میں لاہور پہنچ کر پیپرز تیار کروالوں گا پھر تمہیں میرے ناقابل برداشت ساتھ سے آزادی مل جائے گی۔" ملائکہ کی آنکھوں کی سطح نم ہونے لگی۔

"پاپا روکو تو بہت ہو گا اور وہ مجھ سے ناراض بھی ہوں گے لیکن میں مینج کر لوں گا۔ لیکن ان سب کے بعد میرا یہاں رہنا اور اس سب کو بھلانا بہت مشکل ہو گا۔"

ابراہیم نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹالی تھیں ملائکہ نے سختی سے اپنے ہونٹوں کو بھینچا لیکن آنسو پھر بھی پلکوں سے باہر نکل آئے تھے۔ ابراہیم کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا تھا شاید وہ بھی ضبط کر رہا تھا ملائکہ اب بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ ابراہیم نے اب اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"میں بابا کے ساتھ ہمیشہ کے لیے لندن چلا جاؤں گا۔ وہ گھر بابا نے تمہارے لیے بنوایا تھا۔ اس گھر میں اب نہ میں رہ سکوں گا اور نہ بابا۔" اس نے اب سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر حیران ہوا تھا۔

"تم رو رہی ہو؟" اس کے آنسو صاف کرنے کے لیے اس نے ہاتھ بڑھایا لیکن اس سے پہلے ملائکہ نے ہاتھ آگے کر کے اس کا ہاتھ روک دیا۔ اس کے ہاتھ میں دبا اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور چہرہ بھی موڑ لیا۔ ابراہیم کتنی دیر اس کے بالوں کو دیکھتا رہا اور جب بولا تو اس کی آواز مزید دھیمی تھی۔

"مجھے پتا ہے۔ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو مجھے یاد نہیں کرو گی لیکن پلیز مجھے معاف کر دینا۔"

ملائکہ نے آنکھیں زور سے بند کر لیں۔ کیتھی یا تھرڈ روم میں گئی تھی۔ وہ واپس آگئی تھی۔ ابراہیم نے منہ کیتھی کی طرف موڑ لیا۔ وہ نہیں جانتا تھا اس کے ساتھ بیٹھا وہ آنسوؤں کی صورت میں قطرہ قطرہ پگھل رہا ہے۔

☆ ☆ ☆

لاہور ایئرپورٹ پر اترتے ہی اس کے قدم بوجھل ہونے لگے تھے۔ اس نے متلاشی نظروں سے سامنے دیکھا اور بھیڑ میں اسے اپنا نظر آگیا تھا۔ وہ سب کچھ بھول کر علی کی طرف بڑھی تھی۔ اس کے گلے لگتے ہی وہ رو پڑی تھی۔ علی اسے بازوؤں کے حلقے میں لیے بار بار اس کا سر چوم رہا تھا۔

"بس کرو بیوقوف ورنہ میں بھی رونا شروع کر دوں گا۔" اس کو یوں روتا دیکھ کر اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

ملائکہ نے بڑی مشکل سے خود کو کنٹرول کیا تھا۔ علی نے ابراہیم سے مل کر کیتھی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ابراہیم اب کیتھی کا تعارف کروا رہا تھا جبکہ وہ ابھی تک خود کو کنٹرول کرنے میں ناکام رہی تھی۔

گھر پہنچتے ہی سب ان کے استقبال کے لیے کھڑے تھے جیسے عمرہ کر کے وہ لوگ واپس آئے ہوں۔ جعفر حسین' نوشابہ' فیروز تینوں کے مسکراتے چہرے اس پر نظر پڑتے ہی پریشان ہو گئے تھے "یہ کیا ہوا؟" جعفر حسین کی حالت ایسی تھی جیسے کسی نے ان کی جان نکال لی ہو۔ نوشابہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور فیروز صاحب نے بھی جن نظروں سے اسے دیکھا وہ ایک دم پریشان ہو گیا۔ ابھی صرف ملائکہ کے منہ کھولنے کی

دیر تھی اسے تو لگ رہا تھا۔ جعفر انکل اسے کوئی مار دیں گے اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو فیروز صاحب اسے عاق کر دیں گے۔ اسے اپنے ساتھ ساتھ کیتھی کی بھی فکر لگ گئی تھی۔ جسے فیروز صاحب نے ناپسندیدگی سے دیکھا تھا۔

اس نے کیتھی کو دیکھا جو پریشانی سے سب کو دیکھ رہی تھی۔ اسے اندر چلنے کا اشارہ کر کے وہ اندر داخل ہو گیا۔ وہ سب بیٹھ چکے تھے۔ وہ بھی جا کر خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"بیٹا! میں پوچھ رہا ہوں' یہ سب ہوا کیسے؟"

"ڈیڈی! ہم شاپنگ کے لیے باہر نکلے تھے۔ بارش کی وجہ سے کافی پھسلن تھی مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ میرا پاؤں سلپ ہوا اور میں گر گئی۔ بس معمولی سی چوٹیں ہیں اور بخار تو آج صبح ہی ہوا ہے۔" شکر ہے وہ روئی نہیں تھی۔ ابراہیم نے بے اختیار سکون کا سانس لیا۔

"ابراہیم! تم اس کا خیال نہیں رکھ سکتے تھے؟" فیروز صاحب نے غصے سے اسے دیکھا۔ وہ کیا کہہ سکتا تھا' بولنے خاموشی کے اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کو یوں بے بس دیکھ کر وہ بے اختیار بول پڑی تھی۔

"چاچو! ان کا کوئی قصور نہیں۔ انہوں نے تو میرا بہت خیال رکھا تھا۔ مجھے کھانا بھی یہی پکا کر دیتے تھے۔" وہاں پر موجود ہر کوئی اس کی بات پر مسکرا دیا تھا۔

"شرم کرو بچو! یہ کام تمہارا تھا۔"

"میں سیکھ لوں گی۔" وہ سر جھکا کر دھیمی آواز میں بولی تو علی بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔

"یہ میرے گناہ گار کان کیا سن رہے ہیں' سنا مما؟" علی نے نوشابہ کو مخاطب کیا جو خود خوشگوار حیرت سے بدلی بدلی ملائکہ کو دیکھ رہی تھیں۔

"ابراہیم بھائی! کیا جادو کیا ہے آپ نے۔ ہمیں بھی بتائیں۔" علی شرارتی انداز میں اسے دیکھنے لگا لیکن وہ مسکرا بھی نہ سکا۔ وہ بہت سنجیدگی سے ملائکہ کو دیکھ رہا تھا۔ تب ہی اس نے بھی ابراہیم کو دیکھا تھا اور پھر جلد ہی نظریں بھی ہٹالیں۔ ملائکہ کی طرف سے تسلی ہو گئی تو ان کی نظر کیتھی پر پڑی۔ انہوں نے کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا۔ ان کے دیکھنے پر ابراہیم نے کیتھی کا تعارف کروایا۔

"انکل! یہ میری فرینڈ کیتھی ہے۔ لندن سے آئی ہے۔ اسے پاکستان دیکھنے کا بہت شوق تھا۔"

سب کچھ جیسے ایک دم نارمل ہو گیا تھا۔ سب باتوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ نوشابہ کچن میں کھانے کا انتظام کرنے چلی گئیں۔ وہ اب تک حیران تھا۔ اس نے ایسا کیوں کیا اگر وہ اس کی شکایت لگا دیتی تو جو وہ چاہتی تھی اسے مل جاتا۔ اس کا مرجھایا ہوا چہرہ واپس آتے ہی کیسے کھل اٹھا تھا۔ ابراہیم کو ایک بار پھر افسوس ہوا اس نے اسے کتنا تنگ کیا تھا۔

"ابراہام! ہمیں چلنا چاہیے۔" کیتھی کی آواز پر اس نے چونک کر اسے دیکھا اور ملائکہ نے بھی چونک کر انہیں دیکھا۔

"ارے نہیں بیٹا! کھانا تیار ہے۔ کھانا کھا کر جانا۔" جعفر حسین نے انہیں روک لیا تھا۔ کھانا کھا کر وہ جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ملائکہ کا خیال تھا وہ اسے بھی چلنے کو کہے گا۔ لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔

"ابراہیم! ملائکہ نے نہیں چلنا؟" فیروز صاحب نے اسے جاتے دیکھ کر پوچھا تھا۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ ملائکہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"پاپا! ملائکہ کی طبیعت ٹھیک نہیں' یہاں انکل آنٹی ہیں۔ ٹھیک کیئر کر سکتے ہیں۔ دوسرا وہ کافی دن انکل سے دور رہی ہے۔ اداس بھی ہے۔ کچھ دن اسے یہیں رہنے دیں۔"

چھن سے کچھ ٹوٹا تھا۔

"ابراہیم بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے میں بہت اداس ہو گیا تھا اپنی بیٹی کے بغیر۔ مجھے جی بھر کر باتیں بھی کرنی ہیں۔" انہوں نے اسے بازو کے حلقے میں لے کر ساتھ لگایا تو وہ بڑی دقت سے مسکرائی تھی۔

کیتھی ہوٹل میں رکنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ اسے گھر

لے آیا تھا۔ اسے گیسٹ روم دکھا کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ کپڑے چینج کر کے نکلا تو فیروز صاحب اس کے منتظر تھے۔ اس نے ذہنی طور پر خود کو ان کے سوالوں کے لیے تیار کر لیا تھا۔

"لگتا ہے بابا! آپ کو کوئی ضروری بات کرنی ہے۔" وہ مسکراتا ہوا ان کے سامنے بیٹھ گیا تو وہ ہنس پڑے۔

"مجھے پتا تھا، تمہیں بھی لگا ہوگا، میرا باپ کوئی نیا حکم دینے آیا ہوگا۔"

اس نے اگر انکار نہیں کیا تھا تو اقرار بھی نہیں کیا تھا۔ بس مسکرا دیا تھا۔

"کچھ خاص نہیں۔ بس تمہیں دیکھنے آیا تھا۔ کتنے دن بعد دیکھ رہا ہوں۔" وہ ان کے گلے لگ گیا تھا۔

"کیتھی کو آئے کتنے دن ہو گئے ہیں؟" ان کے پوچھنے کا انداز سرسری تھا لیکن وہ جانتا تھا۔ وہ یہی بات پوچھنے آئے تھے۔

"یہی کوئی پانچ دن۔"

"کتنے دن اور رہنے کا ارادہ ہے؟"

"پتا نہیں بابا! میں نے پوچھا نہیں۔"

"ابراہیم! اگر وہ ہوٹل میں رہنا چاہتی تھی تو رہنے دیتے۔ یوں گھر میں رکھنا اچھا نہیں لگتا۔"

"بابا! وہ پاکستان مجھ سے ملنے آئی ہے اور پھر وہ میری دوست ہے۔ ہمارے گھر میں اتنی جگہ ہے کہ وہ آرام سے رہ سکے تو پھر ہوٹل کی کیا ضرورت ہے۔" اس کی دلیل پر وہ چپ ہو گئے تھے۔

"تم دونوں نے انجوائے تو کیا نا!"

"جی!" وہ ڈریسنگ ٹیبل میں سے کچھ ڈھونڈتے ہوئے بولا۔

"میں ملائکہ کو ساتھ لانا چاہتا تھا تم نے منع کر دیا۔ لیکن مجھے ایسا لگا تھا جیسے ملائکہ ہمارے ساتھ آنا چاہتی تھی۔"

ابراہیم نے چونک کر انہیں دیکھا۔ لیکن وہ ملائکہ کی تصویر دیکھ رہے تھے۔

"خیر کل جلدی آجانا۔ جعفر بھائی کی طرف رات کا کھانا ہے۔ کیتھی کو بھی بتا دینا اسے بھی انوائیٹ کیا ہے۔" وہ اسے شب بخیر کہہ کر باہر نکل گئے۔ تو وہ نائٹ بلب جلا کر بیڈ پر آکر لیٹ گیا۔ اس کی نظریں سامنے دیوار پر لگی اس کی تصویر پر ٹکی تھیں۔

"تم کیا چاہتی ہو ملائکہ! میں سمجھ نہیں پا رہا۔" وہ اس کی کالی آنکھوں میں پُرسوچ انداز میں دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

☆ ☆ ☆

حنا اندر داخل ہوئی تو ملائکہ آئینے کے سامنے کھڑی تھی حنا کا عکس آئینے میں دیکھ کر وہ تیزی سے پلٹی تھی اور والہانہ انداز میں اس کے گلے لگ گئی۔

"بس رہنے دو یہ دکھاوے کی محبت۔ تمہیں اتنی توفیق نہیں ہوئی ایک فون ہی کر لو۔" ملائکہ کے پاس اس کے شکوے کا کوئی جواب نہیں تھا بس اس کا ہاتھ تھام کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

"فراز نے بھی کتنی بار تمہارے بارے میں پوچھا۔" ملائکہ نے چونک کر حنا کو دیکھا۔

"فراز کیسا ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ اس کی خالہ کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ صالحہ کی امی کی۔ آنٹی رضوانہ، صالحہ کو ساتھ لے آئی ہیں۔ جب دیکھو فراز اسے لے کر گھومتا رہتا ہے، ہر وقت اس کی ناز برداریوں میں مصروف رہتا ہے۔"

"ہوں!" ملائکہ نے صرف ہوں کہنے پر اکتفا کیا تھا حنا نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"تمہیں جیلسی نہیں ہوئی؟"

"کس بات سے؟" ملائکہ نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"اس بات سے کہ صالحہ کے آنے سے فراز تمہیں بھول گیا ہے۔"

"نہیں۔" وہ گہرا سانس لے کر کھڑی ہو گئی۔

"ابراہیم بھائی ٹھیک ہیں؟"

"انہیں کیا ہونا ہے۔" حنا نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔ "لندن سے ان کی سہیلی آئی ہوئی ہے" اس کے آگے پیچھے لٹو کی طرح گھوم رہے ہیں۔" حنا کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ وہ حنا کا ہاتھ تھام کر نیچے آگئی۔

لاؤنج میں داخل ہونے سے پہلے ہی ان کی نظر سامنے صوفے پر بیٹھے ابراہیم اور کیتھی پر پڑ گئی۔

"یہ کون ہے؟" حنا نے کون پر اچھا خاصا زور دے کر پوچھا تھا۔

"میری سوتن۔" ملائکہ نے ایسے کہا جیسے کڑوا بادام چبا لیا ہو۔ سلام کرنے کے بعد ملائکہ، فیروز صاحب کے پاس جا کر بیٹھ گئی جبکہ حنا کیتھی کے پاس اور اس سے بات کرتے ہوئے حنا نے خوش اخلاقی کے اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیے تھے۔

ملائکہ نے ایک سرد نگاہ کیتھی پر ڈالی جو کالی شلوار قمیص میں غضب ڈھا رہی تھی۔ "یقیناً یہ شاپنگ ابراہیم نے کروائی ہوگی۔" اس نے دانت پیستے ہوئے ابراہیم کو دیکھا جو علی کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ وہ معذرت کر کے کھڑی ہو گئی۔

"حنا!" جاتے جاتے وہ اسے آواز دینا نہیں بولی تھی۔

"کیا یار! اتنی مزے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ درمیان میں سے بلا لیا۔"

"میں کرواتی ہوں تمہیں مزے کی باتیں میر جعفر کی رشتے دار۔"

"غصہ کیوں کر رہی ہو؟" ڈرائی فروٹ کی ٹرے سے پستہ اٹھاتے ہوئے اس نے شرارتی انداز میں ملائکہ کو دیکھا۔

"غصہ نہ کروں تو کیا کروں، زہر لگتی ہے مجھے یہ کیتھی۔" اس نے منہ بگاڑ کر کہا۔ "شرم آنی چاہیے اسے کسی کے ہزبینڈ کے ساتھ کیسے چپک کر بیٹھی ہے۔"

حنا کو ایک دم کھانسی اٹھی تھی۔ پستہ اس کے حلق میں ہی اٹک گیا تھا۔ ملائکہ نے اسے پانی نہیں دیا تھا، غصے سے اسے گھورتی رہی۔ آخر خود ہی اس نے پانی پیا۔

"یہ میرے گناہ گار کان کیا سن رہے ہیں ہزبینڈ مجھے کچھ جلنے کی بو آرہی ہے۔" "اس کے اردگرد گھومتے ہوئے وہ سوچ بھی رہی تھی مجھے غصہ آرہا ہے اور میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔" اس کی دھمکی پر حنا اوور ایکٹنگ کرتے ہوئے پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"لیکن یار! یہ ابراہیم بھائی کی دوست ہے۔ بس۔"

"یہ بس نہیں ہے۔ محترمہ کوڑے کوڑے ابراہیم کی محبت میں غرق ہیں۔ ان کی خاطر اسلام قبول کرنے کو تیار تھی اور ابراہیم سے شادی کرنے کے لیے تڑپ رہی ہے۔ جدائی برداشت نہیں ہوئی تو سات سمندر کا فاصلہ طے کر کے اپنے محبوب کے قدموں میں آگئی۔" اس کی "جاہلوں کے پمفلٹ پر چھپنے والی مثال" پر اس کا قہقہہ نکل گیا تھا۔

"تو اس میں مائنڈ کرنے والی کیا بات ہے۔ تم نے تو ابراہیم بھائی کو چھوڑنا ہی ہے۔ کسی نہ کسی سے تو وہ بھی شادی کریں گے تو اچھا ہے وہ کیتھی ہو۔ ایک تو انہیں چاہنے والی بیوی مل جائے گی۔ دوسرا وہ ایک عیسائی لڑکی کو مسلمان کریں گے۔ سوچو کتنے ثواب کا کام ہے اور دوسری اہم بات اس ثواب میں تم بھی حصہ دار ہوگی۔ آخر سب تمہاری وجہ سے ہوگا نا۔ تم ابراہیم کو چھوڑتیں نہ کیتھی ان سے شادی کے خواب دیکھتی۔ واہ کیا اسٹوری ہے۔"

حنا نے چٹخارہ لے کر کہا۔ ملائکہ نے بے بسی اور غصے سے اس کی بکواس سنی جبکہ حنا ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

"تم آج نہیں بچو گی۔" وہ قریب رکھا گلاس اٹھا کر اس کے پیچھے بھاگی۔ اس نے اپنے بھاگتے قدموں کو روکنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔ وہ بڑی زور سے ابراہیم سے ٹکرائی تھی۔ ابراہیم نے ایک دم بازو سے تھام کر اسے سہارا دیا تھا۔

"ابراہیم! بچائیں مجھے اپنی خونخوار بیوی سے۔" وہ ابراہیم کے پیچھے چھپتے ہوئے بولی۔

ملائکہ کو غصہ بھی آرہا تھا اور ہنسی بھی اور پھر ایک دم وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ اور یونہی ہنستے ہوئے بے دھیانی میں اپنا سر ابراہیم کے سینے پر رکھ دیا۔ پھر

احساس ہونے سے پہلے اس کی ہنسی رکی تھی پھر اس نے سر اٹھا کر ابراہیم کا چہرہ دیکھا جس کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ تھی جیسے اس نے اس کی اس حرکت کو انجوائے کیا ہو۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

"کافی خوش لگ رہی ہو اور طبیعت بھی ٹھیک لگ رہی ہے۔" ابراہیم اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"ابراہیم بھائی! آپ طنز کر رہے ہیں یا مزاح پر ہیں؟" حنا نے وہاں بھی اپنی ٹانگ اڑا دی تھی۔

"میں طنز نہیں کر رہا، مجھے اچھا لگ رہا ہے ملائکہ کو خوش دیکھ کر۔"

"آپ تو اداس ہوں گے ملائکہ کے بغیر۔" حنا کے سوال پر اس نے نظریں اٹھا کر ابراہیم کو دیکھا وہ شدت سے اس کے جواب کی منتظر تھی۔

"وقت کا پتا ہی نہیں چلتا۔ سارا دن کیتھی کے ساتھ گزر جاتا ہے۔"

اس سے زیادہ ملائکہ سے سنا نہیں گیا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی سائیڈ سے نکلی تھی ابراہیم نے غور سے اسے جاتے دیکھا تھا۔

کھانا کھانے کے دوران بھی وہ خاموش رہی تھی اور بعد میں بھی جب بڑے خوش گوار ماحول میں باتیں ہو رہی تھیں وہ چپ چاپ ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا آج وہ ایسے شخص کی ایک نظر کی منتظر تھی جسے اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ ابراہیم حنا علی اور کیتھی کی اپنی محفل جمی ہوئی تھی وقتاً فوقتاً ان کے قہقہے بھی سنائی دے رہے تھے علی اور حنا نے کتنی دفعہ اسے بلایا تھا لیکن وہ پھر بھی وہیں جمی رہی۔ فیروز صاحب کب سے اسے اکیلا بیٹھا دیکھ رہے تھے۔ آخر کار وہ اٹھ کر اس کے پاس آ گئے۔

"کیا بات ہے میری بیٹی اکیلی کیوں بیٹھی ہے؟"

"کچھ نہیں چاچو!" اس نے سر ان کے کندھے سے ٹکا دیا۔

"اب گھر آ جاؤ بیٹا! میں بہت اداس ہوں۔"

"جس کو اداس ہونا چاہیے وہ تو بہت خوش ہے۔" دل میں کہتے ہوئے اس نے بھٹکتی ہوئی نظر ابراہیم پر ڈالی تب ہی ابراہیم نے سرسری سے نظر سامنے ڈالی لیکن بہو سسر کی محبت دیکھ کر اس کا سارے کا سارا دھیان ان کی طرف مبذول ہو گیا تھا۔

"چاچو! یہ کیتھی کب جا رہی ہے؟" فیروز صاحب نے حیرت سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"کیوں؟" ان کی آواز میں مسکراہٹ کا عنصر بھی تھا۔

"کیوں کیا چاچو! جب سے آئی ہوئی ہے اب جائے، چپک کر ہی رہ گئی ہے۔" اس کے لہجے سے صاف جلن کا احساس ہو رہا تھا۔ "اور آپ اپنے بیٹے کو دیکھ رہے ہیں خوشی سے پھولے نہیں سما رہے۔"

فیروز صاحب کا قہقہہ بے اختیار تھا۔ ابراہیم بے ساختہ اٹھا تھا نہ جانے کیا راز و نیاز ہو رہے تھے فیروز صاحب کو بے تحاشا خوشی ہوئی تھی۔ ملائکہ کے انداز خالص بیویوں والے تھے۔

"کیا خیال ہے بابا اب چلیں۔" ان دونوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"ملائکہ سے بھی کہو چلنے کو۔" فیروز صاحب کے کہنے پر اس نے ملائکہ کو دیکھا۔

"یہ اپنی مرضی کی مالک ہے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"رہنے دیں چاچو! آپ کیوں انہیں مجبور کر رہے ہیں یہ میرے بغیر زیادہ خوش رہتے ہیں۔ اب تو کیتھی بھی آئی ہے ان کی بیسٹ فرینڈ۔" وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولی۔ ابراہیم نے حیرت سے اس کا سرخ ہوتا چہرہ دیکھا جبکہ فیروز صاحب بہانہ کر کے وہاں سے کھسک گئے۔

"اگر تم گھر آنا چاہتی ہو تو آ سکتی ہو۔"

"آپ سے کس نے کہا میں آنا چاہتی ہوں۔" ابراہیم نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"تم اتنی روڈلی بیہو کیوں کر رہی ہو؟"

"روڈلی بیہو میں کر رہی ہوں یا آپ؟ آپ کو کہنا چاہیے تھا گھر چلو جبکہ آپ کہہ رہے ہیں اگر تم چاہو تو آ سکتی ہو۔"

"اگر میں تمہیں کہتا کہ چلو تب بھی تمہیں برا لگنا تھا کہ میں حکم دے رہا ہوں۔"

ملائکہ ایک پل کے لیے چپ کی چپ رہ گئی۔ ہاں اگر وہ پہلے والی ملائکہ ہوتی تو ایسا ہی سوچتی لیکن اب اس کی سوچ بہت مختلف تھی۔

خاموشی کا لمحہ زیادہ ہی طویل ہو گیا تھا۔ وہ منتظر تھی کہ وہ اسے ساتھ چلنے کے لیے مجبور کرے۔ جبکہ وہ پتا نہیں کون سی سوچ میں گم تھا۔

"میں کل وکیل سے ملا تھا۔ پیپر تیار ہیں۔ میں کل لے آؤں گا۔ تم سائن کر دینا۔ میں نیکسٹ ویک کیتھی کے ساتھ لندن جا رہا ہوں ہمیشہ کے لیے۔"

اس نے رک کر ملائکہ کو دیکھا۔

"بابا کو میں نے نہیں بتایا۔ وہاں جا کر انہیں بلا لوں گا پھر آرام سے بتا دوں گا۔"

ملائکہ جیسے پتھر کی ہو گئی تھی۔ وہ یہ کیوں بھول گئی کہ اسے جتنی نفرت دے چکی ہے تو کیا اب وہ اس سے محبت کرے گا۔

* * *

علی اور حنا کے ساتھ فراز کو دیکھ کر وہ حیران ہوئی تھی۔ لیکن حیرت کو بہت جلد اس نے مسکراہٹ میں ڈھال لیا تھا۔ "کیسی ہو؟" ان کے قریب پہنچنے پر اس نے فراز سے پوچھا تھا۔

"میں تو ٹھیک ہوں، تم سناؤ غائب ہی ہو گئی تھیں جانے سے پہلے کم از کم بتا تو دیتیں۔" علی کپڑے تبدیل اندر چلا گیا۔

"میں ملتان چلا گیا تھا خالہ بیمار تھیں پھر ان کی ڈیتھ ہو گئی۔"

"ہاں مجھے حنا نے بتایا تھا اور مجھے سن کر بہت افسوس ہوا تھا۔"

"خالہ کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" فراز جواب دے کر اسے دیکھنے لگا جو اس کے بجائے سامنے دیکھ رہی تھی۔ فراز کو وہ بہت بجھی بجھی لگی تھی۔

"ویسے اگر ابھی تم نے بتایا نہیں۔ تم اچانک اور وہاں جا کر تم نے موبائل آف کر رکھا تھا۔ لگتا ہے اپنے ہزبینڈ کے ساتھ تمہارا زیادہ ہی دل لگ گیا۔ حتیٰ کہ فون کرنے کی بھی گنجائش نہیں رہی۔" اس کے شکوے کے انداز پر کب سے خاموش کھڑی حنا نے فراز کو دیکھا۔ "صحیح کہہ رہے ہو میرا واقعی ان کے ساتھ دل لگ گیا تھا۔" فراز نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

"جلدی کرو ہمیں آگے ہی دیر ہو گئی ہے۔" علی کہہ کر تیزی سے باہر کی طرف نکلا تھا۔

"جانا کہاں ہے؟" ملائکہ نے کار ڈرائیو کرتے علی سے پوچھا تھا۔

"ابراہیم بھائی نے کیتھی کو شاپنگ کروانا تھی۔ انہوں نے کہا آپ کو بھی لے آؤں انہوں نے آپ سے ضروری بات بھی کرنی ہے۔ حنا نے کہا اس نے بھی جانا ہے تو میں نے فراز کو بھی بلا لیا۔ سب اکٹھے ہوں گے تو مزہ آئے گا۔"

علی مزے کا سوچ رہا تھا جبکہ اس کی سوئی ضروری بات پر اٹک گئی تھی وہ جانتی تھی وہ ضروری بات کیا ہے۔ [illegible] چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا ہے اسے ایک دم اپنا ناخنوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی تھی۔

وہ حنا کے ساتھ مال کے اندر داخل ہو گئی۔ علی باہر ہی ابراہیم کا انتظار کر رہا تھا جبکہ فراز ان کے پیچھے تھا۔ وہ جانتی تھی وہ اس سے بات کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے پاس اس کے سوالوں کے جواب نہیں تھے۔ اس لیے وہ اسے اگنور کر رہی تھی۔ وہ اپنے لیے کپڑے پسند کر رہی تھی جب اس کے بالکل پیچھے فراز آ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم نے کب سے شلوار قمیص پہننا شروع کر دی۔" ہینگر کو آگے کر کے اس کا ہاتھ ایک پل کے لیے رکا تھا اور پھر وہ پوری طرح اس کی طرف گھوم گئی۔

"ابراہیم کو شلوار قمیص پسند ہے۔"

فراز نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔ "تو بات اس حد تک پہنچ چکی ہے۔"

ملائکہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور اس کی سائیڈ سے نکلتے ہوئے حنا کے پاس آ گئی تب ہی اس نے علی کے ساتھ ابراہیم اور کیتھی کو آتے دیکھا۔

"یہ گوری چھپکلی جان ہی نہیں چھوڑتی ابراہیم بھائی کی۔" حنا اس کے کان میں گھسی کہہ رہی تھی اگر کسی میں محسوس کرنے کی حس ہوتی تو جان لیتا اس کی آنکھوں سے آگ نکل رہی تھی۔

علی ابراہیم کا تعارف فراز سے کروا رہا تھا "فراز بجو اور حنا کا مشترکہ دوست ہے۔" ابراہیم نے مسکرا کر اس سے ہاتھ ملایا۔

"یہ ابراہیم بھائی کی بچپن کی فرینڈ کیتھرین ہیں، لندن سے آئی ہیں۔ پاکستان کی سیر کرنے۔" کیتھی نے فراز سے ہاتھ ملایا۔ آج تو وہ بہت موڈ میں تھی پہلے حنا سے ملی اور پھر اس سے بھی۔

"لگتا ہے ڈائیورس کی خبر اس کو بھی مل گئی ہے۔ اسی لیے اتنی خوش ہے۔"

اس نے ایک ناراض نظر ابراہیم پر ڈالی۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا اس کے دیکھنے پر مسکرایا لیکن اس نے غصے سے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ وہ بے مقصد چیزوں کو دیکھتی جا رہی تھی۔ جب اس نے پھر اپنے پیچھے فراز کی آواز سنی۔

"تم تو اس کی پسند کی چیزیں لیتی پھر رہی ہو اور جہاں تمہیں ہونا چاہیے تھا وہاں اس کی سیکلی کھڑی ہے۔" فراز کے لہجے میں تمسخر صاف محسوس ہو رہا تھا۔

ملائکہ نے غصے سے اسے دیکھا۔ "تم نے اسے میرے بارے میں بتایا؟" ملائکہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"میں نے ضروری نہیں سمجھا۔"

وہ کہہ کر وہاں سے ہٹ گئی جبکہ دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا اپنے دھیان میں چلتی ہوئی کسی سے ٹکرا گئی تھی۔ سر پکڑ کر اس نے نظریں اٹھائیں ابراہیم اس کے بالکل سامنے بہت قریب کھڑا تھا۔

"میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں اور تم بھاگ رہی ہو۔"

"مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔" وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔

"کیوں تمہارے ہی فائدے کی بات ہے۔"

"میرا فائدہ؟ میرا تو نقصان ہی نقصان ہے۔" اس شخص کو میری آنکھوں میں اپنی محبت نظر نہیں آتی۔ وہ تقریباً دوڑتے ہوئے وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

وہ بس چھپ جانا چاہتی تھی جہاں وہ تین لفظ اسے تھمانہ سکے۔ وہ باتھ روم میں چلی آئی۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا تب ہی اس نے باہر سے شور اور چیخوں کی آواز سنی لیکن دھیان نہیں دیا۔ کچھ دیر بعد اسے بہت زور سے کھانسی اٹھی تھی۔ اس نے چونک کر دیکھا ہر طرف دھواں پھیلا تھا۔ وہ کھانستی ہوئی باہر نکلی۔ چاروں طرف آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ سیکنڈ فلور پر آگ لگی تھی۔ چند لمحوں میں آگ بری طرح بھڑک اٹھی تھی۔ وہ سب باہر کی طرف بھاگ رہے تھے۔ ان کے پیچھے ابراہیم کیتھی کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکلا تھا۔ اس اچانک افراتفری میں انہوں نے دیکھا نہیں ملائکہ کہاں ہے۔ ہر بندہ پریشان ہو کر ادھر سے ادھر بھاگ رہا تھا۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کی آواز آنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ فراز، علی اور حنا کو دیکھ کر تیزی سے ان کی طرف بڑھا۔

"ملائکہ کہاں ہے؟" اس نے علی سے پوچھا تھا جبکہ وہ خود پریشانی سے ابراہیم کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"علی! میں پوچھ رہا ہوں ملائکہ کہاں ہے؟" اس نے علی کو تقریباً جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ حنا اور فراز گھبرا کر لوگوں کے ہجوم میں ملائکہ کو ڈھونڈنے لگے۔ علی کو لگ رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں اس کا ساتھ چھوڑ رہی ہیں۔ ابراہیم نے بے قراری سے اسے ڈھونڈنا شروع کیا کیتھی نے روتے ہوئے علی کو دیکھا جو زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ حنا اور فراز بھاگتے ہوئے ان کے قریب آئے تھے۔

"مجھے نہیں لگتا وہ باہر آئی ہے وہ سیکنڈ فلور پر گئی تھی۔" حنا کہتے ہوئے رو پڑی تھی۔ ابراہیم نے سر اٹھا

کر دوسری منزل کی طرف دیکھا جہاں سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔

فراز بے بسی سے سیکنڈ فلور کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیتھی ابراہیم کو ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کا ارادہ بھانپ کر اس نے تیزی سے اس کا بازو تھاما۔

"ابراہام! میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔" ان تینوں نے چونک کر کیتھی اور ابراہیم کو دیکھا تھا۔

"جو اندر ہے وہ میری بیوی ہے اگر اسے کچھ ہو گیا تو...؟" اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ کھینچا اور ہجوم کو چیرتے ہوئے بلڈنگ میں داخل ہوا تھا۔

"سر! آپ کہاں جا رہے ہیں آگے خطرہ ہے۔" دو تین لوگوں نے اسے پکڑا تھا۔

"میری وائف اندر ہے۔" وہ چیخ رہا تھا لیکن وہ کوئی اسے چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ اس نے اپنی پوری طاقت لگا کر اپنا آپ چھڑایا اور اتنی ہی زور سے ایک ایک مکا دونوں کے منہ پر جڑا تھا۔ درد کی شدت سے وہ تو وہیں دہرے ہو گئے اور وہ تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا تھا۔

☆☆☆

وہ بڑی آنکھوں سے آگ کے شعلوں کو دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ شاید اس کی موت ایسے ہی لکھی تھی۔ اس نے آخری کوشش کے طور پر متلاشی نظروں سے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ لیکن باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"یا اللہ! میری آپ سے یہی دعا ہے اگر ابراہیم نے میری زندگی میں رہنا ہے تو مجھے زندگی دے ورنہ موت ہی ٹھیک ہے۔"

کھانسی ایک دفعہ پھر شروع ہو گئی دھواں اس کی ناک اور آنکھوں میں گھس رہا تھا اسے سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ مرنے سے پہلے پرندے جس طرح پھڑپھڑاتے ہیں بالکل اسی طرح وہ سانس لینے کے لیے کوئی روزن ڈھونڈ رہی تھی۔

"ملائکہ!" بند ہوتی آنکھوں اور گم ہوتے حواسوں کے ساتھ اس نے اپنا نام سنا تھا اور یہ اسے وہم ہی لگا تھا کیونکہ وہ شاید اسے ہی سوچ رہی تھی۔

"ملائکہ!" ایک بار پھر اس کا نام پکارا گیا تھا اور اب کی بار اس کی آواز کہیں پاس سے آئی تھی۔ اس کی آنکھیں پوری کھل گئی تھیں۔ بے جان ہوتے وجود میں جیسے کسی نے روح پھونک دی تھی۔

"ابراہیم!" وہ پورا زور لگا کر چیخی تھی۔ پتا نہیں وہ کھڑکی تھی کہ دروازہ "وہ اس کے پار اسے نظر آیا تھا" اس نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔

"ملائکہ! تم وہیں رکو۔" اسے دیکھ کر وہ بولا تھا اور پھر پیچھے مڑا صرف کچھ سیکنڈ بعد وہ اس کے سامنے تھا اور اس کے پیچھے تین چار لوگ اور تھے جو سلنڈر سے آگ بجھا رہے تھے۔ آگ بجھتے ہی وہ چاروں اندر داخل ہوئے تھے "وہ سیدھا اس کی طرف آیا تھا اور پریشانی سے اسے دیکھنے لگا۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" اسے پتا نہیں کیا ہوا وہ اس کے ساتھ لگ کر رونے لگی۔ اور پچھلے چند لمحوں میں وہ جو اس قدر پریشان ہوا تھا اسے صحیح سلامت سامنے دیکھ کر اس کی جو حالت تھی وہ بیان نہیں کر سکتا تھا اس نے اسے رونے سے نہیں روکا تھا۔ وہ اسے بازوؤں کے گھیرے میں لیے ہوئے تھا اور اسے ساتھ لگائے اس کے صحیح ہونے کا یقین کر رہا تھا۔

"آپ پلیز یہاں سے نکل جائیں۔" ایک آدمی نے ابراہیم سے کہا تھا۔ اس نے سر ہلا کر ملائکہ کو دیکھا اور اسے ساتھ لگائے باہر نکل آیا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ مسلسل اس کے بازو کے حلقے میں تھی۔ ان دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی لیکن ان کے درمیان جو خاموشی تھی وہ بھی معنی خیز تھی۔ ان کو دیکھتے ہی علی، حنا، فراز اور کیتھی تیزی سے ان کی طرف بڑھے۔

"بجو!" علی ایک دم اس کے ساتھ لگ کر رونے لگا تھا۔ حنا بھی رو رہی تھی لیکن اسے دیکھ کر اسے تسلی ہو گئی تھی۔

آج کتنے لوگ تھے لیکن اس کو بچانے کے لیے

ابراہیم ہی آگے بڑھا تھا۔ وہ اس کے لیے جلتی آگ میں کود گیا تھا۔ ملائکہ سر جھکائے بالکل خاموش تھی۔ اس کی خاموشی کو ان سب نے محسوس کیا تھا۔

"اگر تمہیں ٹھیک نہیں لگ رہا تو ہم ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔" ابراہیم کے پوچھنے پر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں ٹھیک ہوں اور پلیز ڈیڈی کو کچھ نہ بتانا۔ وہ پریشان ہوں گے۔"

کیتھی کب سے ابراہیم کی طرف دیکھ رہی تھی جو اسے بھول ہی گیا تھا۔

اس کا سارا دھیان ملائکہ کی طرف تھا۔ وہ ملائکہ کو اپنی گاڑی کی طرف لے آیا۔ اس کے لیے اس نے فرنٹ ڈور کھولا تھا اور کیتھی خود بخود پچھلی سیٹ پر چلی گئی تھی۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اس کا پہلا سامنا نوشابہ سے ہوا تھا۔

"خیریت تو ہے۔" ان کے پریشان چہرے دیکھ کر انہوں نے پوچھا تھا۔

"ملائکہ کو کیا ہوا؟" اس کا زرد چہرہ دیکھ کر وہ بے ساختہ اس کی طرف بڑھی تھیں۔

"اسے تھوڑا سا چکر آ گیا تھا۔"

"منع بھی کیا تھا علی تمہیں اسے باہر نہ لے کر جاؤ۔ اسے پہلے ہی بخار تھا۔ رنگ دیکھو اس کا کیسے ہلدی کی طرح ہو رہا ہے۔" انہوں نے غصے سے علی کو دیکھا۔ وہ بے چارہ پریشان ہو کر باقیوں کے منہ دیکھنے لگا۔

"میں ٹھیک ہوں، مما!" نوشابہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا اور ان کی نظر پیچھے کھڑے ابراہیم پر پڑی تو وہ جیسے ہوش میں آ گئیں۔

"بیٹا! آپ لوگ بیٹھو۔ حنا! ملائکہ کو اندر لے جاؤ۔"

"تمہیں بھوک لگی ہے تو کھانا لاؤں!" حنا کے پوچھنے پر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" اس کی بند آنکھوں سے نکلتے آنسوؤں کو حنا نے تشویش سے دیکھا تھا۔

"اگر مجھے طلاق ہی دینی ہے تو مجھے بچانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"طلاق تم نے خود مانگی تھی۔" حنا نے اسے یاد دلایا تو وہ خاموش ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ابراہیم بھائی!" حنا کی آواز پر وہ جو کیتھی کے ساتھ گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا حیرت کے ساتھ مڑا۔ "مجھے آپ سے ضروری بات کرنا ہے۔"

"مجھے آپ سے ضروری بات کہنی ہے۔" وہ بھاگتی ہوئی اس کے قریب آئی تھی۔ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ حنا نے کیتھی کی طرف دیکھا۔

"اسے اردو نہیں آتی۔" ابراہیم نے اطمینان دلایا۔

"مجھے آپ سے ملائکہ کے بارے میں بات کرنا ہے۔" وہ بات کرتے ہوئے ابراہیم کا چہرہ غور سے دیکھ رہی تھی۔

"کہیے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"ملائکہ بچپن سے ہی ضدی اور جذباتی ہے۔ انکل نے اس سے پوچھے بغیر اس کا نکاح آپ سے کر دیا۔ اسے اس بات پر بہت غصہ تھا اور اسی غصے میں اس نے نہ جانے آپ سے کیا کیا کہہ دیا۔ اس کے صاف کردار کی میں گواہ ہوں۔ میں اسے بچپن سے جانتی ہوں۔"

"یہ آپ مجھے کیوں بتا رہی ہیں؟"

"آپ اسے ڈائیورس دے رہے ہیں نا!" وہ بوکھلا گئی۔

"جب آپ کو یہ پتا ہے تو یہ بھی پتا ہوگا کہ یہ آپ کی دوست کی فرمائش ہے۔ میں نہیں دے رہا۔ آپ کی دوست میں ایسی کوئی بات ہے کہ انسان نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے محبت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

"میں جانتی ہوں بچپن سے ہی اس کا دماغ کچھ گھوما ہوا ہے لیکن محبت وہ آپ سے ہی کرتی ہے۔"

ابراہیم کو خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔ ہونٹوں کے ساتھ اب کی بار اس کی آنکھیں بھی مسکرانے لگی تھیں۔

"اگر وہ یہ بات خود کہہ دے تو سمجھیں زندگی کی

دوسری بھی خواہش پوری ہو جائے گی۔"

"پہلی خواہش کون سی تھی؟"

"پہلی خواہش ملائکہ سے شادی کی تھی۔"

حنا قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ "آپ بے فکر ہو جائیں، جیسا آپ چاہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔ آخر آپ کا اتنا حق تو بنتا ہے۔" بات کے اختتام پر وہ دونوں ہنس پڑے تھے۔

وہ مڑ گیا۔ کیتھی نے غور سے اس کا جگمگاتا چہرہ دیکھا تھا۔ کیتھی نے گردن گھما کر گاڑی چلاتے ابراہیم کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر مستقل مسکراہٹ تھی اور سارا چہرہ کسی چیز کو پالینے کی خوشی میں چمک رہا تھا۔

"ابراہیم!" کیتھی کے پکارنے پر اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ "تمہیں نہیں لگتا آج جو تم نے کیا۔ وہ غلط تھا۔ تمہاری جان کو بھی خطرہ ہو سکتا تھا۔" کیتھی کی بات پر اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

"ہاں۔ میں جانتا ہوں میں نے جذباتی قدم اٹھایا تھا لیکن اس وقت مجھے صرف ملائکہ کا خیال تھا۔"

"ابراہیم! تم اس سے بہت محبت کرتے ہو؟"

"ہاں میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں۔" کیتھی اب بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

"میں لندن سے یہی سوچ کر آئی تھی میں نے تمہیں کھو دیا ہے۔ لندن میں جب تم نے ملائکہ کا ذکر کیا تو تمہاری آنکھوں میں میں نے اس کی محبت دیکھ لی تھی لیکن یہاں آ کر سب کچھ میری توقع کے برعکس تھا۔ تم دونوں میں دوریاں تھیں۔ پھر اس دن جو تم نے کہا میں نے تم سے پوچھا تھا کہ ابراہیم تمہاری زندگی میں ابھی بھی میری جگہ ہے تو تم نے ہی مجھے آس دلائی تھی۔"

"آئی ایم سوری کیتھی میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔"

"ہم میں کچھ اختلافات ضرور تھے لیکن میری محبت اس کے لیے اپنی جگہ پر ہے۔ ہم اگر ڈائیورس کے بارے میں سوچتے بھی تو ہمارے بڑے ہمیں ایسا بھی نہ

کرب توپتے اور اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جبکہ میں یہ جان گیا ہوں کہ وہ بھی مجھے چاہتی ہے۔" کیتھی کا سر مزید جھک گیا تھا۔

"آئی ایم سوری کیتھی! میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔" کیتھی نے آنسو صاف کرکے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"اٹس او کے ابراہام! غلطی میری ہے۔ مجھے سمجھنا چاہیے تھا۔ چلو اب۔" اسے یونہی دیکھتا پاکر وہ مسکرا کر بولی تو اس نے گاڑی اسٹارٹ کردی۔

"حنا! مجھے ملائکہ سے بات کرنا ہے۔" فراز کی آواز سن کر وہ رک گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس سارے چکر میں وہ فراز کو تو بھول ہی گئی تھی۔ پھر کچھ سوچ کر گردن ہلا کر اسے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا اس نے اندر جھانکا۔ وہ لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔

"ملائکہ! فراز کو تم سے بات کرنی ہے۔" اس نے لیٹے لیٹے حنا کو دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ حنا نے دروازہ کھول کر فراز کو اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ صوفے پر آکر بیٹھ گیا جبکہ حنا ملائکہ کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئی۔

کتنے ہی لمحے گزر گئے۔ فراز نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ سر جھکائے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ ملائکہ نے سوالیہ نظروں سے حنا کو دیکھا تو وہ کندھے اچکا کر فراز کو دیکھنے لگی۔

"فراز! تمہیں مجھ سے کوئی بات کرنی تھی۔" فراز نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تم نے ابراہیم سے ڈائیورس کی بات کی؟"

"نہیں۔" اب کے وہ گہرا سانس لے کر بولی۔

"کیوں؟" اس کے کیوں پر اس نے پہلے حنا کو اور پھر فراز کو دیکھا وہ اس کے جواب کے منتظر تھا۔

"فراز! جو وقت گزر گیا وہ واپس لوٹ کر نہیں آسکتا۔ میں پہلے جیسی نہیں ہوں اور سچ بتاؤ کیا تمہارے دل میں میرے لیے وہی جذبات ہیں؟ تمہیں صالحہ کے جذبات کا پاس ہے تمہاری امی کی محبت تمہارے قدم روک رہی ہے۔ تم خود بتاؤ اس کشمکش میں میں کہاں ہوں؟ تم اپنا دل ٹٹول کر دیکھو تمہارے دل میں بھی میرے لیے شکوک ہیں۔"

"اگر تم نے یہی کرنا تھا تو مجھے امید کیوں دلائی؟"

"وہ میری نا سمجھی تھی میں رشتوں کی اہمیت سے ناواقف تھی۔ نکاح کے دو بول کیسے بندھن میں باندھ دیتے ہیں اس حقیقت کو نہیں سمجھتی تھی وہ آج جب وہ میرے لیے آگ میں کودا تو مجھے پتا چلا کہ محبت اور رشتے کیا ہوتے ہیں۔ تم بھی تو وہیں تھے۔ تم میرے لیے آگ میں کود سکتے تھے؟"

فراز کا سر جھک گیا تھا۔ پتا نہیں وہ کیا سوچ رہا تھا۔

"ایک آخری بات۔" ملائکہ اسے دیکھ کر بولی۔ "اگر میں یہ سوچوں کہ تم مزید میری زندگی کا حصہ نہیں تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اگر میں ایک لمحہ کے لیے یہ سوچوں کہ ابراہیم میری زندگی میں نہیں تو مجھے یوں لگتا ہے میرے جینے کا مقصد ختم ہو گیا ہے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی فراز ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا تھا۔

"فراز!" اسے جاتا دیکھ کر اس نے آواز دی۔

"تم صالحہ سے شادی کرلو۔ وہ تمہیں پسند بھی کرتی ہے اور تمہارے گھر والوں کو بھی وہ پسند ہے۔" فراز نے مڑ کر چبھتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"مجھے کس سے شادی کرنی ہے اس کے لیے مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں۔" جب وہ بولا تو اس کا لہجہ بھی روکھا تھا۔

وہ دروازے سے نکلنے لگا تھا جب ملائکہ نے اسے دوبارہ آواز دی۔

"فراز! اگر تم اس طرح ناراض ہو کر جاؤ گے تو میرے دل میں ہمیشہ کے لیے افسوس رہ جائے گا۔

تم جانتے ہو میں نے کبھی سوری نہیں کیا۔ لیکن میں تم سے سوری کررہی ہوں اگر تمہارے دل میں ہماری دوستی کے لیے ذرا بھی عزت ہے تو تم مجھے معاف کردو گے۔"

فراز کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر مسکرا دیا۔ "مجھے تم پر

غصہ تو بہت تھا لیکن میں سمجھتا ہوں۔ قسمت میں ہمارا ساتھ تھا ہی نہیں۔"

وہ کہہ کر باہر نکل گیا تو حنا خوشی کے مارے اس کے گلے لگ گئی۔ "یہ تم نے بالکل صحیح فیصلہ کیا۔" اس نے الگ ہو کر اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کو روتا دیکھ کر اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی تھی۔

"ملائکہ! تم اب کیوں رو رہی ہو؟"

"حنا! مجھے ایسا لگتا ہے جیسے مجھے فیصلہ کرنے میں دیر ہو گئی ہے۔ میں نے ابراہیم کو کھو دیا ہے۔ آج وہ کمرے میں آئے تو میں جھگڑتی رہی وہ مجھے کہیں کے گھر چلو لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا میں ان سے محبت کرتی ہوں۔ تمہیں نظر آگیا فراز کو پتا چل گیا جس سے محبت کرتی ہوں اسے کیوں محسوس نہیں ہوا۔"

"ہو سکتا ہے وہ تمہاری طرف سے پہل کے منتظر ہوں۔" حنا نے جیسے سمجھ کر سرہلایا۔ "ملائکہ! اب تک تم ان کے ساتھ بہت زیادتی کرتی رہی ہو اب اظہار کرنے میں پہل تمہیں کرنا ہوگی۔"

☆ ☆ ☆

اس نے چار دفعہ ڈائل کیے اور پھر فون آف کر دیا۔ یہ تیسری بار تھا۔ آخر کار اس نے پورا نمبر ڈائل کردیا۔ دوسری بیل پر جب وہ فون بند کرنے والی تھی اس نے فون اٹھا لیا۔ اس کی ہیلو سنتے ہی اس نے فون کاٹ دیا۔ اس کا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے اس نے کوئی چوری کی ہو۔ ساتھ ہی فون دوبارہ بج اٹھا۔ تیز آواز پر فون اس کے ہاتھ میں کانپ کر رہ گیا۔ ابراہیم کا فون تھا اس نے آن کا بٹن پریس کرکے فون کان سے لگا لیا۔

"فون کیوں بند کردیا تھا؟" اس کی ہیلو سن کر وہ بولا تھا۔

"وہ غلطی سے نمبر مل گیا تھا۔" اس کے بہانے پر وہ شاید مسکرایا تھا۔ "چلو غلطی سے سہی مل تو گیا اسی بہانے بات کرلو۔"

"چلیں مجھ سے غلطی تو ہوئی آپ سے تو یہ بھی نہیں ہوئی۔" تب اس کا قہقہہ سنائی دیا تھا۔ "تم انتظار کررہی تھیں۔"

"کیوں میں پاگل ہوں۔" وہ ناراضی سے بولی۔

"کیوں پاگل اپنے شوہر کے فون کا انتظار کرتے ہیں۔"

"شوہر کو اتنا پتا نہیں کہ اس کی کوئی بیوی بھی ہے۔" اس کی شکایت پر کچھ دیر کے لیے دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

"سوری یار! آج واقعی مجھے آنا تھا لیکن کیتھی کی وجہ سے بزی رہا آج اس کی فلائیٹ تھی۔ اس کو چھوڑنے ایئرپورٹ گیا تھا۔"

ملائکہ کی نظر بے ساختہ گھڑی کی طرف گئی رات کا ایک بج رہا تھا۔ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"ملائکہ!" اس کی خاموشی محسوس کرکے اس نے پکارا تھا۔

"[illegible] ملائکہ!" اس نے کہہ کر فون بند کردیا اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

اس نے دو بیل کی آواز سنی تو چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اس وقت کون آسکتا ہے۔" وہ گھبرا کر باہر نکلی۔ جعفر حسین اور نوشابہ بھی اپنے کمرے سے نکل آئے تھے جبکہ علی لاؤنج کے دروازے میں کھڑا تھا اور اندر داخل ہونے والی ہستی کو دیکھ کر وہ سب حیران سے زیادہ پریشان ہو گئے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کی پہلی نظر ملائکہ پر پڑی جس کی آنکھیں اسے دیکھ کر پھیل گئی تھیں۔ اس پر سے نظریں ہٹا کر وہ جعفر حسین کی طرف متوجہ ہوا۔

"بیٹا! سب خیریت ہے اس وقت ...." فیروز تو ٹھیک ہے؟"

"جی انکل! سب ٹھیک ہے۔ میں ملائکہ کو لینے آیا ہوں۔"

"اس وقت...!" انہوں نے کچھ حیران ہو کر پہلے

ابراہیم کو پھر ملائکہ کو دیکھا۔

"شکل ایسا نے کہا تھا ملائکہ کو لے آؤ۔"

"ہاں۔ ٹھیک ہے بیٹا!" نوشابہ نے اس کی مشکل آسان کردی تھی۔

"ملائکہ بیٹا! جا رہا ہے آپ نے؟" جعفر حسین کے پوچھنے پر سب کی نظریں اس پر ٹک گئیں۔ اس کا سر اثبات میں ہلا تھا اور ابراہیم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

کار ڈرائیو کرتے ہوئے وہ کچھ دیر بعد اسے بھی دیکھ لیتا تھا جو منہ موڑے بیٹھی تھی۔ اس نے اچانک ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھاما تو ملائکہ نے چونک کر اسے دیکھا جو سامنے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ کھینچا لیکن اس کی گرفت مضبوط تھی۔

"ہاتھ چھوڑیں میرا۔"

"کیوں؟" وہ مسکرا کر بولا۔

"میرے ساتھ فری ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"تو کس کے ساتھ فری ہوں؟"

"جسے چھوڑنے ایئرپورٹ گئے تھے۔" اب کی بار وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"جیلس ہو رہی ہو؟"

"میں کیوں جیلس ہوں گی۔" وہ منہ بسور کر بولی۔ اب وہ کچھ نہیں بولا اور ہاتھ بھی نہیں چھوڑا تھا اور اس نے بھی نہیں چھڑایا تھا۔ لاؤنج کا دروازہ کھلا تھا۔ جب وہ اندر داخل ہوئے فیروز صاحب انتظار کر رہے تھے۔ ان کی نظر آگے کھڑے ابراہیم پر پڑی تھی۔

"کب سے انتظار کر رہا ہوں کہاں رہ گئے تھے کم از کم فون ہی کر دیتے۔"

ان کی بات ملائکہ پر نظر پڑتے ہی ادھوری رہ گئی۔ انہوں نے خوشگوار حیرت سے اسے دیکھا۔

"پاپا! ملائکہ نے فون کر کے بلایا تھا۔ اسے لینے گیا تھا۔"

ملائکہ نے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

"جھوٹ چاچاجی میں نے نہیں بلایا۔ یہ مجھے لے کر آئے ہیں۔" وہ سر جھکائے مسکراتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا جبکہ وہ ہاتھ مسلتے ہوئے کھڑی تھی۔ فیروز صاحب چل کر اس کے سامنے آگئے۔

"بیٹا! ایسے کیوں کھڑی ہو؟ یہ تمہارا گھر ہے جب مرضی آؤ۔ سچ بتاؤں تمہیں دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔ لگتا ہے گھر جگمگانے لگا ہے۔"

ان کی بات پر وہ سر جھکا کر مسکرا دی تو انہوں نے اس کا ماتھا چوم لیا۔

"سدا خوش رہو جاؤ۔ بہت رات ہو گئی ہے آرام کرو۔" وہ اس کا سر تھپک کر مڑ گئے تو اس نے گہرا سانس لے کر سر اٹھایا۔

کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے بہت جھجکتے ہوئے دروازہ کھولا تھا۔ اگلے ہی پل تیزی سے چلتی سانسیں معمول پر آئی تھیں۔ وہ کمرے میں نہیں تھا۔ وہ چلتی ہوئی صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے نائٹ سوٹ میں باتھ روم سے باہر نکلا تھا۔

"آج تو دن بہت تھکانے والا تھا۔" وہ کہتے ہوئے بیڈ پر لیٹ گیا پھر اس کی طرف کروٹ بدل کر اسے دیکھنے لگا۔

"ملائکہ!" اچانک سناٹے میں اس کی جذبات سے بوجھل آواز ابھری تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"یہاں آؤ۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلا لیا۔ وہ ٹرانس کی کیفیت میں چلتی ہوئی اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ وہ سر جھکائے اس کے سامنے بیٹھی تھی لیکن جانتی تھی کہ وہ اسے ہی دیکھ رہا ہے۔ ابراہیم نے اس کا ہاتھ تھاما تو اس کی نظریں خود بخود ابراہیم کی طرف اٹھ گئیں۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہاں سے شروع کروں۔ وہاں سے جب تم مجھے پہلی بار اچھی لگی تھیں۔ پہلی بار مجھے ان آنکھوں نے بہت متاثر کیا تھا۔" اس نے شہادت کی انگلی سے اس کی آنکھ کو چھوا تھا "اور محبت تب ہوئی جب میں نے تمہیں دلہن کے روپ میں دیکھا۔ یہ پیچھے دیوار پر اسی کی تصویر دیکھ رہی ہو میں ہر روز سونے سے پہلے اسے دیکھتا اور میری صبح بھی تمہاری تصویر کو دیکھ کر ہوتی اور میں اس دن کا انتظار کرنے لگا جب تم حقیقت میں میرے پاس ہو گی لیکن سب میری سوچ کے برعکس ہوا۔"

اس نے گہرا سانس لیا تو ملائکہ کی نظریں شرمندگی سے جھک گئیں۔

"مجھے تم پر بڑا غصہ تھا اور میں نے کوشش بھی کی میں تم سے نفرت کروں لیکن میں تم سے اس قدر محبت کر چکا تھا کہ نفرت کا احساس بھی محبت میں بدل جاتا تھا۔" ملائکہ کی آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگا۔

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی اور وہ جو بڑے موڈ میں اپنی کہانی سنا رہا تھا گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

"ملائکہ!" اس نے پریشان ہو کر اس کے ہاتھ ہٹانے چاہے لیکن وہ ایک دم اس کے سینے سے لگ گئی۔

"میں بھی آپ سے بہت پیار کرتی ہوں اتنا زیادہ کہ میں آپ سے کہہ نہیں سکتی۔"

ابراہیم ایک پل کے لیے حیران ہوا پھر مسکرا کر دونوں بازو اس کے گرد پھیلا دیے۔

"آپ مجھ سے کچھ پوچھیں گے نہیں کہ میں نے یہ سب کیوں کیا؟"

ابراہیم نے نفی میں سر ہلایا "جو گزر گیا وہ ختم ہو گیا۔ ساری زندگی گزارنے کے لیے یہ کافی نہیں کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو اور میں تم سے۔" ملائکہ کتنی دیر تک اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"کیا مجھ پر بہت زیادہ پیار آ رہا ہے؟" اسے غور سے دیکھتا پا کر وہ شرارت سے بولا تو وہ سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"سونے۔" وہ صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ ابراہیم کچھ دیر آنکھوں میں الجھن لیے اسے دیکھتا رہا۔ ملائکہ نے مسکراہٹ چھپانے کے لیے چہرہ موڑ کر کمبل اوپر تک اوڑھ لیا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد کمبل ابراہیم نے اس کے اوپر سے کھینچ کر اتارا تو وہ گھبرا کر سیدھی ہوئی۔

"یہ کمبل میرا ہے۔" وہ کمبل لے کر واپس بیڈ پر چلا گیا جبکہ وہ تھوڑی دیر کمبل میں ڈھکے اس کے وجود کو گھورتی رہی پھر غصے سے اٹھی۔ کمبل کھینچنے کے لیے اس نے ہاتھ بڑھایا تھا لیکن اس سے پہلے اس کا ہاتھ ابراہیم کے ہاتھ میں آگیا تھا اس نے ایک جھٹکا دیا تھا اور وہ اس کے اوپر گری۔ ابراہیم نے کمبل سے چہرہ نکال کر اسے دیکھا۔

"میڈم اس کمبل کے ساتھ یہ بندہ فری مل رہا ہے آخری آفر ہے لے لیں ورنہ اس آفر سے کوئی بھی فائدہ اٹھا سکتی ہے۔" وہ جو مسکراتے ہوئے اس کی آفر سن رہی تھی۔

آخری بات پر اس نے بے ساختہ مکا اس کے کندھے پر رسید کیا تھا اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ اور ان دونوں کے ساتھ کمرے کے در و دیوار بھی ہنس پڑے تھے۔

☆

رخسانہ نگار عدنان

کوئی مہک سی ہو

نصرت میٹھے لہجے میں روحیل کو ذمے داریوں کا احساس دلاتے ہوئے شادی نہ کرنے کا کہتی ہے تو روحیل پر نصرت کے اچھے رویئے کا بھید کھلتا ہے۔ حالات سے ناامید ہو کر اسے زونیو کی باتیں بھی محسوس ہوتی ہیں اور وہ ایک بار پھر ثانیہ کی طرف کھنچنے لگتا ہے۔

زونیو شہباز سے رشتے طے ہونے سے پہلے ہر صورت میں ثانیہ اور روحیل کی ملاقات چاہتی ہے۔ وہ زونیرا کے جھانسے میں آ کر روحیل سے ملنے کو تیار ہو جاتی ہے۔

ہوٹل میں روحیل کا التفات ثانیہ کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ وہ زونیرا کا دیا تحفہ روحیل کو دے کر جان چھڑانا چاہتی ہے۔ عین وقت پر زونیرا کے بلاوے پر بلال پہنچ کر معاملے کو سنگین بنا دیتا ہے۔ بلال اس ملاقات کو اسی انداز میں لیتا ہے جیسا زونیرا چاہتی ہے۔ زونیرا ثانیہ کو یہاں لے کر آنے سے صاف مکر جاتی ہے جس پر ثانیہ دنگ رہ جاتی ہے۔ بلال روحیل کا گریبان پکڑ کر اسی وقت حساب بے باق کرنے کی ٹھان لیتا ہے۔ ثانیہ کے سمجھانے اور روکنے پر وہ اسی وقت "طلاق" کا لفظ استعمال کر کے اسے ساکت کر دیتا ہے۔ یہ صورت حال بیگم افضال کے لیے پریشانی اور دکھ کا باعث ہے۔ اس ماحول میں زونیرا سب سے زیادہ مطمئن ہے جس کی راہ کا کانٹا صاف ہو چکا ہے۔

دوسری طرف روحیل کی گمشدگی نصرت کو ہولا رہی ہے ہر طرف سے چھان بین پر بھی اس کا سراغ نہیں ملتا۔ وہ سمجھتی ہے کہ ثانیہ اور روحیل نے تجدید محبت کر لی ہے کہ ایک دن اچانک کسی کی آمد رات گئے نصرت کو ساکت کر دیتی ہے۔ (اب آگے پڑھیے)

۱۵

پندرھویں قسط

"میرے خیال میں اس مہینے کی اٹھائیس تاریخ ٹھیک رہے گی۔ دن بھی جمعۃ المبارک کا ہے۔ کیوں بھائی جان؟" مسز حامد جو اس سارے معاملے میں بنیادی کردار ادا کرتی رہی تھیں اس موقع پر بھی بولنے میں انہوں نے ہی پہل کی۔

"اتنی جلدی ابھی تو۔" فضیلہ مبشر کچھ بوکھلا سی گئیں۔

فقط بائیس دن کی دوری پر زونی ان سے اتنی دور چلی جائے گی۔ انہوں نے تو ابھی ایسا کچھ سوچا بھی نہیں تھا۔

اور یہ بھی انہیں اندازہ نہیں تھا کہ آج ڈنر میں ہی تاریخ کا بھی تعین کر لیا جائے گا' بلال نے بھی کچھ کنفیوز ہو کر ماں کی طرف دیکھا۔

"جلدی کہاں میڈم مبشر! اتنے مہینوں سے تو یہ سلسلہ چل رہا ہے پھر یہ تو چند دن بعد بھی طے کرنا ہی ہے۔"

"دراصل..." وہ قبول نہیں کر پا رہی تھیں۔

"اصل میں بھائی جان کو پھر سے یورپ کے بزنس ٹور پر نکلنا ہے۔ جس کا مطلب ہے اگلے تین چار ماہ تو پھر..." مسز حامد بھائی کی طرف دیکھ کر بولیں۔

وہ بھی جواباً مسکرائے گویا یہ سب کچھ پہلے سے طے کیا جا چکا تھا۔

"سلمیٰ بھابھی کی بھی کچھ ایسی ہی مرضی ہے۔" انہوں نے بھائی کو بھی ہم نوا کرنا چاہا۔

"اور پھر بلال بیٹے کو بھی تو جانا ہے اور ہاں یاد آیا۔" آج مسز حامد خوب چہک رہی تھیں۔ ان کے توسط سے شروع ہونے والا یہ کام تکمیل کے مرحلے پر جو تھا۔

"آپ نے اس دن ذکر کیا تھا خیر سے آپ کی بہو۔ اللہ کا فضل ہوا ہے تو پھر ظاہر ہے دو چار ماہ بعد تو آپ کے لیے زیادہ مشکل ہو جائے گی۔ ابھی تو وہ پھر بھی یہ سب فنکشنز اٹینڈ کر سکتی ہے میں نے ٹھیک کہا نا۔"

اور فضیلہ جیسے سُن سی ہو کر رہ گئیں۔

بلال بڑے خوب صورت نازک سے کپ میں پڑے قہوے کو یک ٹک دیکھنے لگا۔

قہوے کے سنہری دھوئیں میں کہیں ثانیہ کی ڈوبتی ابھرتی شبیہہ تھی۔

"پھر کیا کہتی ہیں آپ؟" ان دونوں کی چپ پر وہ کچھ بے چین سی ہو کر پھر سے بولیں۔

فضیلہ نے سوچا نہیں تھا کہ یہ سب اتنا اچانک اتنی جلدی ہو جائے گا اور انہیں چیزوں کو فوری طور پر سیٹ کرنا ایک ناممکن سا عمل لگ رہا تھا۔

ثانیہ کی غیر موجودگی... ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بن جاتا اس سارے فنکشن میں۔

وہ کس کس کو کیا کیا جواب دیتیں۔ جی چاہا پہلو میں بیٹھے بلال کو ایک بار پھر خوب کھری کھری سنا ڈالیں۔

اس کے جذباتی پن نے انہیں کس مصیبت میں مبتلا کر ڈالا تھا۔

"جی ہاں صحیح کہا آپ نے مگر پھر بھی ہمیں سوچنے کے لیے کچھ وقت تو دیں۔" وہ بے بسی سے جبراً مسکرا کر بولیں۔

"بس تو پھر بھائی جان! بھائی جان طے ہو گیا۔ اس مہینے کی اٹھائیس تاریخ۔" مسز حامد نے جیسے ان کے منہ سے لفظ "طے" والا نتیجہ نکالا تھا وہ فوری طور پر انکار بھی نہ کر سکیں۔

وہ خود ہی سب کے آگے مٹھائی کی ڈش کرنے لگیں

دونوں میاں بیوی نے فضیلہ اور بلال کو مبارک دی۔

اور مسز حامد کو تو ایسی کسی فارمیلٹی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ زبردستی سب کو مٹھائی کھلانے کے بعد اب خود اس سے پوری طرح سے انصاف کر رہی تھیں۔

"اور یہ سب میری بہن کی کوشش سے ہوا کہ آپ جیسے خاندانی شریف اور اتنے تعلیم یافتہ گھرانے میں میرے بیٹے کا رشتہ ہوا بہت شکریہ آپا جان۔"

ان کے بھائی وقار صاحب نے اس سارے وقت میں پہلی بار اتنا تفصیلی جملہ بولا۔

"ارے بھائی جان شہری میرا ہی تو بیٹا ہے۔" وہ کھل اٹھیں۔

"بھول گئیں سلمیٰ یاد ہے نا آپ کو جب شہری پیدا ہوا تو ڈاکٹروں نے کہا تھا بچے کا وزن نارمل سے بہت کم ہے اور اس کا بچنا ان کے منہ میں خاک اور آپ کی تو ایسی حالت تھی کہ خود کو بھی نہ سنبھال پائیں۔ پورے پینتالیس دن شہری میری گود میں روئی میں لپٹا کسی چوزے کی طرح پڑا رہا تھا اور اللہ کا شکر ہے آج اس نے مجھے سرخرو کیا۔"

وہ آخر میں آب دیدہ سی ہو گئیں۔

"اور بس جی ہمارے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ آپ خود تعلیم یافتہ ہیں یہ جہیز وغیرہ کی نہ ہمیں ضرورت ہے نہ ہمارے گھر میں کسی چیز کی کمی بس آپ کی سلجھی ہوئی پڑھی لکھی بیٹی ہمارے گھر کو اپنے زیورِ علم سے آراستہ کر دے ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے۔"

وقار صاحب ذرا توقف سے پھر مدبرانہ انداز میں بولے۔

سلمیٰ کا چہرہ بے تاثر تھا۔

"شہریار نہیں آیا۔ ہم مل لیتے۔" انہیں دوسری بار یہ خیال آیا تو کہہ ہی بیٹھیں۔

"اصل میں آفس سے باہر نکل اچانک کسی کام سے جانا پڑ گیا ورنہ یقین کریں اتنے دن تو وہ سر شام ہی گھر آ جاتا ہے۔"

مسز حامد پھر سے بولیں۔

سلمیٰ یا تو بولتی کم تھیں یا مسز حامد نے ہی بولنے کا منصب سنبھال رکھا تھا۔

"لیکن آپ فکر نہیں کریں۔" محبت بھری نظر بھائی کی طرف دیکھ کر کہیں۔ "کل انشاء اللہ میں بھائی جان کے ساتھ شہری کو لے کر آپ کی طرف چلے آتے ہیں۔ شہری اور زونیرا بیٹی کی ملاقات بھی ہو جائے گی کیا خیال ہے آپ کا؟"

"ضرور کیوں نہیں۔" وہ خوش دلی سے مسکرائیں۔

اور یہ تو انہوں نے واقعی نہیں سوچا تھا کہ زونیرا کا اتنے اچھے گھر میں رشتہ ہو جائے گا اور وہ بھی اتنی جلدی۔

"اور میں جو بار بار نہیں کر رہی ہوں کہیں یہ بھی کفرانِ نعمت نہ ہو اللہ پاک مجھے معاف کرنا۔"

وہ خود بخود مسکرانے لگیں۔ کچھ دیر پہلے جو انجانا سا خدشہ اور الجھن سا احساس تھا اتنی جلدی سب کچھ ہو جانے کا ان کی کیفیت بدلتے ہی سب کچھ اچھا لگنے لگا وہ پوری دل جمعی سے اگلی تفصیلات دلچسپی سے طے کرنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

نصرت کے لیے لمحہ حیرت تھا یا لمحہ قیامت وہ فوری طور پر فیصلہ نہ کر سکی روحیل اور بسمہ اس کے سامنے کھڑے تھے اگرچہ بسمہ کچھ ایسے دلہناپے کے روپ میں نہیں تھی مگر پھر بھی نصرت کی نیند سے بوجھل آنکھوں کو جھٹکے سے اس کے پیچھے سے انداز نے ہی کھولا تھا۔

وہ اندھی تھی مگر پھر بھی خود کو چھپانے کے لیے روحیل کے بازو کی طرف کھسکتی جا رہی تھی۔

گویا اسے نصرت کے رویے کا پہلے سے اندازہ تھا۔

"کہاں... کہاں تھے تم اتنے دن؟" وہ اپنے تئیں بسمہ کو نظر انداز کر کے روحیل سے اپنائیت بھری خفگی سے بولی۔

"اماں یہ بسمہ ہے۔ ہم نے آج شام ہی نکاح کیا ہے۔"

"کیا...؟" جانتے بوجھتے بھی نصرت کو لگا جیسے وہ منزلہ مکان پورے کا پورا اس پر آن گرا ہو۔

"نکاح کیا ہے یا یہ بھاگ کر آئی ہے تیرے ساتھ؟" وہ نفرت بھرے انداز میں پھنکار کر بولی۔

"اماں!" وہ ناراضی سے بولا۔

"نکاح کیا ہے میں نے اس سے اس کی مرضی اور اپنی خوشی سے اور اس کے گھر جا کر اس کی ماں کی رضامندی اور گواہوں کی موجودگی میں۔" اس نے رک رک کر تفصیلی جواب دے دیا۔

"تو تیری ماں' گھر والے سب مر گئے تھے کیا؟" وہ ایک دم شیرنی کی طرح دھاڑی۔

"یہ رات کے اندھیرے میں نکاح کر کے لانے والے شریف لوگ ہوتے ہیں نہ نکاح میں آنے

والیاں۔" وہ پھر سے اسی حقارت سے بولی۔ اور پوری طرح سے دروازے میں تن کر کھڑی ہو گئی۔

"ہاں! یہ سب کچھ جلدی میں کرنا پڑا" ورنہ میرا چھپانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور پھر آپ سے کیا چھپانا ......تھیں۔"

"بس۔" نصرت پلٹ کر بولی۔

"ہم شریف لوگ ہیں تیرا باپ بھلے امیر کبیر نہیں تھا مگر محلے میں اس کی جتنی عزت تھی۔ لوگ کسی بھی جھگڑے جھڑے میں اس کی گواہی اور ثالثی کو حق سچ جانتے تھے اور اس کا بیٹا یوں چپ چھپتے (چاپ) رات کے کالے اندھیرے میں اس جیسی اندھی کالی لڑکی کو بیاہ کرلے آئے اور بات سنو میری۔" وہ رک کر بولی۔

"جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا نکاح ہوا بھی یا ـــ"

"اماں! بس ـــ اس سے زیادہ ایک لفظ نہیں بہت شرافت دکھائی میں نے پہلے بھی اور اب بھی مگر اس سے زیادہ مجھ سے توقع نہیں رکھنا۔" وہ ایک بالکل بدلا ہوا روحیل تھا۔

"اور اچھا کیا تم نے ابا کا ذکر کر دیا تو کان کھول کے سنو یہ بھی یاد کرلو۔ میں اس کی سب سے بڑی اولاد ہوں۔ اس کے چھوڑے ہوئے ترکے کا نصف کا حصے دار ـــ بالغ عقل رکھتا ہوں اپنی مرضی سے نکاح کرنے کا حق مجھے قانون بھی دیتا ہے اور شریعت بھی۔

اس لیے تم اب مزید انکوائری بند کرو اور رستے سے ہٹو یہ گھر جتنا تمہارا اور تمہارے بچوں کا ہے اتنا میرا بھی ہے۔"

دوسرا لمحہ پہلے سے بھی حیران کن تھا۔

روحیل نصرت کو پرے دھکیل کر عیشہ کا بازو پکڑ کر اندر لے جا چکا تھا اور نصرت کسی بت کی طرح زمین میں گڑی دیکھتی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن شہیار آیا تھا اپنی پھوپھی مسز حامد اور باپ کے ساتھ۔

فضیلہ اگرچہ اس سے پہلی بار نہیں مل رہی تھیں مگر پھر بھی کچھ نیا پن سا لگا یا کچھ ایسا جو وہ سمجھ نہیں سکیں اور اپنی اس عجیب کیفیت کا اظہار وہ خود سے بھی نہیں کر سکیں۔ کسی اور سے کیسے کرتیں۔

وہ نوئیرا کے چہرے کی خوشی کو ذرا سا بھی پھیکا پڑتا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

اور اس کی خوشی جیسے اس کی آنکھوں' رخساروں' ہونٹوں' باتوں اور منہ کی حرکت و سکنات سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ وہ نظر ٹھہرا کر اسے دیکھ نہیں رہی تھیں۔

"نوئی کو کہیں میری ہی نظر نہ لگ جائے۔" وہ دل میں اس کے لیے آیات پڑھنے لگیں۔

شہیار اور نوئی کمرے کے اختتامی حصے میں کیا باتیں کر رہے تھے۔ انہیں آواز تو نہیں آرہی تھی مگر انداز تھا۔ بہت خوشگوار دل کو دھڑکا دینے والی ایک دوسرے کو کھینچ کر جوڑ دینے والی باتیں تو تب ہی تو ـــ شہیار جو آتے ہی جلدی میں تھا۔ اب کافی دیر سے گھڑی کی سوئیوں کی رفتار ناپے بغیر صرف نوئی میں مگن تھا۔

"میں نے کہا تھا نا ہماری نوئی بہت خوش رہے گی۔ شوہر کے ساتھ۔" مسز حامد نے ان کی محویت بھانپ کر سرگوشی کی۔

وہ جواب میں مسکرا دیں۔

"آپ کی بہو نظر نہیں آرہی ـــ کل بھی آپ اسے ساتھ نہیں لائی تھیں۔" انہیں اچانک یاد آگیا۔

"ہاں ـــ وہ تو ـــ اصل میں اس حال میں تو آپ کو پتا ہے کہ لڑکیاں ماں کے پاس ہی رہنا پسند کرتی ہیں تو ـــ کل بھی اگرچہ میں نے اسے روکا تھا مگر ظاہر ہے۔ کچھ زیادہ تو نہیں کہہ سکتی تھی۔"

انہوں نے نظریں چرا کر رک رک کر کہا۔

"اچھا تو اپنی والدہ کی طرف گئی ہے تب ہی بلال بیٹا کل سے کھویا کھویا گم صم سا ہے۔" انہوں نے بلال کو دیکھ کر کہا اور ہنسنے لگیں۔

"لیکن اب آپ اسے بلوالیں کیونکہ شادی میں دن ہی کتنے ہیں ظاہر ہے ساری تیاری اسے ہی تو کرنا ہو گی۔" وہ تاکید کرتی ہوئی بولیں۔

فضیلہ نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

"اور ہاں فضیلہ! میرا ابھی شادی کے بعد حامد کے ساتھ دبئی سیٹل ہونے کا پروگرام بن رہا ہے۔" انہوں نے اچانک کہا تو فضیلہ کچھ پریشان سی ہو گئیں۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو نعیمہ!" وہ اٹک کر بولیں۔

"بھئی شادی کے بعد ہی بولا ہے میں نے۔ فکر نہ کرو سب کچھ کرکے جاؤں گی۔ شرکت تو میری دونوں طرف سے ہو سکتی ہے۔" وہ خوش دلی سے بولیں۔

فضیلہ جواب میں کچھ کہہ نہیں سکیں۔

"اصل میں اتنے سالوں سے حامد دبئی میں اکیلے رہ رہے ہیں اور میں جاب کی وجہ سے یہاں۔ بچے نہ ہونے کا یہ بھی تو نقصان ہوتا ہے۔" وہ آہستگی سے بولیں۔

"مگر تم تو کہتی تھیں ـــ" وہ رک سی گئیں' بات کچھ سنی سنائی سی تھی جو کبھی میں آیا پوچھیں یا رہنے دیں جو بھی تھا اب مسز حامد سے خاصا قریبی اور نازک سا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔

"دوسری شادی کر رکھی ہے حامد نے' ہے نا!" وہ پھیکی سی مسکراہٹ سے بولیں۔ فضیلہ نے آہستگی سے سر ہلایا۔

"ہاں کرلی تھی۔" وہ خاموشی کے ایک تکلیف دہ وقفے کے بعد بولیں۔

"اور میں نے علیحدگی کا بھی سوچ لیا تھا۔ خلع کا دعوا بھی کرنا چاہتی تھی مگر کی دوسری وابستگی عورت کو کس قدر برافروختہ کر دیتی ہے شاید تم بھی اس مرحلے سے گزر چکی ہو۔"

اور فضیلہ نظریں چرا گئیں۔

"مبشر سے دلی وابستگی ہوتی تو اس کی دوسری شادی کا دکھ بھی ہوتا۔" "لیکن نہیں ایسا ہوا تھا۔

جس رات انہیں مبشر کی دوسری شادی کی خبر ملی تھی وہ اس رات اور آنے والی کتنی ساری راتیں سکون کی نیند نہیں سو سکی تھیں۔

"مگر پھر کسی خیر خواہ نے جڑا" مجھے اس سے روکے رکھا۔

طلاق لے کر کیا کرو گی۔ دوسری شادی کون کرے گا تم سے ـــ بس تم ہی نہیں سکتیں تو کوئی پہلے سے بچوں والا اس کو بھلا تم سے کیا دلچسپی ہوگی سوائے اس کے کہ تم اس کے بچے پالو۔"

وہ افسردگی سے بولیں۔ فضیلہ نے کچھ پوچھنا چاہا پھر چپ کر گئیں۔

"طلاق نہ لو' حامد کے ضمیر پر بوجھ بنی رہو ایک نہ ایک دن تمہاری طرف ضرور لوٹ کر آئے گا۔ اپنے انکار کو بھی محبت بنا دو وہ اسے ضرور کھینچ کر لائے گی۔" جانے مشورہ دینے والے کے مشورے میں اثر تھا یا میرے ذہن کی کیفیت اس لمحے کچھ ایسی تھی کہ میں نے خاموشی اختیار کرلی۔

اور حامد کی دوسری شادی چند ماہ ہی چل سکی اور جانے کیسے جس خاموشی سے قائم ہوئی تھی۔ اسی خاموشی سے ٹوٹ بھی گئی۔ میں نے اس دوران حامد سے کوئی رابطہ نہیں رکھا۔"

"کتنی صبر والی عورت ہے۔" فضیلہ نے نعیمہ کو رشک سے دیکھا۔

"اور دو تین سال بعد جب حامد شرمندہ سے خود ہی چلے آئے۔ میں نے کچھ پوچھا نہ انہوں نے بتایا مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں نے چھ ماہ کی چھٹی لی اور ان کے ساتھ چلی گئی اور اب کئی سالوں سے یہ سلسلہ جاری تھا لیکن اب فضیلہ میں تھک سی گئی ہوں' یہ بار بار کا آنا جانا پھر حامد ٹھیک نہیں رہتے تو مجھے ان کے پاس ہی ہونا چاہیے نا۔"

"بالکل ٹھیک فیصلہ کیا تم نے مجھے خوشی ہوئی۔" انہوں نے مسکرا کر تائید کی۔

"ہاں یہ تنہائی' یہ اکیلا پن ـــ کسی زہریلے ناگ کی طرح ہوتا ہے' دن بھر خاموش' بے حس ایک جگہ پڑا رہتا ہے اور رات کی سیاہی پھیلتے ہی پھن پھیلائے بے دردی سے آپ کے سامنے تن کر کھڑا ہو جاتا ہے پھر تو جیسے کوئی فرار کی راہ بچتی نہیں اور بہت سال بہت بہادری سے میں نے اس سیاہ ناگ کا سامنا کیا۔ مگر اب

نہیں ہے۔ بہت مشکل ہے یوں رہنا' اعصاب تھک سے گئے ہیں۔" وہ واقعی بہت نڈھال سی لگ رہی تھیں۔

"شہریار سے مجھے دلی پیار تھا اور زونی کو دیکھ کر ہمیشہ سے ان دونوں کی شادی کا خیال آتا تھا۔ خدا نے میری یہ آرزو بھی پوری کر دی۔ اب حامد کے ساتھ جا کر جی کرنا ہے اور بس۔"

"تو نہیں آ کر سیٹل ہو جاؤ وہاں تمہارا دل کہاں لگے گا؟" وہ مشورہ دیتے ہوئے بولیں۔

"حامد نہیں مانتے ان کا بزنس وہاں سیٹ ہے۔ دیکھو کوشش کروں گی اگر کبھی وہ مان گئے اور اسی وجہ سے تو اتنے سال ہم الگ رہے کہ میرا وہاں دل نہیں لگتا تھا اور حامد آنا نہیں چاہتے تھے اور آخر میں مجھے ہی ہار ماننا پڑی۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ سے بولیں۔

"بلال تو تعلیم مکمل کرتے ہی آ جائے گا نا تمہارے پاس۔" وہ ان کی طرف دیکھ کر بولیں وہ وقار صاحب کے ساتھ باتوں میں مگن تھا۔

"ہوں!" وہ بے دھیان سی بولیں۔

"تم ثانیہ کو اپنے ساتھ ہی رکھنا اس لڑکی کی آنکھ میں لحاظ ہے اور مروت بھی پھر تمہارا احسان بھی ہے اس پر عمر بھر تم سے دب کر رہے گی۔ اسے خود سے الگ نہیں کرنا۔ وہ خدمت کرنے والی لڑکی ہے۔"

اور فضیلہ حیرت بھری نظروں سے انہیں دیکھتی رہ گئیں۔

وہ اپنی تنہائی کو دور کرنے کا یہ موقع بھی گنوا چکی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ بے ضرر سی اندھی لڑکی نصرت کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکنے لگی تھی بس نہیں چل رہا تھا اسے ہاتھ سے پکڑ کر گھر سے باہر دھکیل کر دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دے۔

مگر روحیل نے جو رات میں کہا تھا کہ وہ اس گھر اور کاروبار کا نصف کا حق دار ہے اور وہ اب ایسا سوچنے کی بھی ہمت نہیں رہی تھی۔

مگر نفرت سے اس کا کیا کرتیں کہ بسمہ کو دیکھتے ہی اس کے پورے بدن میں جیسے چیونٹیاں سی رینگنے لگتیں۔

"منحوس اندھی کو ڈی کہاں سے اٹھا کر لے آیا جس کی عیار ماں کو تو پورے محلے میں وہ کوڑی کا کر کے آئی۔ فتنی چہرے سے کیسی بھولی بھالی بنی ہوتی تھی کہ اسے تو روحیل کا پتا نہیں اور اندر یہ کھچڑی پک رہی تھی۔" وہ دل کھا کھا کر رہ جاتی۔

وہ جا کر کے محلے بھر میں ذلیل بھی کر آتی مگر پھر روحیل کا کھور! اسے روحیل کی آنکھوں میں وہی بد لحاظی نظر آئی تھی جب اس نے پہلی بار اس پر چھری اٹھائی تھی۔

وہ حقیقتاً ڈر کر رہ گئی تھی۔

"مگر یہ منحوس بھی تو گوارا نہیں۔" ذرا اپنی جگہ مگر یہ چلتا پھرتا عذاب اس کی نظروں اور سماعتوں کے لیے ایک مسلسل عذاب تھا۔

وہ دیواروں کو ٹٹولتی چیزوں کو چھوتی چند ہفتوں میں اپنے کمرے کے علاوہ پورے گھر سے خوب واقفیت حاصل کر چکی تھی۔

"اماں! بھائی یہ کیا عجوبہ اٹھا کر لے آیا' ایسا مال تو اندھی سینٹر میں ڈالا جاتا ہے بھائی کو یہی اندھی ملی تھی کیا۔"

ثناء کی زبان تو آج کل یوں بھی پھسلی پڑتی تھی بسمہ کو دیکھ کر بھلا کیسے چپ رہ سکتی تھی۔

"تو بکواس بند کر اپنی۔" وہ اپنا غصہ اس پر اتار کر بولی۔

"طویلے کی بلا بندر کے سر اماں! بھگتنا ہے تو اس اندھی کو گھوٹ جا کر میری تو ان بس یا بس دنوں میں خوب کھال کھینچ چکی تھی۔" وہ بے شرمی سے آنکھیں مٹکا کر بولی۔

وہ تو صبح سے بسمہ سے کئی بھونڈے مذاق بھی کر چکی تھی۔ بار بار اس کے آگے جا کر اپنے ہاتھ اس کی آنکھوں کے سامنے کر کے کہتی۔ "بھابی! بتاؤ تو یہ کتنی

انگلیاں ہیں۔"

بسمہ آنکھیں خلا میں گاڑے بے چارگی کی تصویر بنی رہتی۔

"اماں! واقعی اندھی ہے' تحمل نہیں کر رہی سچ مچ فارغ ہے۔" وہ مڑ کر علی الاعلان کہتی اور بسمہ ذلتوں میں گڑ جاتی۔

اور نصرت کو یہی غم کھائے جا رہا تھا ابھی محلے میں جس جس کو خبر ہوگی وہ مبارک باد دینے چلا آئے گا اور پھر جب پتا چلے گا کہ دلہن اندھی ہے تو کیا گت نہ بنے گی نصرت کی۔

اور تب کیسے طعنے کا تمیں گی سوچ کر بھی نصرت کو پسینے آ رہے تھے مگر وہ روحیل کو بھی کچھ نہیں کہہ سکتی تھی نہ بسمہ کو کہیں چھپا سکتی تھی۔

"میرے اللہ کیا کروں؟" سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھٹنے لگا۔ ثناء تیار ہو کر نکل رہی تھی جب نصرت اپنا بھاری سر لیے کچن کی طرف جا رہی تھی۔

"کدھر جا رہی ہے تو؟" وہ وہیں سے دھاڑی۔

"اماں! اکیڈمی بھول گئی کیا ٹائم ہو گیا ہے میری اکیڈمی کا۔" وہ وہیں سے اتراتی ہوئی بولی۔

"یہ ٹائم تجھے بڑا یاد رہتا ہے اسکول تو آج تک ٹائم سے گئی نہ تو۔"

"یہ چکر کیا ہے تیری اکیڈمیوں کا؟"

نصرت کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی لپک کر آئی۔ مگر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

"اس بے غیرت کو تو اب روحیل ہی نکیل ڈال سکتا ہے اور اس کے لیے مجھے روحیل سے بھی بنا کر رکھنی ہوگی اور بسمہ کو بھی دل سے نہ سہی مگر قبول کرنا پڑے گا۔"

وہ جو تھی وہ راتوں سے نہیں سمجھ رہی تھی پل بھر میں عقل میں آ گئی۔ وہ بہرے سے کچھ دن پہلے والی نصرت بننے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"تو آپ کو انہیں صاف کہہ دینا چاہیے تھا کہ بلال بھائی نے اس بدچلن لڑکی کو طلاق دے دی ہے۔" وہ فضیلہ سے ترش کر بولی۔

"زونیرہ!" انہیں بھی بھر کر طیش آیا کہ شاید وہ اسے مار ہی ڈالتیں مگر وہ یہ بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

"تو مام کیا حرج ہے سچ کو سچ بتانے میں؟" وہ لاپروا سے لہجے میں بولی۔

"ایک بات میری دھیان سے سن لو اور شاید اس کے بعد میں اسے دہرانا بھی پسند نہ کروں۔" وہ بہت سا غصہ دبا کر بولیں۔

"تم آئندہ ثانیہ کے لیے ایسا کوئی بہتان بھرا لفظ استعمال نہیں کرو گی وہ کیا تھی یا کیا نہیں تھی اب تمہارے بھائی کا تمہارے خاندان کا اس کے ساتھ معاملہ ختم ہو چکا تو تم اس پہ ایک ذرا سی بھی الزام تراشی کرو گی تو پھر تم خدا کی مجرم ہو گی اور اس کی پکڑ اس طرح کے کاموں میں کتنی سخت ہوتی ہے تمہیں اندازہ نہیں ہے۔ کسی پر بلا ثبوت بہتان لگانا' آسمان بھی لرز اٹھتا ہے۔" وہ شاید اسے ڈرا رہی تھیں یا خود کو۔

"میری بچی! تم مجھے بہت عزیز ہو میں نہیں چاہتی کہ خدانخواستہ تم اللہ کی ایسی کسی پکڑ میں آؤ' تم کسی دشمن کی خوشیاں برباد کرنے والی ہو۔ اس زندگی کی ابتدا اچھی اور نیک سوچوں کے ساتھ کرو ورنہ مکافات عمل ہے۔ خدا تمہیں ہر بلا سے محفوظ رکھے میری بچی۔" وہ فرط جذبات سے اسے پیار کرتے ہوئے رو ہی پڑیں۔

کبھی ثانیہ کی ماں نے بھی تو اسے ایسے ہی دعا دی ہو گی پھر۔

اور اب تو ان کا دل عجیب وہمی سا ہو چلا تھا اب اپنی بیٹی کی رخصتی جو سر پر آ کھڑی ہوئی تھی۔

"وعدہ کرو زونی! تم آئندہ کوئی لفظ ثانیہ کے متعلق اپنی زبان پر نہیں لاؤ گی۔ نہ کسی کے سامنے نہ تنہائی میں اور اپنی سسرال میں تو خاص طور پر۔"

وہ جانتی تھیں وہ ایسا کوئی وعدہ نہیں کرے گی مگر پھر بھی وہ اپنی ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر بولیں۔

"مام! آپ کو ہو کیا گیا ہے۔ میرے خیال میں آپ نے ثانیہ کے معاملے کو کچھ زیادہ ہی دل پہ لے لیا ہے

اس کے ساتھ وہی ہوا جو اس نے کیا تھا اور اگر آپ ثبوت کی بات کرتی ہیں تو پوچھیں بلال بھائی سے کیا دیکھا تھا خود انہوں نے اور اس سے بڑھ کر کسی کی بدکرداری کا اور ثبوت کیا ہوتا ہے؟ وہ اپنے شوہر کے ہوتے ہوئے غیر مرد سے تنہائی میں چھپ چھپ کر ملے اور عہد و پیماں باندھے 'تحفے تحائف دے۔" وہ نفرت بھرے لہجے میں کہتی چلی گئی۔ اور میڈم فضیلہ اسے صرف ترحم بھری نظروں سے دیکھ کر رہ گئیں۔

(یہ اب ناقابل اصلاح ہو چکی ہے۔ میری کوئی بھی نصیحت کوئی بھی بات اس کی سمجھ میں نہیں آسکتی ایک بیکار کی لفاظی ہو گی اور بس۔ خدانخواستہ اب اسے صرف وقت سمجھائے گا اور جو وقت کی زبان سمجھ جاتا ہے پھر اس کے لیے مہلت۔)

"اللہ نہ کرے میں اپنی ہی بچی کے لیے یہ کیسی فضول باتیں سوچے جا رہی ہوں۔ مجھے ایسا برا نہیں کیا اس نے ثانیہ کے ساتھ اور اگر کیا بھی تھا تو اسے میرے پاس تو ایک بار آنا چاہیے تھا مجھ سے تو بات کرنا چاہیے کہ میں جو اس کا آئیڈیل تھی۔"

اور یہ جملہ سوچتے ہی انہیں لگا وہ پورے قد سے نیچے آگری ہوں۔ وہ ان کا آئیڈیل تو خود اپنے ہاتھوں سے پاش پاش کر چکی تھیں۔

ایک دن بھی تو وہ اس آئیڈیل پر پوری نہ اتر سکیں جو ثانیہ کے معصوم ذہن نے ان کے لیے تراشا تھا۔

وہ تو ایک دن بھی ایک لمحے کے لیے بھی۔۔۔ ایک مغرور' امیر و کبیر' اپنی دولت' خوب صورت بچے' عالیشان گھر اور شاندار عہدے کے غرور سے باہر نہیں نکل سکیں وہ آئیڈیل کے سانچے میں کیسے فٹ رہ سکتی تھیں؟

"یہ میں نے کیا کیا۔" ایک ان دیکھے ملال نے انہیں چاروں اور گھیر لیا۔

"مام! چلیں بھی نا! شاپنگ کے لیے ہم لیٹ ہو رہے ہیں پہلے ہی کافی ٹائم ہو گیا۔" زونیرا تیار ہو کر بولتی ہوئی آئی تھی۔

"ایک تو آپ لوگوں نے ڈیٹ اتنی شارٹ رکھی ہے بھلا کیسے سب کچھ ہو گا اتنی جلدی۔"

"بلال تیار ہے؟" وہ فکرمند ہو گئیں۔ اور ملال تو اب عمر بھر کے لیے تھے۔ گوشوارے تو اب بار بار کھلنا ہی تھے اور آگے جو تنہائی کا دشت انہیں نظر آ رہا تھا اس میں صرف یہی کچھ تو ہوتا تھا۔

"انہوں نے جانے سے انکار کر دیا ہے۔ ان کا تو سوگ ہی ختم نہیں ہو رہا۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"میں دیکھتی ہوں تم گاڑی میں چل کر بیٹھو۔" وہ کہہ کر باہر نکل گئیں۔

✿ ✿ ✿

"بلال اس بار آپ مجھے ساتھ لے کر جائیں گے بس میں نے کہہ دیا۔ میں اب آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔" اس کے کانوں میں ثانیہ کی اٹھلاتی استحقاق بھری آواز گونجی۔

"تو کیا میں رہ سکتا ہوں تمہارے بغیر مائی ڈیئر وائف۔" وہ اس پر جھکتے ہوئے بولا۔

"رہ سکتے ہیں تو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں نا۔" وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

"اب نہیں چھوڑ کر جاؤں گا پرامس۔"

"آپ پرامس نہ بھی کریں تو بھی میں آپ کو اس بار اکیلے نہیں جانے دوں گی۔" وہ اس کا بازو کھینچ کر بولی۔

"اچھا نہ لے کر جاؤں تو کیا زبردستی چل پڑو گی۔" وہ شرارت سے بولا۔

"آپ کے سوٹ کیس میں چھپ جاؤں گی کپڑوں کی تہوں میں گھس جاؤں گی آپ کے بیگ میں' آپ کی خوشبو میں' آپ کے دماغ میں' آپ کے دل میں' آپ کی آنکھوں میں ۔۔۔ پھر کیسے مجھ سے پیچھا چھڑائیں گے پھر تو آپ کو مجھے ساتھ لے کر جانا ہی پڑے گا جناب۔"

وہ پہلے کبھی اتنی شوخ نہیں ہوئی تھی مگر اس بار کچھ خاص تھا بات خاص وہ ایسے انوکھے لاڈ کر رہی تھی بلال سے۔

"کیا اسے پتا چل گیا تھا ہم دونوں ہمیشہ کے لیے جدا ہونے والے ہیں۔" بلال کے منہ سے سسکی سی نکلی۔

"اچھا اگر میں گم ہو جاؤں گی تو آپ مجھے ڈھونڈیں گے۔ آپ کہتے ہیں نا کہ لندن کتنا بڑا شہر ہے اس قدر بھرے شہر میں کہیں کھو جاؤں آپ کو نظر ہی نہ آؤں تو مجھے ڈھونڈ لیں گے؟" وہ عجیب عجیب سے سوال کیے جا رہی تھی۔

"میں تمہیں کبھی خود سے جدا کروں گا تو تم گم ہو گی نا۔ میری جان میں تمہیں خود سے ایک پل کے لیے بھی دور نہیں کروں گا تو پھر کھونے کا کیا سوال؟"

اور میں نے جو وعدہ کیا جھوٹا' جو پیمان باندھا وہ کچا ۔۔۔ کیوں کیا میں نے خود اپنے ساتھ ایسا ۔۔۔ جبکہ میں جانتا تھا میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔" اس کی آنکھیں یادوں سے جلنے لگی تھیں۔

"میں نے نہیں اس نے۔ اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ اس نے خود کو ہی نہیں مجھے بھی مار ڈالا اور میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا' وہ معافی کے قابل ہے بھی نہیں۔ اس نے میری آنکھوں کے سامنے اس وحشی کے ساتھ مراسم قائم کیے اور اس بھرے گھر میں آخری پل سب بے تکلف ہوتے تھے جب روحیل والا حصہ اس میں شامل ہو جاتا تھا۔

بلال نے زور سے آنکھیں رگڑ کر سامنے شاپنگ مال کو دیکھا۔ زونیرا اور بیگم فضیلہ شاپنگ کے لیے گئی تھیں اور گھنٹوں بیت چکے تھے وہ گاڑی میں بیٹھا صرف ثانیہ کو سوچ رہا تھا اور وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چل سکا جیسے وقت کا بھی احساس کھو گیا تھا۔

"یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے ایسا بے خود' بے خبر میں کبھی بھی نہیں تھا۔" اس کا جی چاہ رہا تھا وہ دھاڑیں مار مار کر رو دے۔

اور دوسرے لمحے اس کی نظریں ایک منظر پر جیسے جم کر رہ گئیں۔

وہ روحیل ہی تھا کسی چادر میں لپٹے نازک وجود کو سہارا دیتے ہوئے گاڑی میں بٹھا رہا تھا۔ دوسرے لمحے گاڑی آگے کی طرف جا چکی تھی۔

اور بلال جیسے پتھر کا بت بن کر رہ گیا تھا۔

✿ ✿ ✿

"آپ سارا دن گھر میں ہوتی ہیں اور آپ سے بچی کو نہیں سنبھالا جاتا جانتی ہیں یہ بدمعاشی کے بہانے کدھر کدھر جاتی ہے۔" روحیل ایک بگولا سا ثانیہ کو بازو سے گھسیٹتا ہوا باہر سے لایا تھا۔ نصرت کے ہاتھ سے ان چنتے ہوئے چاولوں کی پرات گرتے گرتے بچی۔

"کیا۔ کیا کر دیا اس نے؟"

"میری زبان نہیں دہرا سکتی اسے جہاں سے اور جس حال میں لایا ہوں میں۔ اگر آپ کی نظر میں اس کے لیے رشتہ ہے تو ٹھیک ورنہ میں خود اس کا کچھ کر لوں گا مگر اسے باپ کی عزت کو یوں گلی گلی رولنے نہیں دوں گا۔" وہ پہلے کی طرح غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔

"اور تم خود کیا ہو جیسے خود رات کے اندھیرے میں جانے کہاں سے اسے خرید کر لے آئے ہو اسی طرح [illegible] تمہاری [illegible]" لب بھینچے باہر نکل گئی۔

اور کچن میں برتن دھوتی [illegible] جیسے سن ہو کر رہ گئی۔

"تڑاخ۔" ایک زوردار تھپڑ پر ثانیہ کسی گیند کی طرح گھومتی برآمدے کے ستون سے ٹکرا کر گر گئی تھی۔ دوسرے لمحے اس کے ماتھے سے خون پھوٹ پڑا۔

"اگر مجھے تیرا اصول بھی بھگتنا پڑا تو وہ بھی کر ڈالوں گا مگر تجھے یہ کھیل نہیں کھیلنے دوں گا۔ تیرا باپ مر گیا مگر میں ابھی زندہ ہوں تو شاید بھول گئی تھی میری نرمی اور مروت کا تم لوگوں نے غلط مطلب لیا ہے تو اب اپنی درستی کر لو ورنہ یہاں رہنا مشکل ہو جائے گا تمہارا۔"

وہ جنگلی پن کی انتہا پر تھا اسے تو ثانیہ کے ماتھے سے بہتا لہو بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

جو اب گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہی تھی۔

روحیل دروازے کو ٹھوکر مار کر باہر نکل گیا نصرت

تمہی سے بچی کو سنبھالے پہنچی۔

☼ ☼ ☼

اس پر دلہن بن کر فرشتوں کا روپ آیا تھا۔

میڈم فضیلہ کو تو ایسا ہی لگا۔ وہ لگ ہی اتنی پیاری رہی تھی شاید ان کی بچی تھی اس لیے انہیں ایسا پیار آ رہا تھا اس پر۔

اور مبشر صاحب کی اچانک آمد نے بارات سے ذرا پہلے جہاں انہیں بوکھلا دیا وہیں نوذیرا کا مان بھی بڑھا دیا۔ بلال نے چند دن پہلے مبشر صاحب سے فون پہ بات کرتے ہوئے نوذیرا کی شادی کا ذکر کیا تھا اور انہوں نے جانے کیسے یہ سب سوچ لیا اور رخصتی سے چند منٹ پہلے ان کی آمد نے سب کو ہی حیران کر دیا۔

وہ بہت دیر تک نوذیرا کو گلے سے لگا کر تھپتھپاتے رہے اور نوذیرا جس نے نہ رونے کی قسم کھائی تھی کہ سارا میک اپ خراب ہو جائے گا' باپ کے گلے لگ کر دھواں دھار رونے لگی تھی۔ بڑی مشکل سے بلال نے اسے باپ سے الگ کیا۔

انہوں نے تین لاکھ کا چیک اپنی بیٹی سے خود ہی زبردستی پرس میں ڈال دیا۔ چند لمحوں بعد رخصتی تھی۔ گاڑی کے روانہ ہوتے ہی وہ بھی خاموشی سے چلے گئے جس خاموشی سے آئے تھے۔

"کل اپنی مسز کو لے کر ہوٹل آ جانا۔ تمہاری ممی بھی اس سے ملنا چاہتی ہیں اس کے لیے سلامی اور تحائف لائی ہیں۔ نوذیرا سے ملنے اس لیے نہیں آ ئیں کہ شاید تمہاری ماں کو یہ اچھا نہیں لگتا۔ ہم کل تمہارا انتظار کریں گے۔" وہ جاتے ہوئے بلال سے کہہ گئے اور وہ جواب میں کچھ بھی نہیں بول سکا۔ میڈم فضیلہ ساکت سی کھڑی ان کی گاڑی کو دور جاتا دیکھتی رہ گئیں انہیں روکنے یا ٹھہرانے کے سب حقوق تو گنوا چکی تھیں۔

ایک حکمن سی تھی جس نے چاروں طرف سے انہیں گھیر لیا۔

نوذیرا چلی گئی تھی اور ثانیہ اس سے پہلے جا چکی تھی

بلال چند دنوں میں چلا جائے گا تو پھر وہ اکیلی۔ بالکل تنہا یہاں اس بڑے سے عالیشان گھر میں۔ حسن کے غرور نے انہیں ثانیہ سے حقارت برتنے پر مجبور کیا اب یہ ہی گھر انہیں کاٹ کھانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

"چلیں نا مام' یہاں کیوں آ بیٹھی ہیں۔" وہ آمدے کی سیڑھیوں میں کیسے خالی خالی سی دامن سی بیٹھی تھیں۔

"ہوں۔ ہاں۔" وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

"میں نے ڈیڈی سے ذکر کیا تھا نوذی کی شادی کا۔" وہ ان کی کیفیت سے یہی نتیجہ اخذ کر سکا کہ انہیں مبشر صاحب کا آنا اچھا نہیں لگا۔

"تم ان سے ملتے رہے تھے؟" وہ بہت دیر بعد دل گرفتی سے بولیں تو بلال کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

"اور تم نے مجھ سے ذکر بھی کرنا مناسب نہیں سمجھا۔" دوسرے لمحے وہ اسے اس کی فاش غلطی کا احساس دلا چکی تھیں۔

"تھوڑی کہیں بھی نہیں تو ولیمہ بھی سب کر لیے تم لوگوں کی زندگیوں میں بہت سے ہی کوئی اہم اور معمولی ہو گئی کہ بہت سی باتوں پر تم نے مجھ سے پوچھنا مشورہ لینا تو دور کی بات ذکر کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا اور شاید میں اسی قابل تھی۔"

وہ اپنی آنکھوں سے امنڈ پڑنے والے دریا پر بمشکل بند باندھے اٹھ کر جانے لگیں۔

"پلیز مام۔" بلال شرمندہ تھا' ان کا ہاتھ تھام کر بولا۔ وہ یونہی گم سی میں سر ہلانے لگیں۔

"میں ناراض نہیں ہوں تم سے۔" وہ بھاری آواز میں بولیں۔

"ہاں مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے کہ میں نے تم دونوں کو باپ سے دور کر کے کتنی بڑی غلطی کی اور تم لوگوں نے مجھے اس کا احساس دلایا بھی تو کس طرح کہ میں خود سے نظریں ملانے کے قابل بھی نہیں رہی۔"

وہ بولتے ہوئے خود کو سنبھالنے کی کوششیں کر رہی تھیں۔ ایک بار یہ بند ٹوٹ جاتا تو پھر کچھ بھی ان کے

ضبط میں نہیں رہتا۔

"مام! میں آپ کو بتانا چاہتا تھا۔ ذکر کرنا چاہتا تھا کئی بار زبان تک لفظ آئے مگر پھر آپ کی دل آزاری کے خیال سے۔"

"اور اب جو ہوا؟" وہ پھٹ پڑنے والے لہجے میں بولیں۔

"اس شخص کی آنکھوں میں جو فاتحانہ چمک تھی کہ دیکھو تم لاکھ حق جتاؤ فضیلہ تم نے اپنی عمر برباد کر لی اور ایک بیوہ کی سی زندگی گزاری' جن کی خاطر وہ بھی تمہارے نہیں ہیں' میں ایک اشارہ کروں تو یہ دونوں میرے ساتھ چل پڑیں' یہ میری اعلا ظرفی تھی کہ میں نے جب تک چاہا' انہیں تمہیں بخشے رکھا اور اب اگر چاہوں تو۔ تم نے مجھے وہ کوڑی کا کر دیا' خود میری نظروں میں۔" وہ ایک دم سے روتی ہوئی اندر بھاگ گئیں اور بلال متاسف کھڑا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"ایک بہت اہم بات۔" شہوار اس کے پاس بیٹھا تھا اور نوذیرا کے کم عروسی میں جب زیبا تھا شہوار کے لباس اور جسم سے اٹھتی تیز خوشبو نے اس کے اعصاب کو جیسے مخمور سا کر دیا تھا۔

"تم پھپھو کی پسند تو ہو ہی' مگر میرے فادر کی پسند زیادہ ہو۔" وہ جانے کیا بتانا چاہ رہا تھا اس نے ابھی تک اس کا گھونگھٹ بھی نہیں الٹا تھا۔

"ان کی خواہش تھی کہ اس گھر میں ایک پڑھی لکھی خاندانی شریف' اب شرافت کیا ہوتی ہے یہ بحث کیا ہے۔" وہ ہنسا۔

"ہو سکتا ہے تم پہلے سے ہی اس خاندانی شرافت کو بڑے مزے سے کسی بھی ٹائٹ پیکیج کے طفیل کسی اور کے قدموں میں نچھاور کر آئی ہو۔"

اور وہ دھک سے رہ گئی۔

وہ نفی کرنا چاہتی تھی مگر اس کی زبان جیسے گنگ سی ہو کر رہ گئی۔

"لیکن یہ ضروری بات بھی نہیں' ہو سکتا ہے تم واقعی میں شریف ہو' میرا مطلب ہے خاندانی شریف۔" وہ بڑی آرام دہ پوزیشن میں تھی تکیہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"مجھے تو یونہی ایک خیال گزرا تو میں نے تم سے ذکر کر ڈالا' تم پلیز دل پر نہیں لینا۔ آخر کو تمہاری ماں شہر کے اتنے بڑے کالج کی پرنسپل ہے' ہزاروں لڑکیوں پر نظر رکھنے والی تو گھر میں کیا ایک تم پر نظر نہیں رکھ سکی ہو گی' میرا مطلب ہے کڑی نظر۔" وہ جانے کیسی کس کی باتیں کر رہا تھا' نوذیرا کو الجھن ہونے لگی۔

"تمہارے بھائی نے تو اپنی پسند سے شادی کی تھی نا۔" وہ گویا یاد دہانی کرواتے ہوئے بولا۔ "وہ بھی شاید کسی نوکرانی کی بچی سے' کیا لو اسٹینڈرڈ تھا تمہارے بھائی کا بھی' بھئی ایسوں سے شادی تھوڑی کرتے ہیں' بس دام چکاتے ہیں اور لطف اٹھاتے ہیں۔"

اور نوذیرا نے ساری شرم بالائے طاق رکھ کر خود ہی اپنا گھونگھٹ پلٹ دیا' کیسی گھٹی باتیں۔

اور وہ بھول گئی ایسی گھٹی باتیں وہ بھی تو برداشت کرتی رہی تھی۔

"لیکن خیر وہ کہتے ہیں دل آ گیا' شاید تو پری کیا چیز ہے' خیر تمہاری بھابھی بھی کہ وہ تھوڑی تھی اچھی خوب صورت تھی پھر تو دام چکانے کے بجائے مستقل گھر لا کر رکھنے کو جی چاہا ہو گا تمہارے بھائی کا۔"

"پلیز!" اس کی آنکھوں میں مرچیں سی بھرنے لگیں۔

"اور شاید۔" وہ اس کی چوڑیوں سے کھیلنے لگا۔ "بارات میں یہ ہی چہ میگوئیاں سی ہو رہی تھیں۔" وہ مزہ لینے کو رکا۔

"اور وہ تمہاری با کمال بھابھی صاحبہ پوری شادی میں کہیں نظر بھی تو نہیں آئیں' تو چہ میگوئیاں تو ہونی تھیں' ناکہ وہ پھر سے کہیں اور بھاگ واگ گئی یا کسی اور نے اچھے دام لگا دیے ہوں گے' ان کمبخت نوکرانیوں میں یہ ہی تو خرابی ہوتی ہے' جہاں زیادہ پیسے دیکھے پچھلی نوکری کو لات مار کر آگے چل پڑیں' ذرا جو مروت کا لحاظ رکھا ہو پچھلی نوکری کا۔"

ایک اتنے بڑے لگتے شخص کی ایسی گھٹیا بازاری زبان اور سوچ۔ زونیرا تو اپنے خیالات دنگ رہ گئی تھی۔ ان گھڑیوں سے پہلے تک۔ مگر اب جیسے اسے گھن سی آنے لگی یہ سب سن کر۔

"تم نہیں کیا؟ وہ ایک نوکری چھوڑ کر وہ دوسری کے پیچھے بھاگے ہمیں تو اپنے گھر کی خبر رکھنا ہوگی۔" زونیرا کا دل اس کی نظروں سے سہما جا رہا تھا۔

"تو یہ تھیں وہ گھڑیاں جن کے بخت آور ہونے کے لیے صبح بھی اس کی ماں نے چار کالے بکرے صدقے کے اس کے ہاتھ لگوا کر چھری پھروائی تھی اور وہ چار بکرے بھی ان بلا خیز گھڑیوں کو نہ ٹال سکے۔"

وہ سہم سی گئی تھی اس کی لمحہ بھری خاموشی سے بھی۔

"میں بدکردار نہیں ہوں، نہ ایسی بیوی پسند کروں گا لیکن ایک بات جو تمہیں اپنے پلو سے گرہ لگا اور ابھی باندھ لینی ہوگی کہ اگر میرے علم میں یہ بات ذرا سی بھی آئی کہ کسی بات کچ کے طفیل یا کسی دل پشوری کرنے کو تم اڑنے کی عادت ہو اسے ساتھ اکڑوا کھڑا دو لفظ کے الف بے کر جانے ان کی سانس سے اتنی سی چونی سی اڑنے پر نظریں جمائیں، تمہاری محبت کی نہ کہنے والی باتیں بھی آنکھوں کے ذریعے کہہ دیں تو زونیرا بیگم! ایسی ایک ذرا سی بھی چوک تم سے کبھی سرزد ہوئی ہو تو مجھے ابھی بتا دو، ورنہ بعد میں مجھے خود سے پتا چل گیا تو۔" اس کی نظروں میں کیا نہیں تھا اور جس قہر بھرے انداز میں اس نے زونیرا کی کلائی اپنی گرفت میں لے رکھی تھی اسے لگا کہ ابھی کچھ دیر ایسے ہی وہ اس کی کلائی پکڑے رہا تو اس کی ہڈی کرچی کرچی ہو جائے گی۔

"وہ تمہاری زندگی کا سیاہ ترین دن ہوگا اور پھر اس کے بعد جو تمہارے ساتھ ہوگا وہ کاش امیجن آئی ڈیئر وائف۔" اس نے ایک جھٹکے سے اس کی کلائی چھوڑی تھی اور اس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا تھا۔

"اور یہ مت سمجھنا کہ اس کے بعد میں تمہیں چھوڑ دوں گا جیسے تمہارے بھائی کی بیوی اسے لات مار کر چلی گئی تم بھی اپنی ماں کے بل بوتے پر مزے سے خلع لے کر چلی جاؤ گی؟ ناممکن۔" "نہیں تم اب مر کر ہی میرے گھر سے نکل سکتی ہو، اس کے علاوہ نہیں۔" اور زونیرا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

"اگر مجھ سے چھٹکارے کی سوچو گی بھی تو تم سے منسوب ایسی ایسی کہانیاں اس پورے شہر میں گردش کریں گی بمعہ تصویری نظارے کے کہ تمہاری ماں کالج میں بچیوں کو نیکی کا سبق پڑھانا بھول جائے گی۔"

"آپ... آپ مجھ سے ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں۔" بہت مشکل سے وہ بول پائی تھی۔

"صرف اس لیے کہ تم محتاط رہو ورنہ ڈارلنگ تم تو میری جان ہو، بس کسی اور کی گندی نظر تم پر نہ پڑی ہو میری صرف یہ ایما ہے ہمیا نہیں ہے نا؟؟"

وہ اسے کوئی نفسیاتی مریض لگا اور وہ اقرار میں سر بھی نہ ہلا سکی بس دیکھتی رہ گئی اور پھر زوردار قہقہے نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے۔

"تمہارا کوئی اثر رہ چکا ہے، جو زبان نہیں ہلاتی تو گونگی بن گئی ہے... کون سا چور ہے جو تیرے دل میں چھپا بیٹھا ہے جو بولتی نہیں ہے۔" وہ ایک دم سے غصے میں پاگل ہو گیا۔

اور زونیرا کی چل گیا اس کی ماں جس مکافات عمل کا ذکر کر رہی تھی وہ سطر سطر اس کے سامنے مجسم ہو چکا تھا۔

"میرے دکھے دل سے کوئی بددعا نہ بھی نکلی ہو تو بھی تم کبھی خوش نہیں رہ سکو گی۔" اسے لگا ثانیہ کمرے کے کونے میں کھڑی مطمئن چہرہ لیے اسے دیکھ رہی تھی۔

شہریار کی زبان اب کون سا کند اگل رہی تھی اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

مولوی نے نکاح ختم کیا اور سب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔

اور نصرت کو لگا آج اس پہ کم از کم بھڑکتے دوزخ کا ایک دروازہ تو بند ہو گیا ہے، جس نے اس کی راتوں کی

نیند اڑا رکھی تھی۔

ثنا کا نکاح روحیل نے اپنے کسی جاننے والے کے توسط سے کیا تھا اور ثنا کو اس نے کس طرح راضی کیا تھا اس کا علم نصرت کو بھی نہیں تھا مگر ثنا خاموش سی ہو گئی تھی اور نصرت کے لیے یہی کافی تھا۔

عزت خیر و عافیت سے گھر سے رخصت ہونے کے لیے دلہن بنی ثنا کی شکل میں بیٹھی تھی اور اس کے نصرت کے دل سے اس کے لیے صرف دعائیں ہی نکل رہی تھیں۔

"اگر روحیل واپس نہ آتا تو جانے کیا کچھ ہو جاتا۔" وہ کیسے بہن کو رخصت کر رہا تھا اپنے بازوؤں کے حصار میں گاڑی تک لے کر گیا۔" اور نصرت کے دل سے پہلی بار روحیل کے لیے بھی اور خاص دعائیں نکلیں۔

☼ ☼ ☼

بلال اپنا سامان پیک کر چکا تھا۔

بہت سی ثانیہ کی چیزیں وہ ہاتھ لگاتا اور چھوڑ دیتا۔

صرف اس کی اور اپنی شادی کی ایک تصویر اس نے بریف کیس کی ایک جیب میں رکھ لی۔

اور آخری نمبر بند کرنے سے پہلے اس نے وہ تصویر بھی نکال کر پھاڑ ڈالی اور بیگ بند کر دیا۔

اس کی آنکھوں میں جیسے کئی برسوں کا رت جگا تھا اور اب بہت گہری میٹھی نیند کسی اور دیس میں جا کر سونا چاہتا تھا۔ بس جہاں کم از کم ثانیہ کی یادیں نہ ہوں اور لگتا تھا اس پوری دنیا میں ایسی کوئی جگہ نہیں ہے۔

میڈم فضیلہ نے ایک بار بھی اسے رکنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ وہ خود ہی کئی بار کہہ چکا تھا کہ وہ جلد واپس آ جائے گا۔

جس دن سے ان کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ بلال وہاں مبشر صاحب سے ملتا رہا ہے، وہ ہر چیز سے جیسے لاتعلق سی ہو گئی تھیں۔

یکدم دروازے پر دستک ہوئی۔

اس نے زور سے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

اندر آنے والی زونیرا تھی۔

ایک بڑی بڑی سی خوفزدہ سہمی ہوئی بالکل خاموش سی زونیرا جو دنوں میں ہی وہ بہت عجیب سی ہو گئی تھی۔

"آ جاؤ زونی! کیسی ہو؟" وہ جبراً مسکرایا۔

"بھائی! آپ سے بہت معافی مانگنی تھی۔" وہ وہیں دو زانو اس کے پیروں کے پاس بیٹھ گئی۔

"زونی! ادھر بیٹھو نا یہ کیا کر رہی ہو؟"

اور وہ زور زور سے رونے لگی۔

"زونی بیٹا! کیا ہو گیا میری جان ایسے کیوں کر رہی ہو؟" وہ حقیقتاً پریشان ہو گیا۔

"بھائی! میں آپ کی زندگی برباد کرنے کی ذمہ دار ہوں۔ میں نے آپ کو ثانیہ کو برباد کیا۔ اپنے حسد جلن اور تکبر کی وجہ سے اور مجھے پتا ہے گناہ تو خدا بھی معاف نہیں کرتا۔ مگر بھائی مجھے معاف کر دیں۔" وہ روئے جا رہی تھی اور بلال جیسے کچھ بولنا بھول گیا۔

"بھائی! ثانیہ، ثانیہ۔" اس کا گلا جیسے درد سے پھٹ رہا تھا۔

"اس کا روحیل کے ساتھ کچھ بھی نہیں تھا۔ میں جھوٹ بول کر روحیل سے محبت کا ڈھونگ رچا کر اسے زبردستی ہوٹل لے کر گئی اور وہ حقیقت بھی میں نے ہی ... میں نے بریسلیٹ میں دیا تھا روحیل کو... ثانیہ نے نہیں۔"

اور بلال کو جیسے ہزار واٹ کا کرنٹ لگا۔ وہ ایکدم سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور متوحش نظروں سے اسے دیکھتا چلا گیا۔

اور دروازے کے باہر کھڑی میڈم فضیلہ پر جیسے کوئی پہاڑ سا آ گرا ہو۔

زونیرا اس حد تک گر جائے گی انہوں نے بہت بار یہ بات سوچی تھی مگر پھر ان کے دل نے بیٹی کی حمایت میں خود ہی سے جھٹلا دیا تھا اور وہی بات سچ نکلی۔

"ثانیہ بے قصور تھی میں نے۔" اور بلال اس کی کوئی بھی بات سنے بغیر اپنے دونوں سوٹ کیس گھسیٹتا باہر نکل گیا۔

(آخری قسط ان شاءاللہ آئندہ ماہ)

کوئی تصویر مکمل نہیں ہونے پائی

اب جو دیکھیں تو کوئی ایسی بڑی بات نہ تھی
یہ شب و روز مہ و سال کا پُرپیچ سفر
قدرے آسان بھی ہو سکتا تھا!

یہ جو ہر موڑ پہ کچھ اُلجھے ہوئے رستے ہیں
ان میں ترتیب کا امکان بھی ہو سکتا تھا
ہم ذرا درمیان سے چلتے تو وہ گھر
جس کے بام و در و دیوار پہ ویرانی ہے
جس کے ہر طاق پہ رکھی ہوئی حیرانی ہے
جس کی ہر صبح میں شاموں کی پریشانی ہے
اس میں ہم چین سے آباد بھی ہو سکتے تھے
بخت سے صلح کی راہیں بھی نکل سکتی تھیں
وقت سے امن کا پیمان بھی ہو سکتا تھا

کیا ہوا! کیسے ہوا! کس نے کیا! کیسے کیا!
وہ جو سیلاب بلاخیز تھا کیسے گزرا
وہ جو اک خوابِ دل آویز تھا کیسے گزرا
اب جو دیکھیں تو بہت صاف نظر آتے ہیں
سارے منظر بھی، پس منظر بھی
لیکن اس دیر خیالی کا صلہ کیا ہو گا
یہ تو سب بعد کی باتیں ہیں، مری جان! انہیں
دیکھتے، سوچتے رہنے سے بھلا کیا ہو گا

وہ جو ہونا تھا ہوا۔ ہو بھی چکا
وقت کی لوح پہ لکھی ہوئی تحریر کے حرف
خطِ تنسیخ سے واقف ہی نہیں
بختِ مکتب کے رجسٹر کی طرح ہوتا ہے
اپنے نمبر پہ جو لیکن نہیں کہلاتے
ان کا کچھ عذر نہیں، کوئی بھی فریاد نہیں
یہ وہ سائل ہیں جنہیں کوئی صدا یاد نہیں
لائنیں اُلجھی رہیں لفظ بدلنے کے سبب
کوئی تحریر مسلسل نہیں ہونے پائی
حاصلِ عمر یہی چند ادھورے خاکے
کوئی تصویر مکمل نہیں ہونے پائی

امجد اسلام امجد

میرے اشکوں میں جو روانی ہے
یہ کسی ہجر کی نشانی ہے

آنکھ تحفہ ہے ایک منظر کا
دل کسی خواب کی نشانی ہے

کچھ بھی باقی نہیں ہے دامن میں
رائیگانی سی رائیگانی ہے

کاغذی ناؤ کے مسافر ہیں
اور سمندر کی بے کرانی ہے

رائیگاں صبح کا ہے افسانہ
رائیگاں شام کی کہانی ہے

پھر وہی بے اماں مسافت ہے
پھر وہی جستجو پُرانی ہے

جب بھی فرصت ملے چلے آنا
ہم نے اک داستاں سُنانی ہے

ارشد نعیم

دیکھ لیتے ہیں اب اس بام کو آتے جاتے
یہ بھی آزار چلا جائے گا جاتے جاتے

دل کے سب نقش تھے ہاتھوں کی لکیروں جیسے
نقشِ پا ہوتے تو ممکن تھا مٹاتے جاتے

تھی کبھی راہ جو ہم راہ گزرنے والی
اب حذر ہوتا ہے اس راہ سے آتے جاتے

شہر بے مہر کبھی ہم کو بھی مہلت دیتا
اک دیا ہم بھی کسی رخ سے جلاتے جاتے

ہر گھڑی ایک جدا غم ہے جدائی اس کی
غم کی میعاد بھی وہ لے گیا جاتے جاتے

اس کے کوچے میں بھی ہو، راہ سے بے راہ نصیر
اتنے آئے تھے تو آواز لگاتے جاتے

نصیر ترابی

پڑھاکو،

باپ: "بیٹے! تم رات کو کتنے بجے تک پڑھتے رہتے ہو؟"

بیٹا: "ابو گیارہ بجے تک۔"

باپ: (حیرانی سے) "لیکن آج کل تو لوڈ شیڈنگ ہے اور بجلی روز نو بجے چلی جاتی ہے۔"

بیٹا: (گھبراتے ہوئے) "ابو جان! دراصل میں پڑھنے میں اتنا مگن رہتا ہوں کہ بجلی کے جانے کا پتا ہی نہیں چلتا۔"

کرن رحمن۔ بنوں

شرف تولیت،

ایک خاتون نے ایک فقیر کو بہت سے پرانے کپڑے دیتے ہوئے کہا۔

"یہ سب کے سب تمہارے کام آ جائیں گے بس انہیں معمولی سی مرمت کی ضرورت ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک دن کا کام ہے۔"

"ٹھیک ہے بیگم صاحبہ! تو پھر میں کل آ جاؤں گا۔" فقیر نے کپڑے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

نمرہ اقرا۔ کراچی

مشورہ،

ٹرین کے ڈبے میں ایک صاحب کو سگار سلگاتے دیکھ کر سامنے بیٹھی ہوئی عورت نے نرمی سے ان سے کہا۔

"تمباکو کے دھوئیں سے میری طبیعت خراب ہونے لگتی ہے۔"

وہ صاحب ایک گہرا کش لگاتے ہوئے بولے۔

"محترمہ! ایسی صورت میں تو میں آپ کو بھی مشورہ دے سکتا ہوں کہ آپ تمباکو نوشی نہ کیا کریں۔"

نویدہ احسان

ٹیلی فون،

ایک صاحب گہری نیند سو رہے تھے کہ آدھی رات کو اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ جب انہوں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے آواز آئی۔

"آپ کو جو تکلیف ہوئی، اس کی معافی چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں آپ کے پڑوس میں رہتا ہوں اور آپ کا کتا ساری رات بھونکتا رہتا ہے جس سے مجھے نیند نہیں آتی۔ براہ مہربانی اس کا کچھ علاج کیجیے۔"

وہ صاحب اس وقت تو شکریہ کہہ کر خاموش ہو گئے مگر دوسری رات ٹھیک اسی وقت انہوں نے اپنے پڑوسی کو ٹیلی فون کیا اور کہا۔

"آپ کو جو تکلیف ہوئی، اس کی معافی چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ وہ کتا میرا نہیں۔"

صائمہ نجمی۔ کراچی

سزا،

بیوی نے عدالت کو بتایا۔

"میری شادی کو ایک ہی ہفتہ ہوا ہے کہ میرے شوہر نے میرے سر پر کیک دے مارا۔"

عدالت نے شوہر کو بدسلوکی پر پچاس روپے جرمانہ اور مقدمے کے اخراجات کی ادائیگی کی سزا سنائی۔

بیوی نے کہا۔ "جناب والا! وہ کیک میں نے خود ان کے لیے بڑی محبت سے تیار کیا تھا۔"

عدالت نے فوراً ہی سزا میں ترمیم کرتے ہوئے حکم نامہ جاری کیا کہ "مہک بجھانے" حملہ کرنے کے جرم میں ایک سال قید بامشقت۔"

ندا، فضہ۔ کراچی

اور جان عزیز،

ایک صاحب کی کار کے نیچے آ کر ایک کتا کچل گیا تو ان صاحب نے کار روک کر قریب کے بنگلے میں کھڑی ہوئی عورت سے پوچھا۔

"کس کا کتا تھا؟"

عورت نے جواب دیا۔ "میرے شوہر کا۔ اور وہ بچے تھے کہ وہ دنیا کا بہترین کتا ہے۔"

وہ صاحب بولے۔ "آپ کے شوہر کہاں ہیں؟ میرا خیال ہے انہیں اس حادثے کی خبر مجھ ہی کو سنانا چاہیے۔"

عورت نے کہا۔ "وہ بنگلے کے پیچھے باغیچے میں پودوں کو پانی دے رہے ہیں لیکن میں نہیں چاہتی کہ آپ انہیں یہ بری خبر اچانک سنائیں کیونکہ وہ دل کے مریض ہیں۔ بہتر ہوگا پہلے آپ ان کے سامنے کتے کے مرنے کی اطلاع دیں ... [illegible]"

[illegible]

فرق اصطلاح،

جج نے ملازم سے پوچھا۔ "تم اپنی بیوی کو چھوڑ کر کیوں بھاگ گئے تھے؟"

ملازم بولا۔ "جناب والا! اگر میری بیوی سے آپ اتنے ہی واقف ہوتے، جتنا میں ہوں تو آپ مجھے بھگوڑا نہ کہتے۔ اصل میں، میں بھگوڑا نہیں، پناہ گزین ہوں۔"

لائبہ، ایمن۔ آزاد کشمیر

فرق،

ایک گاہک نے ہوٹل کے بیرے سے پوچھا۔

"میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی۔ اس ہوٹل میں سفید پلیٹوں میں جو سالن پیش کیا جاتا ہے، اس کی قیمت پچیس روپے لی جاتی ہے اور جو سالن رنگین پلیٹوں میں دیا جاتا ہے اس کی قیمت بیس روپے ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا سفید پلیٹوں کا سالن زیادہ اچھا ہوتا ہے؟"

بیرے نے جواب دیا۔ "جناب دونوں پلیٹوں میں ایک ہی سالن پیش کیا جاتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ سفید پلیٹوں کو ہمیں دھونا پڑتا ہے اور ..."

عذرا ناصر۔ کراچی

کہنے کی بات اور...،

ایک مالک نے سوچا کہ اپنے ملازم کو ملازمت سے ہٹا دے مگر وہ چاہتا تھا کہ یہ بات ملازم سے اس انداز میں کہی جائے کہ اس کا دل نہ ٹوٹے لہٰذا اس نے اپنے ملازم کو بلایا اور اس سے بڑے شفیق انداز میں کہا۔

"بھئی تم نے ہمارے گھر میں رہ کر اس قدر محنت اور دلچسپی سے کام کیا ہے کہ تم ہمارے گھر کے ایک فرد بن گئے ہو۔ میں یہ ارادہ کر رہا ہوں کہ گھر کے ایک فرد کے لیے بھی رہ کر دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ... [illegible]"

حامدہ مریم فرید۔ کراچی

تین دوست،

تین دوست کسی صحرا میں راستہ بھٹک گئے۔ بدقسمتی سے ان کے پاس پانی کی ایک بوتل کے سوا کھانے پینے کی کوئی چیز باقی نہیں بچی تھی۔ لہٰذا انہوں نے طے کیا کہ بوتل تینوں میں برابر تقسیم ہوگی اور اسے اس وقت تک نہیں کھولا جائے گا، جب تک اس کی اشد ضرورت نہ ہو۔

رات انہوں نے ریگستان ہی میں گزاری۔ رات کے آخری پہر جاگنے کی ڈیوٹی علی کی تھی۔ راحیل اور اسامہ جب سو کر صبح اٹھے تو بوتل خالی تھی۔

"یہ بوتل کیسے خالی ہو گئی؟" راحیل نے علی سے پوچھا۔

"میں اپنے حصے کا پانی پینا چاہتا تھا۔" علی نے اطمینان سے جواب دیا۔ "میرا حصہ چونکہ بوتل میں سب سے نیچے

اللہ اس سے ناراض ہے"۔
ملکہ مہر ناز۔ سرگودھا

زیادہ ہنسنا

حضرت احنف بن قیس رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھ سے فرمایا۔

"اے احنف! جو آدمی زیادہ ہنستا ہے اس کا رعب کم ہو جاتا ہے۔ جو مذاق زیادہ کرتا ہے لوگ اسے ہلکا اور بے حیثیت سمجھتے ہیں۔ جو باتیں زیادہ کرتا ہے اس کی لغزش زیادہ ہو جاتی ہے۔ جس کی لغزش زیادہ ہو جاتی ہے اس کی حیا کم ہو جاتی ہے۔ جس کی حیا کم ہو اس کی پرہیزگاری کم ہو جاتی ہے اور جس کی پرہیزگاری کم ہو جاتی ہے اس کا دل مردہ ہو جاتا ہے"۔

نمرہ اقرا۔ کراچی

لمحۂ فکر

خوش رہو اور "مجھے مڑ کر نہ دیکھو، ماضی دکھ کا ذخیرہ ہے۔ یادیں مضبوط دکھ کر جال سمندر کی ریت کی طرح مجھ سے سرکتا ہے اور انھیں اس کر دو مستقبل تاریک خلا ہے۔

(خلیل جبران)
ملیحہ طاہر۔ جہلم

تین چیزیں

حضرت حبان بن ابی جبلہ کہتے ہیں حضرت ابوذر اور حضرت ابو الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

"تمہارے بچے پیدا ہو رہے ہیں جو ایک دن مر جائیں گے اور تم عمارتیں بنا رہے ہو جو ایک دن اجڑ جائیں گی۔ فانی دنیا کے تم حریص ہو لیکن باقی رہنے والی آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔

غور سے سنو! تین چیزیں لوگوں کو پسند نہیں ہیں لیکن مجھے بہت اچھی۔ ایک موت، دوسرے بیماری، تیسرے فقر"۔

نازش دلشاد۔ کراچی

موتی جیسے الفاظ

- اچھی بات تو سب کو اچھی لگتی ہے۔ جب تمہیں کسی کی بری بات بھی بری نہ لگے تو سمجھ لینا تمہیں اس سے محبت ہے۔
- تجربہ انسان کو غلط فیصلے سے بچاتا ہے مگر تجربہ غلط فیصلے سے ہی حاصل ہوتا ہے۔
- عزت دل میں ہونا چاہیے لفظوں میں نہیں، مذاق لفظوں میں ہونا چاہیے دل میں نہیں۔
- خوش نصیب وہ نہیں جس کا نصیب اچھا ہو بلکہ خوش نصیب وہ ہے جو اپنے نصیب پر خوش ہے۔

(اشفاق احمد۔ زاویہ سے)
بشریٰ باجوہ عطاریہ۔ اوکاڑہ

جواہر ریزے

- تمہیں قسم ہے، جو دانا دل نے کہا ہے۔ اس پر خود عمل کرو، خواہ تجھے آ سے یا نہ آئے۔
- ہر انسان، خواہش رکھتا ہے کہ وہ کسی کو چاہے اور کوئی اسے چاہے۔
- جو شخص آپ کے قریب آنے کی خواہش کرتا ہے اسے ایک فاصلے پر رکھو، پھر اس کی چاہت میں فرق نہ آئے گا۔
- جتنے اقوال زریں ہیں ان کی حقیقت ایک دم عیاں نہیں ہوتی۔ کم از کم بیس سال کی عمر تک ظاہر ہوتی رہتی ہے۔
- چیز جب قریب آجائے، تب بھی کشش اور تذکرہ کھو دیتی ہے، دور چلی جائے تب بھی۔
- اگر چاہتے ہو کہ ہر کام تمہاری مرضی سے ہو تو پھر خدا کی مرضی کو اپنی مرضی سمجھو۔

(محمد مختار شاہ کی بات سے بات سے انتخاب)
ساجدہ کنول۔ گوجرہ

شہید زندہ ہیں

حضرت ابوزبیر کہتے ہیں حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

جب حضرت عطاء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فی کہا جنہوں نے جاری کی تو اعلان کیا گیا کہ ہم اپنے جنگ احد کے شہیدوں کو منتقل کر لیں چنانچہ ہم نے انہیں چالیس سال کے بعد نکالا تو ان کے جسم بالکل نرم تھے اور ان کے ہاتھ پاؤں مڑ جاتے تھے"۔

عائشہ تحریم۔ کراچی

تقدیر

حضرت عبدالرحمن بن ابزی کہتے ہیں، کسی آدمی نے حضرت عمر کو بتایا کہ کچھ لوگ تقدیر کے بارے میں غلط باتیں کرتے ہیں۔ اس پر حضرت عمر نے کھڑے ہو کر بیان فرمایا۔

"اے لوگو! تم سے پہلی امتیں تقدیر کے بارے میں غلط باتیں کر کے ہی ہلاک ہوئی ہیں۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں عمر کی جان ہے۔ آئندہ جن دو آدمیوں کے بارے میں، میں نے یہ سنا کہ تقدیر کے بارے میں (اپنی عقل سے) باتیں کر رہے ہیں تو میں دونوں کی گردن اڑا دوں گا"۔

[illegible] کہتے ہیں حضرت عمر [illegible] لوگوں نے تقدیر کے بارے میں [illegible] حجاج کے زمانے میں شام میں ایک جماعت ظاہر ہوئی جس نے سب سے پہلے تقدیر کے بارے میں بات کرنی شروع کی۔

ثمینہ تاج۔ کراچی

علم

حضرت ابن عمر فرماتے ہیں۔

"آدمی علم اور اعلام ہے اسی وقت ہوگا جب اپنے سے اوپر والے سے حسد نہ کرے اور اپنے سے نیچے والے کو حقیر نہ سمجھے اور علم کے بدلے میں کوئی قیمت نہ چاہے"۔

اللہ کی کتاب

حضرت حسن رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عمر کے دروازے پر بہت زیادہ آیا کرتا تھا۔ حضرت عمر نے اس سے فرمایا۔

"جا اللہ کی کتاب سیکھ۔"

چنانچہ وہ چلا گیا اور کئی دن تک حضرت عمر کو نظر نہ آیا۔ پھر اس سے حضرت عمر کی ملاقات ہوئی تو حضرت عمر نے نہ آنے پر اس پر کچھ خفگی کا اظہار کیا تو اس نے کہا۔

"مجھے اللہ کی کتاب میں وہ کچھ مل گیا ہے جس کے بعد عمر کے دروازے کی ضرورت نہیں رہی"۔

ندا، فضہ۔ کراچی

سوچ کا سفر

- ہمیشہ اچھی بات سوچنا، کہنا اور سننا کیونکہ اچھی بات عمدہ سوچ کی عکاسی کرتی ہے اور عمدہ سوچ اچھا ذہن صرف اچھے انسان کی ملکیت ہی ہو سکتا ہے۔
- ایسی بات کرو جس سے تم پہچانے جاؤ کیونکہ انسان اپنی زبان کے پیچھے پوشیدہ ہے۔ الفاظ کے پیچھے بھاگنے کے بجائے خیالات تلاش کرو۔ [illegible] بالکل [illegible] مقابل کی [illegible] اترتا ہے جیسے ڈھلتی رات کی مدھم تاریکی میں سورج کی نرم کرنیں دھیرے دھیرے اتر کر تاریکی کا سینہ چیر دیتی ہیں۔
- خوبصورتی چہرے پر نہیں، ذہن میں ہوتی ہے جو انسان کو حسین بنا دیتی ہے۔

ذکیہ غفار۔ اوچ شریف

علم

امام مالک رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چار آدمیوں سے علم حاصل نہیں کرنا چاہیے۔

1. بے وقوف جس کی بے وقوفی اعلانیہ ہو۔
2. کذاب۔
3. بدعتی جو اپنی بدعت کی طرف دعوت دیتا ہو۔
4. نیک آدمی جسے حدیث کا کچھ بھی پتا نہ ہو۔

وراثت

مسلمہ بن عبدالملک، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس ان کے آخری وقت میں پہنچے اور دریافت کیا۔

"اے امیر المومنین! آپ نے ایسا کام کیا ہے جو کسی نے نہ کیا ہو۔ آپ کے تیرہ فرزند ہیں اور آپ نے ان کے لیے ایک درہم بھی باقی نہیں چھوڑا ہے۔"

یہ سن کر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا "اس کے علاوہ میں نے ان کی ملک دوسروں کو اور دوسروں کی ملک ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں دی ہے۔ اب اگر جو بیٹا لائق اور خداوند تعالیٰ کا فرماں بردار ہوگا۔ تو خداوند تعالیٰ اس کے لیے کافی ہے اور جو ناخلف ہے۔ اس کی نالائقی کا مجھے کچھ غم نہیں (وہ جانے اور اس کا کام)

پیسے کی زیادتی

جناب یحییٰ بن معاذ رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ امیر کے لیے موت کے وقت دو مصیبتیں ہیں۔ دوسرے لوگ ان سے [illegible] ہیں۔ ایک مصیبت تو یہ [illegible] مال [illegible] یا جاتے رہے اور دوسری مصیبت یہ کہ قیامت میں اس مال کی پرسش اس سے کی جائے گی۔

بچھو کی پیدائش

حضرت سعدیؒ بیان فرماتے ہیں: میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ بچھو کی پیدائش عام جانداروں کی طرح نہیں ہوتی۔ اپنی ماں کے پیٹ میں جب بچہ بڑا ہو جاتا ہے تو اندر سے پیٹ کو کھانا شروع کر دیتا ہے اور یوں سوراخ کرکے باہر آجاتا ہے۔ میں نے یہ بات ایک مرد دانا کے سامنے بیان کی تو انہوں نے فرمایا۔

"میں سمجھتا ہوں یہ بات درست ہی ہوگی بلکہ اسے درست ہونا چاہیے۔ بچھو کی فطرت اور عادت پر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے پہلے دن سے برائی ہی کی ہوگی۔ یہی بات ہے کہ ہر شخص اس سے نفرت کرتا ہے اور دیکھتے ہی مار ڈالتا ہے۔"

ادنیٰ چیز

ایک صاحب مرتبہ بزرگ بیابان سے فاقہ زدہ اور سفر کی صعوبتیں اٹھاتے ہوئے بازار کوفہ میں پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چڑیا تھی اور آواز لگا رہا تھا کہ "مجھے اس چڑیا کی خاطر کچھ دے دو۔" لوگوں نے کہا۔

"اے شخص! یہ کیا کہتے ہو؟"

اس نے کہا "مجال ہے کہ میں یہ کہوں کہ مجھے خدا کی راہ پر کچھ دو۔ دنیا کے لیے ادنیٰ چیز کا ہی وسیلہ دیا جاسکتا ہے۔ چونکہ دنیا قلیل ہے۔ طوالت کی وجہ سے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔"

(اقتباس: کشف المحجوب از علی ہجویری)

رضیہ چوہدری۔ میاں چنوں

باتیں سنورنے والی

- راستوں کی ویرانی اور جلتی دھوپ سے ڈرنے والے منزل تک نہیں پہنچ سکتے
- جہاں سے [illegible] تعلق اپنی [illegible] دے
- اگر تم نے ہر حال میں خوش رہنے کا فن سیکھ لیا ہے تو یقین کرو زندگی کا سب سے بڑا فن سیکھ لیا ہے۔
- آتش فشاں پہاڑوں سے ایش ٹرے استعمال کرنے کی توقع نہیں ہونی چاہیے۔
- سینا تا جب روح کی گہرائیوں میں اتر جائے تو رو نقیں متاثر نہیں کرتیں۔
- محبت حاصل کرنا ہر کسی کے لیے ممکن نہیں لیکن محبت پھیلانا ہر ایک کے لیے ممکن ہے۔
- زندگی ہمیں وہ کچھ کرنے پر مجبور کردیتی ہے جس کا ہم نے تصور بھی نہیں کیا ہوتا۔
- ہم کسی کو تب تک مجبور نہیں کرسکتے جب تک اس کی کسی کمزوری سے واقف نہ ہوں۔
- ٹھیس لگے تو بھی شاہکار بنتے ہیں اور منظر عام پر آتے ہیں۔

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

شاعری سچ بولتی ہے

سعدیہ قدیر

شاعری سچ بولتی ہے اور یہ بات کئی قاری بہنیں درست ثابت کرچکی ہیں۔

میں ابتدا کروں گی اردو کے خود پسند شاعر منیر نیازی سے کہ جن کی خود پسندی کچھ ایسی بلاوجہ بھی نہیں۔

ہمیشہ دیر کردیتا ہوں میں ہر کام کرنے میں
ضروری بات کہنی ہو کوئی وعدہ نبھانا ہو
اسے آواز دینی ہو اسے واپس بلانا ہو
ہمیشہ دیر کردیتا ہوں...!
مدد کرنی ہو اس کی، یار کی ڈھارس بندھانا ہو
بہت دیرینہ رستوں پر کسی سے ملنے جانا ہو
ہمیشہ دیر کردیتا ہوں میں!
بدلتے موسموں کی سیر میں دل کو لگانا ہو
کسی کو یاد رکھنا ہو کسی کو بھول جانا ہو
ہمیشہ دیر کردیتا ہوں میں
کسی کو موت سے پہلے کسی غم سے بچانا ہو
حقیقت اور تھی کچھ اس کو جاکے یہ بتانا ہو
ہمیشہ دیر کردیتا ہوں میں ہر کام کرنے میں

جون ایلیا بڑی بڑی باتیں سادگی سے کہہ جاتے ہیں۔ ان کی ایک غزل کے چند اشعار۔

نیا اک رشتہ پیدا کیوں کریں ہم
بچھڑنا ہے تو جھگڑا کیوں کریں ہم

خموشی سے ادا ہو رسم دوری
کوئی ہنگامہ برپا کیوں کریں ہم

یہ کافی ہے کہ ہم دشمن نہیں ہیں
وفاداری کا دعویٰ کیوں کریں ہم

نہیں ہے دنیا کو جب پروا ہماری
تو پھر دنیا کی پروا کیوں کریں ہم

برہنہ ہیں سر بازار تو کیا
بھلا اندھوں سے پردہ کیوں کریں ہم

محبتوں کے شاعر، ساحر لدھیانوی کے ذکر کے بغیر یہ محفل ادھوری لگے گی۔ ان کی ایک خوبصورت نظم۔

خوبصورت موڑ

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں
نہ میں تم سے کوئی امید رکھوں دل نوازی کی

نہ تم میری طرف دیکھو غلط انداز نظروں سے
نہ میرے دل کی دھڑکن لڑکھڑائے میری باتوں سے

نہ ظاہر ہو تمہاری کشمکش کا راز نظروں سے
چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

تمہیں بھی کوئی الجھن روکتی ہے پیش قدمی سے
مجھے بھی لوگ کہتے ہیں کہ یہ جلوے پرائے ہیں

مرے ہمراہ بھی رسوائیاں ہیں میرے ماضی کی
تمہارے ساتھ بھی گزری ہوئی راتوں کے سائے ہیں

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں
تعارف روگ ہو جائے تو اس کا بھولنا بہتر

مریم رانا ــــــــــــــــ ٹنڈو جان محمد

سحر جیسی بھی ہوا پھر بھی سحر ہے
شب غم سے نکلنا چاہتے ہیں
نہیں راکھنی ہے کی تیز آندھی
دیے تو کب سے جلنا چاہتے ہیں

عذرا ناصر ــــــــــــــــ کراچی

بھٹکنے والوں کو کیا فرق اس سے پڑتا ہے
سفر ہی کون۔ سڑک کس طرف کو جاتی ہے
دکھائی دیتا ہے منظر تمہارے جانے سے
کسی دیے کی کبھی لو جو تھرتھراتی ہے

بشریٰ فرید باجوہ ــــــــــــــــ اوکاڑہ

کبھی جذبوں کبھی خوابوں کی تجارت کر کے
دل نے دکھ درد کمائے ہیں محبت کر کے
تم جب آؤ گے تو محفوظ ملیں گے تم کو
ہم نے دفنا دیے خواب امانت کر کے

مس فوزیہ کنول ــــــــــــــــ ککنن پور

بجھ جاتی ہے میرے جنوں میں آ کر اس طرح
میری تنہائی بھی میرے گھر کا فرد ہو جیسے

شاہدہ شبیر رانا ــــــــــــــــ کہروڑ پکا

تمہاری یاد بھی عشق کبھی جلتی کی پوچھی ہے
ہے ہم ساتھ رکھتے ہیں جسے ہم روز گنتے ہیں

فائزہ اللہ رکھا ــــــــــــــــ جیمس آباد

ان کے انداز کرم ان پہ وہ آنا دل کا
ہائے وہ وقت، وہ باتیں، وہ زمانہ دل کا
وہ بھی اپنے نہ ہوئے، دل بھی گیا ہاتھوں سے
ایسے آنے سے تو بہتر ہے نہ آنا دل کا

ساجدہ زید ــــــــــــــــ

باتوں باتوں میں بچھڑنے کا اشارہ کر کے
خود بھی رویا بہت وہ ہم سے کنارہ کر کے
دیکھ لیتے ہیں چلو حوصلہ اپنے دل کا
اور کچھ روز بنا تیرے گزارہ کر کے

آمنہ مالک بھٹی ــــــــــــــــ سنبھالی کلاں

میری بے بسی پہ نہ مسکرا یہ وقت وقت کی بات ہے!
کبھی ساتھ شمس و قمر چلیں کبھی ساتھ سایہ بھی چھوڑ دے

مقدس رباب ــــــــــــــــ چکوال

تعمیر کر رہا ہے محبت کا وہ حصار
میرے لیے خلوص کی زنجیر ہے بہت
بیٹھا رہا وہ پاس تو میں سوچتی رہی
خاموشیوں کی آپ بھی تاثیر ہے بہت

شمیم صدر الدین رحمانی ــــــــــــــــ صفدر آباد

ہیں تو اپنے سر سے الزام لے کر بھی خوش ہوں
تمہیں سناتی رہیں گی گواہیاں دل کی
نہیں نہ چھیڑ کر ہم سوز غم کے مارے لوگ
سجاتے پھرتے ہیں آنکھوں میں کرچیاں دل کی

نوشین اقبال نوشی ــــــــــــــــ گاؤں بدرجان

ستم ہے کہ دنیا کے کتنے ہی کام
ضروری نہیں ہیں مگر کرتے ہیں
بہت سخت موسم ہے لیکن شعور
کسی طور یہ دن بسر کرتے ہیں

آمنہ ــــــــــــــــ ڈہرکی

کبھی تھی سامنے اس کے کتاب ماضی
ٹپک رہے تھے پرانے ملال چہرے پر
وہ پڑھ کے سامنے دیر تک اس منظر
تلاش کرتا رہا گزرے سال چہرے پر

فرحت غلام نبی، ثریا آصف ــــــــــــــــ خانیوال

وہ درخت جن پہ پرندوں کے گھر نہیں ہوتے
دراز جتنے بھی ہوں معتبر نہیں ہوتے
میرے ساتھیوں کی پہچان ہے صرف اتنی سی
کہ ان کے دل میں نفرتوں کے گھر نہیں ہوتے

حرا قریشی ــــــــــــــــ ملتان

کیوں مجھ پہ ہوا ہے مہرباں تو
اک ذرۂ خاک اور کہاں تو
میں دھوپ کی عادی ہو چلی تھی
کیوں مجھ پہ بنا ہے سائباں تو

نادر تخلیق

ملکہ ترنم نور جہاں کے پہلے شوہر ممتاز ہدایت کار شوکت حسین رضوی نے تقسیم سے قبل کئی شاہکار فلمیں تخلیق کیں۔ جن میں میڈم نور جہاں نے اپنی اداکاری اور گلوکاری کے جوہر دکھائے۔ ان ہی میں سے ایک ماسٹر پیس فلم "انمول گھڑی" کو بھی کہا جاتا ہے۔ جس نے بھارت میں کامیابی کے جھنڈے گاڑے۔ اس فلم کے مشہور گیتوں میں "آجا میری برباد محبت کے سہارے" "آواز دے کہاں ہے دنیا میری جواں ہے" "جواں ہے محبت حسین ہے زمانہ" جیسے گانے شامل ہیں۔ 64 سال گزرنے کے بعد اب اس فلم کو سندھ ہائیکورٹ اور پاکستان فلم سنسر بورڈ کی جانب سے پاکستان میں نمائش کی اجازت ملی ہے۔ اس فلم کی نمائش 1965ء میں پاک بھارت جنگ کے بعد روک دی گئی تھی۔

بول

شعیب منصور باتوں سے زیادہ اپنے کام سے اپنا آپ منواتے ہیں۔ لیکن جب بھی بولتے ہیں سب کی بولتی ضرور بند ہو جاتی ہے۔ فلم انڈسٹری میں ان کی موجودگی سے بہتری کی امید پیدا ہوئی ہے۔ جن کے گواہ وہ فنکار ہیں جنہوں نے ان کے ساتھ کام کیا ہے۔ فلم انڈسٹری کے مستقبل کے حوالے سے وہ کہتے ہیں "آج کے دور میں بھارتی فلموں پر پابندی لگا کر کامیابی کی سیڑھی چڑھنا فضول ہے۔ اب ہمیں ان کی موجودگی میں ہی بہتری کو معیار بنانا ہو گا۔ آخر قیام پاکستان کے وقت بھی تو ہم نے کم وسائل میں اچھی فلمیں تخلیق کی تھیں۔ (جب جذبہ ہی کار فرما تھا) جب بھارتی فلمیں ہم اپنے گھروں میں بیٹھ کر دیکھ لیتے ہیں تو پھر سینما گھروں میں ان فلموں پر اعتراض کیوں؟ ہمیں یہ دوغلی پالیسی بدلتے ہوئے اپنا معیار بلند کرنا ہو گا بس محنت اور نیت صاف رکھنے کی ضرورت ہے۔" (لیکن کیا کریں کہ ہماری فلم انڈسٹری میں بھی ہر شعبے کی طرح موقع پرستوں کا ڈیرہ ہے۔ اب آپ جیسے لوگوں سے ہی کچھ امید بندھی ہے۔)

انفرادیت

کلاسک ہمیشہ اپنا الگ ہی مقام رکھتا ہے۔ بابرہ

شریف بھی شوبز کا وہ چہرہ ہیں، جنہیں بجا طور پر کلاسک کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ شوبز میں جیسی شہرت بابرہ کے حصے میں آئی بہت کم لوگوں کا نصیب بنی ہے۔ اپنے تجربات کے حوالے سے وہ کہتی ہیں "مجھے فلم انڈسٹری میں پہلی مرتبہ سابق فلم ساز مصطفیٰ قریشی نے اپنی فلم "ایک اور ایک گیارہ" کے لیے کاسٹ کیا تھا۔ یہ فلم بن نہ پائی اور میری پہلی فلم شمیم آرا کی "بھول" ثابت ہوئی۔ اس فلم میں پہلے میری بہن فاخرہ کو کاسٹ کیا گیا تھا بلکہ واشنگ پاؤڈر کے اشتہار کے لیے بھی فاخرہ کو ہی لیا جاتا تھا لیکن ہدایت کار کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور میرے والد کے لاکھ انکار پر بھی وہ نہیں مانا اور مجھے ہی منتخب کیا۔ (ہیرے کی پہچان جوہری ہی کر سکتا ہے) میرے والد مسلسل ڈیڑھ ماہ میرے کام کرنے سے انکاری رہے۔ آخر کار انہیں اجازت دیتے ہی بنی۔ میں نے فلموں میں ہر طرح کے کردار کیے۔ بلکہ شاید جتنی ورائٹی کرداروں کی میں نے دی شاید ہی کسی نے دی ہو۔ اب مجھے کسی کردار کی خواہش نہیں رہی۔ اپنے عروج کے دور میں مجھے دلیپ کمار جیسے اداکار کے ساتھ ایک بھارتی فلم کی پیش کش ہوئی بلکہ پروڈیوسر کئی بار پاکستان آئے تاکہ مجھے کام کرنے پر منا سکیں لیکن میں نے اس لیے انکار کر دیا کہ اس وقت کے قوانین فلم کی تشہیر میں حائل تھے مجھے اس کا کوئی دکھ بھی نہیں۔ میری فلم "میرا نام محبت" کے بعد چین میں اس کی پذیرائی پر میرا مجسمہ بھی نصب کیا گیا لیکن آج تک میں نے خود وہ مجسمہ نہیں دیکھا۔"

معیار

فیصل قریشی ابھی تک نوجوان دکھتے ہیں اور ہر طرح کے کردار کر کے اب منی اسکرین کی ضرورت بن چکے ہیں۔ اپنے شوق اور پروفیشن کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ "میں بچپن سے ہی مختلف اداکاروں کے کام کا گہرائی سے جائزہ لیتا تھا۔ خصوصاً ندیم، فردوس جمال، جاوید شیخ میرے آئیڈیل تھے۔ جب نیا نیا شوبز میں آیا تو فردوس جمال صاحب کے مکالمے شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر بولتا تاکہ زبان میں اور درستگی آئے۔ ندیم صاحب اور جاوید شیخ کے ساتھ تو فلموں میں کام بھی کیا۔ تاہم میں اب بھی اپنی اداکاری کو بہترین قرار

نہیں دیتا (آگے بڑھنے کے لیے یہ ضروری بھی ہے) بہت سارے اداکار اچھا کام کر رہے ہیں خصوصاً فہد مصطفیٰ اور ہمایوں سعید کے کام میں ورائٹی ہے۔ میں اپنے کرداروں کی روح کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تاکہ اداکاری میں یکسانیت نہ آنے پائے اور میں اسے پورے انصاف سے کر پاؤں۔ اسی لیے اب میں ینگ ٹو اولڈ کردار بھی قبول کر لیتا ہوں۔ اب بھی میری عمر کے اداکار ایسا کرتے ہوئے سوچتے ہیں (جب کہ ہیرو کم بڑے بھائی زیادہ لگتے ہیں) اگر مجھے اب کریکٹر رول ہی ملتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ میں انفرادیت برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جہاں تک سوال بھارت جا کر کام کرنے کا ہے تو جب تک مجھے اسی معیار کا کام وہاں سے آفر نہیں ہوگا میں وہاں کے لیے کام نہیں کروں گا۔ میں کسی سازش کا حصہ نہیں بننا چاہتا۔"

(غیرت مندی کا تقاضا بھی یہی ہے)

جائیداد ضبط

ہمارے کچھ فنکاروں کے خیال میں بھارت میں دودھ شہد کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ اس لیے وہ اپنی صلاحیتیں کیش کروانے وہاں کا رخ کرتے ہیں۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچتے ہیں تو انہیں "اصلیت" کا علم ذرا کھل کر ہوتا ہے۔ اب عدنان سمیع خان کو ہی لیجیے

جنہوں نے "بھارتی" بننے کے لیے ہر جتن کر ڈالے لیکن پھر بھی "پاکستانی نژاد" ہونے کے باعث معتوب ٹھہرائے گئے۔ حال ہی میں بھارتی حکومت نے فارن ایکسچینج ایکٹ کے تحت ممبئی میں ان کی 13 جائیدادیں ضبط کر لیں جس کی مالیت ڈھائی کروڑ روپے بتائی جاتی ہے۔ اور ایسا صرف پاکستانی ہونے کے ناتے ان کے ساتھ ہوا۔ بے چارے عدنان کو اپنی نئی بیگم رویا فاریابی کے ساتھ دربدری سہنا پڑی۔ سننے میں تو یہ بھی آیا ہے کہ اداکار دیو آنند نے اپنے پالی ہل والے بنگلے میں انہیں رہنے کی پیش کش کی ہے۔ عدنان سمیع خان ابھی تک اس کشمکش میں ہیں کہ آخر یہ ناانصافی کیوں ہوئی؟ حالانکہ جو صورت حال وہاں کے مسلمانوں کو "بھارتی" ہونے کے باوجود درپیش ہے اس سے اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ بہتری یہاں ہے کہ وہاں۔

مضر صحت

بچے کی مسکراہٹ سخت سے سخت دل انسان کی توجہ حاصل کر لیتی ہے اور اگر وہ بیمار ہو جائیں تو سب کے دل اداس ہو جاتے ہیں۔ عموماً مائیں بخار میں بچوں کو پیراسیٹامول سیرپ پلاتی ہیں۔ حالیہ تحقیق نے اس کے استعمال کو خطرناک قرار دیتے ہوئے مضر صحت قرار دیا ہے۔ ماہرین کی رائے میں بچوں میں ابتدائی 15 ماہ میں کالپول یا پیراسیٹامول سیرپ کے غیر ضروری استعمال سے مختلف قسم کی الرجی اور دمے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ وہ مائیں جو معمولی بخار یا درد میں یہ ادویات بچوں کو پلاتی ہیں اس سے دمے اور الرجی کے امکانات 90 فیصد تک بڑھ جاتے ہیں۔ ان کے سینے سے سیٹی جیسی آوازوں کے علاوہ دمہ کی دیگر علامتیں بھی بڑھ جاتی ہیں۔ اگرچہ پیراسیٹامول کے فوائد اس کے نقصانات سے زائد ہیں اس لیے صرف ضرورت کے وقت ہی اس کا استعمال کیا جائے۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

مزیدار پسندے رائس

ضروری اجزا :

پسندے	ایک کلو
باستی چاول	ایک پیالی
(نمک اور ثابت گرم مسالا ڈال کر ابال لیں)	
دہی	ڈیڑھ پیالی
کچا پپیتا	کھانے کے دو چمچے
گرم مسالا پاؤڈر	کھانے کا ایک چمچہ
بھنے چنے	کھانے کا ایک چمچہ
خشخاش	کھانے کا ایک چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ پاؤڈر	چائے کے دو چمچے
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
تیل	آدھی پیالی

ترکیب :

نمک، لال مرچ پاؤڈر، خشخاش، بھنے چنے اور کچے پپیتے کو اچھی طرح پیس کر پھینٹتے ہوئے دہی میں مکس کر دیں اور پسندوں کو اس مسالے میں ڈال کر ایک گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ ہانڈی میں تیل گرم کریں اور پسندے اس میں رکھ کر ڈھکن بند کر دیں اور دھیمی آنچ پر پکائیں تاکہ پسندے خستہ ہو جائیں اور پانی خشک ہو جائے، جب پانی بالکل خشک ہو جائے تو پسندوں کو بھون لیں۔ ایک سرونگ ڈش میں چاول نکالیں۔ اس پر بھنے ہوئے پسندے رکھیں اور ہرے دھنیے سے گارنش کر کے پودینے کی چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

ویجی ٹیبل املی رائس

ضروری اجزا :

باستی چاول	ایک کلو (تین کنی ابال لیں)
آلو	دو عدد (کیوب کٹ لیں)
شلجم	دو عدد (کیوب کٹ لیں)
گاجر	تین عدد (کیوب کٹ لیں)
شملہ مرچ	4 عدد (کیوب کٹ لیں)
مٹر	آدھی پیالی
پودینہ	آدھی گٹھی (کٹ لیں)
املی کا گودا	آدھی پیالی
لیموں	دو عدد (سلائس کٹ لیں)
ہری مرچیں	6-8 عدد
لہسن ادرک پیسٹ	کھانے کے چار چمچے
پیاز (براؤن کی ہوئی)	آدھی پیالی
سرخ مرچ پاؤڈر	کھانے کے دو چمچے
ہلدی پاؤڈر	چائے کا ایک چمچہ
دھنیا پاؤڈر	چائے کا ایک چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
رائی	چائے کا ایک چمچہ
میتھی دانہ	چائے کا ایک چمچہ
کلونجی	چائے کا آدھا چمچہ
سفید زیرہ	کھانے کا آدھا چمچہ
سیاہ مرچ پاؤڈر	6-8 عدد
ثابت دھنیا	کھانے کا ایک چمچہ
سرخ مرچ (کٹی ہوئی)	چائے کا ایک چمچہ
گھی	آدھی پیالی
زعفرانی رنگ	چائے کا ایک چوتھائی چمچہ

ترکیب :

ایک کڑاہی میں کھانے کے دو چمچے گھی گرم کر کے اس میں آلو، شلجم، گاجر، شملہ مرچ، مٹر ڈال کر فرائی کر لیں اور پانی ڈال کر ہلکا سا گلا لیں۔ ایک بڑی پتیلی میں گھی ڈال لیں۔ لہسن اور ادرک کا پیسٹ، سرخ مرچ پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر، نمک اور تھوڑا سا پانی شامل کر دیں۔ اب رائی، میتھی، کلونجی، سفید زیرہ، سیاہ مرچ پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر، نمک اور تھوڑا سا پانی شامل کر دیں۔ اب رائی، میتھی، کلونجی، سفید زیرہ، سیاہ مرچ پاؤڈر، ثابت دھنیا، سرخ مرچ کو ہلکا سا بھون کر پیس لیں۔ اسے پتیلی میں ڈال دیں۔ اس کے بعد تلی ہوئی سبزیاں اور املی کا گودا ڈال دیں اور مسالا بھون لیں۔ اوپر سے براؤن پیاز، پودینہ، ہری مرچ اور لیموں کے سلائس اور چاول شامل کر کے تھوڑا پانی ڈال کر زعفران کا رنگ چھڑک کر دم سے دیں۔

کوفتہ رائس

کوفتے کے لیے ضروری اجزا :

قیمہ	آدھا کلو
نمک	حسب ذائقہ
ادرک پیسٹ	چائے کا ایک چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	چائے کا آدھا چمچہ
ہرا دھنیا	آدھی پیالی
ہری مرچیں (چوپ کر لیں)	تین عدد
پیاز	ایک عدد
(چوکور چوپ کر لیں)	
لال مرچ پاؤڈر	چائے کا آدھا چمچہ
بیسن	کھانے کا ایک چمچہ

رائس کے لیے

چاول (ابال لیں)	آدھا کلو
پیاز (باریک کاٹ لیں)	ایک عدد
لہسن ادرک پیسٹ	کھانے کا ایک چمچہ
زیرہ	چائے کا ایک چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	آدھی پیالی
دہی	آدھی پیالی

ترکیب :

قیمے کو چوپر میں پیس کر اس میں نمک، لال مرچ پاؤڈر، ادرک پیسٹ، گرم مسالا پاؤڈر، ہرا دھنیا، ہری مرچیں، پیاز اور بیسن مکس کرکے کوفتے بنا کر رکھیں۔ چاول کو بھگو دیں۔ ایک پتیلی میں تیل گرم کریں۔ پیاز ڈال کر فرائی کریں۔ ہلکی سنہری ہو جائے تو زیرہ، لہسن ادرک پیسٹ ڈال کر فرائی کریں۔ اس کے بعد اس میں کوفتے ڈالیں۔ دہی پھینٹ کر ڈالیں۔ ڈھکن ڈھانپ کر کپڑے سے پکڑ کر پتیلی ہلاتے رہیں۔ کوفتوں کا پانی خشک ہو جائے تو چاول ______ ڈالیں۔

چاول دم پر رکھیں۔ چاہیں تو زردے کا رنگ کیوڑے میں مکس کرکے ڈالیں۔ مزیدار کوفتہ رائس تیار ہے۔ سلاد اور رائتے کے ساتھ گرم گرم سرو کریں۔

مسالے والی اچاری طاہری

ضروری اجزا :

باسمتی چاول	ایک کلو
مٹر	آدھا کلو
میتھی دانہ	چائے کا ایک چمچ
آلو	آدھا کلو
ٹماٹر (کٹے ہوئے)	تین عدد
ہری مرچ	6 عدد
لال مرچ پاؤڈر	کھانے کے دو چمچ
ہلدی پاؤڈر	چائے کا آدھا چمچ
کڑی پتہ	تین عدد
لہسن پیسٹ	چائے کے دو چمچ
لیموں	ایک عدد
ثابت لال مرچ	6 عدد
ثابت سیاہ مرچ	8 عدد
لونگ	4 عدد
پیاز (سلائس کاٹ لیں)	2 عدد
دار چینی	دو چھوٹے ٹکڑے
بڑی الائچی	دو عدد
نمک	حسب ذائقہ
مکس اچار	آدھی پیالی
تیل	کھانے کے چار چمچ

ترکیب :

ایک بڑی پتیلی میں تیل گرم کریں۔ اس میں پیاز ڈال کر سنہری مائل ہونے تک بھونیں۔ اس کے بعد تھوڑا سا پانی ڈال کر اس میں ثابت دھنیا، ہلدی پاؤڈر، لال مرچ پاؤڈر، لہسن پیسٹ، ثابت سیاہ مرچ، لونگ، دار چینی، بڑی الائچی اور نمک شامل کر دیں اور ساتھ ہی ٹماٹر بھی ڈال دیں۔ جب ٹماٹر گل جائیں اور مسالا تیار ہو جائے تو اس میں آلو، مٹر، میتھی دانہ، کڑی پتہ اور پانی ڈال دیں۔ جب یہ چیزیں گل جائیں تو بھگوئے ہوئے چاول شامل کر دیں۔ ساتھ ہی اچار، ہری مرچیں، ثابت لال مرچ بھی ڈال دیں۔ جب پانی سوکھ جائے تو لیموں نچوڑ کر دم پر لگا دیں۔ تیار ہونے پر کھیرے اور پیاز کے رائتے کے ساتھ نوش فرمائیں۔

انڈے کے پراٹھے

ضروری اجزاء :

انڈے	دو عدد
سفید آٹا	ایک پاؤ
نمک	حسب ذائقہ
دودھ	ایک پاؤ
گھی	حسب پسند

ترکیب :

آٹے میں تھوڑا گھی اور نمک ڈال کر اسے خوب ملائیں بلکہ ہاتھ دھو کر دونوں ہاتھوں سے مسل کر بالکل یک جان کر لیں۔ دودھ اور انڈے ملا کر خوب پھینٹیں۔ اس پھینٹے ہوئے دودھ اور انڈوں کے ساتھ آٹا گوندھ لیں پھر اس کے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا کر اندر اور باہر گھی لگا کر پراٹھے کی طرح پکائیں۔ بہت مزے دار پراٹھے بنیں گے۔

☆

تابوت سکینہ

تابوت سکینہ ایک صندوق ہے، جس میں یہودیوں کے تبرکات ہیں۔ قرآن مجید میں اس صندوق کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

"ان کے نبی نے ان کو یہ بھی بتایا کہ خدا کی طرف سے اس کے بادشاہ مقرر ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کے عہد میں وہ صندوق تمہیں واپس مل جائے گا۔ جس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لیے سکون قلب کا سامان ہے۔ جس میں آل موسیٰ آل ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات ہیں اور جسے اس وقت فرشتے سنبھالے ہوئے ہیں" (248:2)

بنی اسرائیل اس صندوق کو "انطاہا" "عہد کا صندوق" کہتے تھے۔ بائبل کے مطابق ایک لڑائی کے موقع پر فلسطینی مشرکوں نے اس صندوق کو بنی اسرائیل سے چھین لیا تھا لیکن یہ مشرکین کے جس شہر اور جس بستی میں رکھا گیا وہاں وبائیں پھوٹ پڑیں آخر کار انہوں نے خوف کے مارے اسے ایک بیل گاڑی پہ رکھ کر گاڑی کو ہانک دیا۔

بنی اسرائیل اس صندوق کو بڑا متبرک اور اپنے لیے فتح و نصرت کا نشان سمجھتے تھے۔ جب یہ صندوق ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو پوری قوم کی ہمت جواب دے گئی اور ہر ایک اسرائیلی یہ سوچنے لگا کہ خدا کی رحمت ہم سے دور ہو گئی اور اب ہمارے برے دن آ گئے۔ (بحوالہ سموئیل 1 باب 76 : 201)

اس صندوق میں کیا تھا؟ بائبل کے مطابق اس میں حضرت یوسف کا جسد مبارک اور بائبل ہی کی بعض روایات کے مطابق اس میں ہڈیاں اور کپڑے تھے اور اسے حضرت موسیٰ مصر سے اپنے ساتھ لائے تھے۔

قصص الانبیاء میں ہے کہ اس متبرک صندوق میں تورات کا اصل نسخہ حضرت موسیٰ اور ہارون کے عصا و پیرہن اور من کا مرتبان محفوظ تھے۔ فلسطینیوں نے اسے اسرائیلیوں سے چھین کر اپنے معبد "بیت دجون" میں رکھ دیا تھا۔

قرآن مجید میں اس کے بارے میں تصریح ہے کہ جب اسرائیلیوں کے ہاتھوں سے یہ صندوق نکل گیا تو فرشتے اس کی حفاظت پر مامور تھے اور اس میں آل موسیٰ اور ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات تھے۔ جن میں پتھر کی وہ تختیاں جو طور سینا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو دی تھیں۔ اس کے علاوہ تورات کا وہ اصل نسخہ جسے حضرت موسیٰ نے لکھوا کر بنی لاوی کی حفاظت میں دیا تھا۔ نیز ایک بوتل جس میں "من" بھر کر محفوظ کر دیا گیا تھا تاکہ آنے والی نسلیں اللہ تعالیٰ کے اس احسان کو یاد کریں جو صحرا میں ان کے باپ دادا پر کیا گیا تھا اور "عصا" حضرت موسیٰ کا عصا بھی اسی صندوق کے اندر تھا۔ جب طالوت بنی اسرائیل کا بادشاہ بنا تو یہ صندوق بھی بنی اسرائیل کو دوبارہ واپس مل گیا۔

حضرت داؤد کی زبردست خواہش تھی کہ وہ اس صندوق کے لیے ایک مستقل گھر بنائیں تاکہ یہ محفوظ رہے لیکن اسرائیلیات کے مطابق انہیں خواب کے ذریعے بتایا گیا کہ یہ گھر ان کے بیٹے حضرت سلیمان کے عہد میں تعمیر ہوگا۔ چنانچہ حضرت داؤد اس کی تعمیر کے لیے ضروری سامان جمع کرتے رہے اور اپنے بیٹے کے کام کو آسان کرنے کی خاطر اس کام میں متواتر مصروف رہے۔

بالآخر حضرت سلیمانؑ نے اپنے مبارک عہد میں یہ گھر تعمیر کیا جو ہیکل سلیمانی کے نام سے مشہور ہوا۔ حضرت سلیمانؑ نے پریوں اور خادموں کے لیے بھی رہائش گاہیں بنائی تھیں۔ اس کے باوجود ہر آنے والے بادشاہ نے اس ہیکل کی بارہ دریوں اور برآمدوں میں اضافہ کیا۔ حتیٰ کہ تابوت سکینہ کا کمرہ ان مختلف عمارتوں میں چاروں طرف سے گھر گیا۔

598 ق۔م میں جب بابل کے بادشاہ بخت نصر نے ہیکل سلیمانی کو تباہ و برباد کر دیا اور جلا کر راکھ کر دیا تو اس افراتفری میں تابوت سکینہ بھی غائب ہو گیا اور آج تک اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

شازیہ خان۔ ملتان

مارٹن لوتھر

وہ کوئی پیغمبر تو نہیں تھا لیکن پھر بھی اسے ایک مذہبی رہنما کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ اس سے پہلے عیسائیت میں کوئی فرقہ واریت نہ تھی۔ پہلے وہ ایک فوک ہیرو (Folk Hero) بنا پھر یورپ کی مشہور زمانہ تحریک اصلاح (Reformation) کے تسلیم شدہ لیڈر کی حیثیت سے پوری دنیا میں مشہور ہو گیا۔

چرچ کی مخالفت کوئی معمولی بات نہ تھی۔ عدالت میں حاضر ہو کر جو بیان اس نے دیا اس نے ساری مسیحی دنیا کو لرزہ براندام کر دیا۔ سب پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ رومن کیتھولک چرچ کا پوپ کسی گناہ گار کو کفارہ ادا کر دینے کے بعد اس کے گناہ کو معاف کر سکتا تھا۔ اس نے عدالت میں کہا۔

"پوپ کسی بھی گھٹیا گناہ گار سے کسی بھی طرح کم نہیں۔" پھر یوں ہوا کہ اسے مذہب سے خارج کر دیا گیا پھر پھانسی کا حکم دیا گیا۔ وہ کسی طرح فرار ہو گیا۔

اسے جرمن نوابوں کے ہاں پناہ مل گئی جو اس کے خیالات سے متفق تھے۔ رفتہ رفتہ اس کے پیروکاروں کی تعداد بڑھتی گئی اور بالآخر مسیحی مذہب دو فرقوں میں تقسیم ہو گیا۔ یہ دونوں فرقے تب سے آج تک قائم ہیں اور چل رہے ہیں۔

وہ نئے چرچ کے نمائندے کی حیثیت سے صرف بپتسمہ اور عشائے ربانی کو مانتا تھا۔ اس نے پادریوں کی مجرد زندگی کی مخالفت کی جو پرانے چرچ میں رائج تھی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ شادی کوئی گناہ نہیں بلکہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ کھانا پینا۔ اس نے راہباؤں (NUNS) کو خانقاہوں سے فرار ہونے میں مدد دی اور ان کی شادیوں کی حمایت کی۔ اس نے سب سے پہلے شادی ایک نن ہی سے کی تھی جس کا نام کیتھرائن تھا۔ باوجود اپنی انقلابی سوچ کے وہ گھریلو اصلاحات پر تیار نہ تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ عورت پر مرد کو فوقیت حاصل ہے اور مرد کو حق ہے کہ وہ اپنی عورت پر حکومت کرے۔ اس نے طلاق اور دوسری شادی کی بھی حمایت کی اور کہا کہ مرد کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی اولاد کے لیے کسی دوسری عورت سے شادی کر لے۔

اس نے پرانے چرچ کی مخالفت میں پچانوے مقالات لکھے اور وٹن برگ کے کاسل چرچ کے دروازے پر چسپاں کر دیے تھے۔ وہ تمام عمر مختلف عوارض کا شکار رہا۔ اسے عادت تھی کہ وہ اپنے بستر کی چادر اس وقت تک نہیں بدلتا تھا جب تک کہ اس میں اس کے پسینے کی بو رچ بس نہ جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ شیطان سے اس کی لڑائی مسلسل جاری ہے اور کئی بار وہ شیطانی ترغیبات کا شکار ہوا ہے۔

اس کے والدین بہت سخت قسم کے مذہبی لوگ تھے۔ اس کا باپ ایک کان میں کام کرتا تھا اور وہ اس کے ساتھ بہت سخت رویہ رکھتا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کا بچپن خاصا افسردہ گزرا۔ وہ لوگ غربت زدہ تھے اور سب ایک ہی کمرے میں راتیں گزارتے تھے۔ اسے

پڑھائی سے دلچسپی نہ تھی پہلے اسے قانون پڑھانے کی کوشش کی گئی پھر اسے سینٹ آگسٹین کے گرجا گھر میں داخل کرا دیا گیا۔ 1507ء میں وہ یہاں پادری بنا دیا گیا۔

1512ء میں اس نے مذہبی علوم میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔

1517ء کے بعد اس نے چرچ کی مخالفت شروع کی اور اس کے سارے ڈھانچے کو چیلنج کر کے ایک نئے فرقے کی بنیاد رکھ دی۔ یہ 63 سال زندہ رہا۔ اس کا انتقال 1546ء میں ہوا۔

وہ نسلاً "جرمن تھا اور پاپ لیو دہم نے جرمن شرابی کا نام دیا تھا آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ یہ ذکر کس شخصیت کا ہے۔ جی ہاں! یہ مسیحیت میں "کیتھولک" فرقے کے متوازی چلتے ہوئے پروٹسٹنٹ فرقے کا بانی "مارٹن لوتھر" تھا۔

☆ ☆ ☆

اسّی مسلمانوں کی جانیں بچانے کے لیے

اہل اسلام شام میں فتح کرنے کے لیے مختلف مقاموں پر حملے کر رہے تھے اور شام کے حکمران عیسائی ہر محاذ پر ان کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ایک جنگ کے دوران حضرت عبداللہ بن خدانہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عیسائیوں نے گرفتار کر لیا۔ عیسائیوں نے ہر طرح کی کوشش کی کہ حضرت عبداللہ بن خدانہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ترکِ اسلام کے بعد عیسائیت اختیار کر لیں۔ لیکن آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان پر سختی سے واضح کر دیا کہ وہ اپنی جان تو دے سکتے ہیں لیکن عیسائی مذہب اختیار نہیں کر سکتے۔

ظالم عیسائیوں نے جب یہ دیکھا کہ آپ مسلسل انکار کیے جا رہے ہیں اور کسی طرح عیسائیت قبول کرنے پر رضامند نہیں ہو رہے تو انہوں نے ایک تجویز کے تحت ایک صحابی رضی اللہ کو جیل خانے سے باہر نکالا۔ عیسائیوں نے حضرت عبداللہ بن خدانہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے اس صحابی قیدی کو ایک کھولتے ہوئے زیتون کے تیل کے کڑھاؤ میں ڈال دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے صحابی قیدی شہید ہو گئے۔

حضرت عبداللہ بن خدانہ نے اس مظلوم صحابی کا یہ انجام دیکھا تو ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ عیسائیوں نے آپ کو روتے ہوئے دیکھا تو ہنستے ہوئے کہا۔

"بھئی، تم تو ایک ثابت قدم سچے مسلمان ہو۔ موت کو سامنے دیکھ کر کیوں رو رہے ہو؟" حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

"تم غلطی پر ہو۔ میں اپنی موت کے ڈر سے آنسو نہیں بہا رہا۔ میں تو اس لیے رو رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر آخر الزماں پر قربانی کرنے کے لیے میں صرف ایک جان کا مالک ہوں۔ کاش میں ہزار جانوں کا مالک ہوتا اور اپنی ساری جانیں اللہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر قربان کر دیتا۔"

عیسائیوں نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قوتِ ایمانی دیکھی تو سخت تعجب ہوئے اور پھر انہوں نے مختلف ہتھکنڈے آزما کر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ترکِ اسلام پر آمادہ کرنا چاہا ——— آپ کو [illegible] دولت کا لالچ دیا ——— حسین عورتیں پیش کیں ——— لیکن آپ ——— کسی لالچ میں نہ آئے اور عیسائیوں کو ناکامی ہوئی۔

پھر صورتِ حال کچھ اس طرح پیش آئی کہ حضرت عبداللہ بن خدانہ رضی اللہ نے اسّی مسلمان قیدیوں کو رہائی دلوانے کے لیے عیسائیوں کی یہ شرط منظور کر لی کہ وہ عیسائی حاکم کی پیشانی چوم لیں تو اسّی قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا۔ اگر وہ یہ شرط منظور نہ کریں گے تو اسّی مسلمان قیدیوں کی گردن مار دی جائے گی۔ بعد میں حضرت عبداللہ بن خدانہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے۔

"گو میں نے محض اسّی مسلمانوں کی جان بچانے کے لیے عیسائی حاکم کی پیشانی چومی تھی اور میرا یہ فعل بہ امرِ مجبوری تھا لیکن میں آج بھی کافر کی پیشانی چومنے پر دکھ محسوس کرتا ہوں۔"

(کنول شاہین، جلال پور جٹاں)

☆

ادارہ

منہ کی بدبو سے نجات ممکن ہے

منہ سے بدبودار مہک کیوں آتی ہے؟ اس کی وجوہات کے بارے میں یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا تاہم ایک بات طے ہے کہ اس کا سبب بعض ایسے بیکٹیریا بنتے ہیں، جو ہمارے منہ کے اندرونی حصے میں اپنا ڈیرا جما لیتے ہیں۔

اگر کسی شخص کے دانت اور مسوڑھے صاف ستھرے اور صحت مند ہیں تو ایسے میں یہ تعفن اس کی زبان کے پچھلے حصے کی جانب سے آتا ہے۔ بدبودار مہک اس وقت زیادہ پھیلنے لگتی ہے، جب اس مرض کا شکار فرد گفتگو کا آغاز کرتا ہے۔

اگر زبان کا پچھلا حصہ ناخوشگوار مہک کا سبب بن رہا ہے تو اس صورت میں ممکن ہے کہ دانتوں کا معالج آپ کو زبان کے اس حصے کی صفائی کا مشورہ دے۔ اس کے لیے عام سا سادہ ٹوتھ برش بھی استعمال ہو سکتا ہے۔

اگر کسی مریض کو ڈینٹسٹ نے زبان کی صفائی کرنے کا مشورہ دیا ہے تو اسے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ شروع شروع میں تو ایسا لگے گا کہ جیسے اس عمل کے دوران الٹی آ جائے گی۔ وہ اس دوران خود کو پریشان بھی پائے گا، لیکن آہستہ آہستہ عادت ہو جائے گی۔ زبان کی وہ سطح جسے ہم نہایت آسانی سے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر دیکھ سکتے ہیں اس کی صفائی مشکل کام نہیں، لیکن زبان کے پچھلے حصے کی صفائی کے دوران نہایت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس دوران یہ احتیاط کی جائے کہ صفائی کے دوران درد یا کوئی اور تکلیف محسوس نہ ہو۔

مسوڑھوں کی بیماریاں

بعض لوگوں کے منہ سے آنے والی ناخوشگوار مہک کا تعلق مسوڑھوں کی بیماریوں سے بھی ہوتا ہے۔ اس صورت حال کا خطرہ اس وقت زیادہ ہوتا ہے جب ان کی داڑھیں کھوکھلی ہوں اور ان میں کیڑے لگے ہوئے ہوں۔ اگر آپ کی متعفن سانسوں اور ناخوشگوار مہک کا سبب یہ ہے تو پھر آپ کے دانتوں کا معالج اس مسئلے کے خاتمے میں مدد کر سکتا ہے، لیکن یہ اس بات پر منحصر ہے کہ وہ آپ کے مرض کی کیفیت کے لحاظ سے کون سا طریقہ علاج اختیار کرتا ہے۔

دانتوں اور مسوڑھوں کو کسی اچھے ٹوتھ پیسٹ کی مدد سے روزانہ صاف کریں، رات کو سوتے وقت برش کریں اور خیال رہے کہ دانتوں کے خلا میں غذا کے کوئی اجزاء پھنسے نہ رہ جائیں، اس سے منہ سے آنے والی ناخوشگوار مہک کی شدت میں اضافہ ہو سکتا ہے بلکہ یہ دانتوں اور مسوڑھوں کے لیے بھی نقصان دہ ہوتا ہے۔

کیا آپ کے منہ سے ناخوشگوار مہک آتی ہے؟

یہ جاننے کا ایک آسان سا طریقہ ہے اور آپ اس حقیقت سے کسی اور کی مدد کے بغیر بھی واقف ہو سکتے

ہیں یا اپنی زبان چند مرتبہ اپنی کلائی پر پھیریں، تھوک کو 30 سیکنڈ کے لیے سوکھنے دیجیے اور پھر اسے سونگھیے۔ معالج کی رائے میں یہ کام روئی کے گولے سے بھی کیا جا سکتا ہے۔

تشخیص اور علاج

آپ اس مرض کے خاتمے کے لیے چیونگم، کسی قسم کے محلول کو پینے، ماؤتھ واش، چوسنے والی ٹکیوں یا ماؤتھ اسپرے از خود استعمال نہیں کریں، کیونکہ اس طرح بعض اوقات مسئلہ زیادہ پیچیدہ صورت اختیار کر جاتا ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ 85 سے 95 فیصد تک کے معاملات میں ناخوشگوار مہک منہ سے آتی ہے، تاہم بقایا حالتوں میں اس کا سبب ناک سے خارج ہونے والی سانسیں بھی ہوتی ہیں۔ اگر یہ مہک ناک سے سانسوں کے اخراج کے وقت محسوس ہو تو اس کا سبب ناک سے سانسوں کے اخراج کے راستے میں کوئی رکاوٹ بھی ہو سکتی ہے۔ آپ کا ڈینٹسٹ کوئی اچھی سی Dental Cream یا کوئی دوسری ٹریٹمنٹ تجویز کر سکتا ہے، جس سے کہ دانتوں اور مسوڑھوں کے اندر خلا یا سوراخوں کو بند یا ان کی صفائی کی جا سکے، جہاں پر خوراک کے ذرے پھنسے رہ جاتے ہیں اور بیکٹیریا ان میں پروان چڑھتے ہیں۔

خوشگوار سانسوں کے لیے ضروری احتیاطیں

چند باتوں پر عمل کر کے آپ خود ناخوشگوار مہک کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔

☆ وقتاً فوقتاً کسی ماہر ڈینٹسٹ سے اپنے دانتوں اور مسوڑھوں کی صفائی کرواتے رہیں۔ اگر آپ دانتوں و مسوڑھوں کی صفائی کا کام خود گھر پر انجام دے رہے ہیں تو صفائی کے دوران دانتوں اور مسوڑھوں میں پھنسے رہ جانے والے غذائی اجزاء کو خوب اچھی طرح مناسب انداز میں سے صاف کریں۔

☆ زبان کی صفائی کے لیے Scraper (آلے) کے استعمال کے لیے ڈینٹسٹ سے مشورہ طلب کریں۔ زبان کی بالائی سطح اور اس کے پچھلے حصے کی صفائی احتیاط اور آرام سے کریں۔

زبان کو برش کرنے سے اس کے اوپر کی تہ صاف ہو جاتی ہے جو دانتوں پر حملہ کرتی ہے۔ شروع میں اس کی صفائی کرنے سے تھوڑی سی تکلف اور ناگواری محسوس ہو گی، مگر پھر آپ اس کے عادی ہو جائیں گے۔

☆ اگر آپ کو اپنا منہ خشک محسوس ہوتا ہو تو شوگر فری چیونگم، ایک یا دو منٹ تک چبائیں۔ لونگ، الائچی بھی چبا سکتے ہیں۔ اس سے منہ کی خشکی اور ناخوشگوار مہک میں کمی آئے گی۔

☆ گوشت، مچھلی، دودھ اور دہی وغیرہ کھانے کے بعد مسوڑھوں اور دانتوں کو اچھی طرح صاف کر لیں۔

☆ تازہ سبزیاں کھائیں۔ گاجر وغیرہ کچی حالت میں چبا کر کھانا مفید ثابت ہوتا ہے۔

☆ پچھلی داڑھوں کی صفائی باقاعدگی سے کریں۔ مستند و معیاری طریقہ کار کے تحت تیار کیا ہوا ماؤتھ واش استعمال کریں۔ بہت چھوٹے بچوں کو ماؤتھ واش استعمال نہ کروائیں۔

☆ اپنی زبان کی صفائی آہستگی اور نرمی سے کریں۔ سختی اور تیزی سے ہاتھ چلانے کے باعث زبان پر سوزش بھی ہو سکتی ہے۔

☆ روزانہ استعمال میں آنے والے ٹوتھ پیسٹ کو زبان کی بالائی سطح کی صفائی کے لیے استعمال نہ کریں۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اپنے ٹوتھ برش کو ماؤتھ واش کے محلول میں ڈبو کر نکال لیں اور اس سے زبان صاف کریں۔

☆ پانی کا استعمال کثرت سے کریں، اس سے ناخوشگوار مہک کی شکایت میں کمی ہو گی، ماہرین کے نزدیک کافی کے استعمال سے گریز کرنا چاہیے، یہ بھی منہ کی بدبو بڑھانے میں معاون ہوتی ہے۔

☆